حضرت ابوبکر صدیقؓ
اور
حضرت فاروقِ اعظمؓ

مصنف: ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجم: شاہ حسن عطا
ایم۔ اے علیگ

نام کتاب : ـــــــــ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ
تالیف : ـــــــــ ڈاکٹر طہٰ حسین
ترجمہ : ـــــــــ شاہ حسن عطا ایم اے علیگ
ناشر : ـــــــــ نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی
طبع : ـــــــــ ۱۹۸۹ء
ایڈیشن : ـــــــــ آفسٹ
ضخامت : ـــــــــ ۲۵۶ صفحات
ٹیلیفون : ـــــــــ ۲۱۳۳۰۳

احمد بہادر زیبو نقوش - ناظم آباد - کراچی

فہرست
حضرت ابوبکر صدیقؓ
حصہ اوّل

فہرست

حضرت فاروق اعظمؓ

حصّہ دوم

الشیخان

چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری، موجودہ دور میں عربی زبان کے مشہور ادیب، اور نامی انشاپرداز ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ عہد جدید کے ابوالعلاء المعری ہیں، وہی ادیبانہ انداز اور فلسفیانہ فکر و نظر، آنکھوں سے مجبور وہ بھی تھے، اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین بھی دیدۂ بینا سے بالکلیہ محروم، یہ مصری یونیورسٹی میں استاد ادب اور مصری حکومت میں وزیر تعلیم رہنے کے علاوہ بہت سی معرکۃ الآرا کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے تاریخ اسلام پر بھی متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں، وہ تاریخ کو بھی اپنی انشا پردازی اور ادیبانہ نگارش سے افسانہ اور باغ و بہار بنا دیتے ہیں۔ اس طرح کہ تاریخ پڑھتے ہوئے آدمی کو ادب لطیف کا لطف آتا ہے، اسی طرح کی کتابیں علی و بنوہ اور مقتل عثمان بھی ہیں۔ یہ کتابیں تاریخی روایات اور امور خانہ ژرف نگاہی کا شاہکار اور مورخانہ انشاپردازی کا بے مثال نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے سیرۃ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ پر کتابیں لکھنے کے بعد خود یہ محسوس کیا یا شاید دوستوں نے توجہ دلائی کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر بھی انہیں کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیے، اس لئے انہوں نے الشیخان کے نام سے یہ کتاب لکھی جس کا اردو ترجمہ اس وقت پیش خدمت ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے خود اس کتاب کے حرف آغاز میں تالیف کی یہی وجہ لکھی ہے، اور حقیقتہً یہی وجہ معلوم بھی ہوتی ہے۔

بہرحال کتاب ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے لکھی ہے، اور اسی ادب عالیہ کے انداز میں لکھی ہے جو ان پر طاری ہے خوب لکھی ہے اور بہت ہی دل آویز انداز نگارش اختیار کیا ہے۔ اگر نفیس اکاڈمی کی طرف سے علی و بنوہ کا ترجمہ پیش کرنے کے بعد الشیخان کا ترجمہ نہ پیش کیا جاتا تو حقیقتہً وہی کمی رہ جاتی جس کے احساس نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو یہ کتاب لکھنے پر مجبور کیا ہے۔

ترجمہ شاہ حسن عطا صاحب نے کیا ہے۔ سلیس و فصیح اردو میں یہ ترجمہ امید ہے ناظرین کو پسند آئے گا۔

حرفِ اوّلین

یہ کتاب کیا ہے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں ایک مختصر سی مجمل سی تقریر ہے اور مَیں نہیں سمجھتا کہ اس کتاب میں کوئی بالکل نئی بات بیان ہوئی ہے، سلف صالحین اور محدثین نے ان دونوں حضرات پر تسلسل اور فراوانی سے لکھا ہے، اسی طرح یورپین علماٴ نے بھی اس موضوع پر بکثرت تصانیف پیش کی ہیں۔ اور ان سب نے، یعنی قدما اور متاخرین محدثین اور مستشرقین نے بحث وتحیص کے تمام ممکن وسائل کو کام میں لاتے ہوئے شیخینؓ پر اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ اس کے آگے شاید ممکن بھی نہیں!

اگر مجھ پر یہی خیال مسلط رہتا تو شاید میں اس تقریر کے املاؔ سے باز رہتا اور تکرارِ مضامین کے الزام سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتا جس کا خطرہ بہرصورت موجود ہے۔ لیکن اس املا کا اصل محرک شیخینؓ سے میرا قلبی تعلق ہے اور مَیں اس قلبی تعلق کے باوجود اس تذکرہ میں راست گفتاری سے کام لوں گا۔ یہ عین تقاضائے انصاف بھی ہے اور بحث ابوبکرؓ و عمرؓ میں میری شرکت کا سبب بھی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات عثمانؓ و علیؓ پر تو لکھ ہی چکا تھا البتہ خاص شیخینؓ پر مَیں نے بطور علیحدہ اب تک کوئی تقریر املا نہ کی تھی۔

اور یہ حقیقت ہے کہ میں اس سلسلہ میں اپنے کو شیخینؓ کی بارگاہ میں قصوروار اور مجرم گردانتا رہا ہوں اور جیسے میرا ضمیر ان کے حق میں میرے اس تغافل پر مجھے اب تک ملامت کرتا

---

[1] باکمال مصنف نابینا ہونے کے سبب اپنی کتابیں املا کرا دیتے ہیں۔

رہا ہو! یہ سب کچھ درست، تاہم میرا مدعا محض شیخین ؓ کی مداحی بھی نہیں، اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ان بلند رتبہ شخصیتوں کو لائق مدح سرائی نہیں سمجھتا۔ واقعہ یہ ہے کہ بے شمار نسلوں نے ان برگزیدہ اور عظیم مردان حق پرست کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ بلکہ میں تو انہیں ماورائے سمجھتا ہوں۔ یوں بھی یہ مدلل مداحی اور محض کتاب المناقب" قسم کی چیز قاری کے لئے بے سود ہو گی ایک اور بات بھی میرے پیش نظر ہے وہ یہ کہ شیخین خود بھی اس قسم کی مدح وثنا کو کس قدر اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے، شاید وہ اس سے یک گونہ گھٹن محسوس کرتے تھے۔

بہر صورت اس جائزہ کا مقصد شیخین کے دور کے واقعات کی تفصیل بیان کرنا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمام تفصیلات قدماء اور محدثین کی کتابوں میں پہلے ہی سے بکھری ہوئی ہیں۔ اور میں طول کلام سے احتراز لازم سمجھتا ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ شیخین ؓ کے دور کے یہ واقعات جس ڈھنگ سے بیان ہوئے اس نے انہیں میری نگاہوں میں یکسر مشکوک اور مشتبہ کر دیا ہے اور میں تو اس بات کا قائل ہو چکا ہوں کہ شیخین کے مختصر دور کے واقعات کا عام طرز بیان بجائے اس کے انہیں عہد آفریں بنا کے پیش کرے، اپنے اندر افسانویت کا رنگ لئے ہوتا ہے قدماء اور محدثین کے سارے کے سارے دفاتر کھنگال ڈالئے اور دیکھئے کہ واقعات کی اس کھتونی میں کہانی کا عنصر کتنا ہے اور مورخانہ ژرف نگہی سے کس حد تک کام لیا گیا ہے۔ کیا اس مختصر عہد کی باتوں سے کم از کم جس انداز میں وہ بیان ہوئی ہیں بوئے فسانہ طرازی نہیں آتی؟

دراصل قدماء نے شیخین ؓ کی مدح میں اس درجہ غلو سے کام لیا ہے کہ ان کی اس مدح میں کہیں کہیں تقدیس اور تنزیہہ کے حدود شروع ہو گئے ہیں۔ شاید قدماء یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ انسانی نفس کے کچھ مخصوص تقاضے بھی ہوتے ہیں اور ان پر غلبہ ایک حد تک ہی ممکن ہوتا ہے۔ ہمارے لئے شیخین ؓ کی اس تجلیل کا راز اس وقت حل ہو جاتا جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ لوگوں نے بعض اوقات آنحضرت ؐ سے بھی غلط باتیں منسوب کرنے سے گریز نہیں کیا پھر جب آنحضرت ؐ کے باب میں لوگوں کا یہ طرز عمل اور طرز فکر ہو سکتا تھا تو آپ کے جلیل القدر رفقائ کے باب میں بھی اس طرز فکر کا قائم ہونا قطعاً منطقی تھا۔ ان بزرگوں کی تقدیس اور عظمت اور

جلالت کے ضمن میں ان کی شخصیتیں افتراء اور دروغ بیانی کا ہدف نہیں۔ دوسری جانب شیخین سے متعلق قدماء کا انداز بیان اور لہجہ کچھ ایسا متیقن سا نظر آتا ہے گویا وہ اس دور کے واقعات کے عینی شاہدوں میں شامل تھے ظاہر ہے کہ ان تاریخ نویسوں اور داستان سراؤں میں سے کسی کو بھی یہ موقع میسر نہیں آیا تھا۔
آگے چل کر میں ان واقعات کی تنقیح کروں گا، لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ معرکہ ہائے جنگ کی تفصیلات کے بارے میں خواہ کتنی ہی چھان پھٹک کی جائے ضمن بیان میں حقائق ضرور مسخ ہوتے ہیں اور واقعات کے افق پر عدم احتیاط کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ خود وہ لوگ جو معرکوں میں اصالتاً شریک ہوتے ہیں اس طرح کی جزئیات کے بیان پر قدرت نہیں پا سکتے اور خود ان لوگوں کے لئے بھی ممکن نہیں ہو پاتا کہ وہ واقعات کو اس طرح وضاحت کے ساتھ بیان کر دیں: معرکہ جنگ میں شریک ہونے والے تو زیادہ سے زیادہ صرف اتنا ہی دیکھ سکتے ہیں جتنا ان کے محاذ پر واقع ہوتا ہے اور پھر ان کے میدان کارزار کے اپنے مسائل اور مشکلات انہیں اتنی فرصت ہی کہاں دیتے ہیں کہ وہ ایک جمع الحواس ناظر کی حیثیت سے واقعات کا جائزہ لے سکیں۔ ایک سپاہی کا تصور کیجیے جو میدان جنگ میں اپنی جان کی حفاظت اور اپنے دفاع کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے اور اسے ہر آن دشمن کی نئی چالوں اور گھاتوں کا دھڑکا لگا ہوتا ہے، اب کیا یہ سپاہی واقعی اس قابل ہوتا ہے کہ لڑتا بھی جائے اور نہایت اطمینان سے گردوپیش کا مورخانہ اور ناقدانہ جائزہ بھی لیتا جائے اور یہ بھی دیکھتا جائے کہ جہاں وہ محو کارزار ہے وہاں سے دور، بہت دور، حملہ کی نوعیت، دفاع کی شکل اور پیش قدمی کی صورت کیا ہے؟
سوال یہ ہے کہ جب ایک سپاہی میدانِ جنگ میں موجود ہوتے ہوئے بھی یہ سب کچھ دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے تو پھر ہمارے یہ دیدہ ور مورخ کیوں کر جنگوں کے نتائج اور عواقب دونوں متعلقہ تفصیلات اور خساروں کی نوعیت وغیرہ کے متعلق صراحت کے ساتھ لکھ مارتے ہیں
کہنا یہ ہے کہ اگر کوئی ہزیمت خوردہ لشکر عالم فراز میں کسی دریا یا نہر کو عبور کر رہا ہو اور اس صورت میں اس کے افراد تلف ہو جائیں یا زخمی ہوں یا مثلاً ڈوب کر مر جائیں تو مرنے والوں، زخمی ہونے والوں اور ڈوب جانے والوں کی علیحدہ علیحدہ فہرست کا مرتب کرنا یا نبرد آزما ہونے سے پہلے اور بعد، دو لشکروں کی تعداد کی صحیح میزان وہی تقریباً امر محال ہے۔ ظاہر ہے

ایسے مواقع پر قیاس کو کام میں لانا ہی پڑتا ہے اور یقیناً قدیم عہد میں بھی یہ ساری تفصیلات قیاس کے بل بوتے پر مرتب ہوئی ہوں گی۔ یوں بھی اس دور میں اعداد و شمار کا کوئی علمی تصور نہ تھا اور عام لوگوں میں بھی واقعات کی چھان بین علمی انداز میں کرنے کا شعور نہیں پنپ سکا تھا۔ اس کے علاوہ بیشتر عرب مؤرخوں کو واقعات کا علم عرب راویانِ اخبار کے ذریعہ ہُوا اور ان کی تاریخ نویسی کی بنیاد فاتحوں کے یکطرفہ بیانات پر قائم کی گئی اور یہ فاتح وہ تھے جو فتح و نصرت کے وقت میدانِ جنگ میں موجود تک نہ تھے۔ اب ان واقعات کے بارے میں، جیسا کہ یہ تاریخ کی کتابوں میں نقل ہوئے ہیں، یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ ازروئے روایت یہ مشتبہ اور غیر مستند ہیں۔ دراصل ایک اور فروگذاشت یہ ہوئی کہ ہمارے مورخین نے تصویر کا محض ایک ہی رُخ دیکھا۔ ان بزرگوں کو چاہیئے تھا کہ یہ اس دور میں اسلام کے مقابلہ میں شکست یافتہ قوموں، یعنی رومیوں اور ایرانیوں وغیرہ کے افراد کے بیانات بھی لیتے لیکن انھوں نے صرف ایک ہی آواز سُنی۔ وہ تھی عرب آواز! بے لاگ تحقیق اور تاریخ سرائی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے دونوں فریقوں کی، فاتح اور مفتوح دونوں کی بات سنی جائے۔

شیخینؓ کے دور کے واقعات اپنی جگہ پر خود ہی حیرت انگیز اور کرشمہ ریز تھے اور ان واقعات کو پڑھنے والا یقینی طور پر ان سے مرعوب ہوتا ہے۔ اور اس پر استعجاب کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر راویانِ اخبار کے لئے کہاں ضروری رہ جاتا ہے کہ ان واقعات پر مزید حاشیہ آرائی سے اپنے جی کی بھڑاس نکالیں اور ان کے گرد مبالغہ آرائی اور غلو کا ایک ہالہ قائم کر کے اپنے کو تسکین دیں۔ عربوں کا اسلام سے پھر کر اس کی جانب رجوع کرنا۔ شام اور جزیرہ وغیرہ کی فتح اور ان ملکوں سے رومیوں کا اخراج، عراق سے ایرانیوں کا نکل جانا، ایران کے علاقہ پر مسلمانوں کا تسلط اور غلبہ یہ اور اس نوع کے واقعات بذاتِ خود محیر العقول اور زبردست واقعات ہیں جو ایک قلیل سی مدت میں پیش آگئے۔ یہ عظیم واقعات آپ اپنی توصیف اور اپنے اہتمام بالشان اور حیرت افزا ہونے پر آپ اپنی دلیل ہیں۔ اور بظاہر مزید مبالغہ آرائی کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ ان حادثاتِ روزگار کے اس دورِ باکرامت میں واقع ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن ان کے حسن و جلال پر تکلف کا غازہ بالکل زیب نہیں دیتا۔ میرا خیال ہے جس وقت مورخ اس دور کے بارے میں اتنا
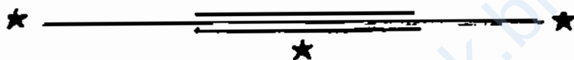
ہی لکھ دیتا ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کو رومیوں پر فتح حاصل ہوئی اور ایران پر تسلط اور غلبہ ملا تو وہ در اصل سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ بلکہ یہ کہہ کر شاید غیر شعوری طور پر وہ ایک ایسے معجزانہ کارنامے کا ذکر کر دیتا ہے جس کی مثال محررہ تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے!

اس وقت میں اس عبارت کا جو املا لکھوا رہا ہوں تو میرے پیش نظر محض شیخین کی مدح سرائی ہی کی مہم نہیں ہے۔ اور نہ ان کے مبارک اور تابناک عہد کی فتوحات کے بارے میں جزئیات نگاری میرا مقصد ہے۔ میرا مدعا اس سے یکسر مختلف ہے۔ میں در اصل اپنے قاری سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی (دولہ انگیز اور بے مثال اور باکمال) شخصیتوں کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ بدقسمتی سے ان شخصیتوں کے بارے میں ذہنوں میں غلط تصورات قائم ہو گئے ہیں اور ان تصورات کی ان حضرات کی سیرتوں سے بالکل تائید نہیں ہوتی۔ میرا اس کتاب کی تالیف سے مدعا یہ ہے کہ دورِ شیخین کے واقعات، اور بعد کی اسلامی زندگی پر ان کی مخصوص چھاپ، اور امت عربی پر ان حوادث کی تعبیر سے خاص طرح کے اثرات اور ساتھ ہی ان میں سے بعض واقعات سے فتنوں کے سیلاب پھوٹنے کے مستقل امکانات کو ذہن میں رکھ کر میں ان شخصیتوں کے اصل خدوخال نمایاں کر دوں۔

راویوں نے حضرت عمرؓ کا یہ معنی آفریں قول نقل کیا ہے کہ انہیں حضرت ابوبکرؓ کے فوراً بعد (تاریخ کے منظر عام پر) آنے نے بہت تھکا سا دیا (یعنی حضرت ابوبکرؓ کی جانشینی کے عظیم لوازم کو نبھانا خود ان کے لیے سعد درجہ صبر آزما عمل ثابت ہوا) حضرت ابوبکرؓ کی مسند پر بیٹھنا تو خیر مشکل اور کٹھن فعل تھا ہی حضرت عمرؓ کی خالی کی ہوئی جگہ کو پُر کرنا اور ان کے قائم کیے ہوئے سخت معیار پر پورا اترنا کچھ دشوار تر ہی ثابت ہوا۔ اور خلفاء مابعد اس آزمائش پر پورے اترنے میں ناکام ثابت ہوئے۔ شیخینؓ کی زندگیوں نے مسلمانوں کے لیے سیاست اور حکمت عملی کی ایک بالکل ہی نئی راہ کھول دی تھی اور عدل و انصاف، حریت و مساوات اور معاملات کی سربراہی اور تنظیم کا ایک نہایت درجہ عالی اور مشکل الحصول معیار قائم کر دیا تھا جس پر پورا اترنا سلاطین مابعد کے لیے سخت دشوار ثابت ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ اسی معیار پر پورا نہ اتر سکنے کی وجہ تھی کہ شیخین کے بعد ہی اُن عظیم فتنوں نے سر اٹھایا جن کے نتیجے کے طور پر پہلے

حضرت عثمانؓ کو اور ان کے بعد حضرت علیؓ کو شہادت کا جام نوش فرمانے پڑے۔ اور وہ خون بہا جو خونِ ناحق تھا اور جس کا بہنا اللہ کے نزدیک حد درجہ مکروہ اور مبغوض تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان فتنوں سے امت اسلامی آپس میں بٹ سی گئی اور ایسا بٹی کہ تقسیم اور تفرقہ بازی کی صورتیں آج تک قائم ہیں!

بہر حال میرا مقصود یہ نہیں کہ میں یہاں اس علمی بحث کی مشکلات بیان کروں اور اس باب میں اپنی جگر کاویوں پر تبصرہ کروں۔ مجھے اس بحث کا حق ادا کرنے میں کن زحمتوں کا سامنا ہو گا، کن دشوار راہوں سے گذرنا ہو گا اہل نظر خوب سمجھ سکتے ہیں۔ موضوع کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ ان آزمائشوں سے مفر ممکن نہیں۔



باب ۲

ارتداد کی فتنہ آرائی

سورۂ حجرات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "قَالَتِ الْاَعْرَابُ ..... غَفُوْرٌ الرَّحِیْمٌ"

(اُردو مفہوم)

" بادیہ نشین مدعی ہیں کہ وہ اپنے میں مردِ مومن کی صفات پیدا کر چکے ہیں ان سے فرما دیجئے ہنوز تم بادیہ نشین لوگ ذوق یقین سے محروم ہو اور تم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ تم اسلامی برادری میں داخل ہو چکے ہو۔ اور اگر تم لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام مانو گے تو ظاہری طور پر خسارہ میں رہنے کے باوجود تم دراصل خسارہ میں نہیں رہو گے اور تمہارے کاروبار میں کساد واقع نہ ہو گا۔ اللہ بخشنے والا اور عنایت فرما ہے "

تمام کے تمام واقعات اس امر پر استدلال کرتے ہیں کہ اگرچہ اہلِ عرب آنحضرتؐ کے وصال کے وقت تک دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے تاہم (مدینہ۔ مکہ اور طائف کے لوگوں کو مستثنیٰ کر کے ابھی تک ایمان اپنے اصل مفہوم میں ان کی طبیعتوں کا حصہ نہیں بن سکا تھا۔ ہُوا یہ تھا عام بادیہ نشین عربوں نے اسلام کے ظہور کی اپنے دماغوں میں یوں تعبیر کی تھی کہ گویا ایک نیا سلطان اور صاحب اقتدار سردار منظرِ عام پر آیا اور اس نے مدینہ، مکہ اور طائف کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا اور بس پھر اس نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ اس کے پیش کردہ نظام فکر کو قبول کر کے اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو مان کر لوگ اللہ کی یکتائی اور وحدانیت کی بھی شہادت دیں اور اسے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے پیغام کا حامل برحق جانیں ساتھ ہی یہ لوگ وہ واجبات ادا کریں جو اس سلطان کی جانب سے ان پر عائد ہوتے تھے عام بادیہ

نشینوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ بادشاہ ہر اس عرب کے خلاف صف آرا ہو جاتا ہے جو اس کے پیش کردہ ضابطۂ حیات کو قبول کرنے سے انکاری ہوتا ہے۔ پھر وہ اللہ کا یہ اعلان سنائے کہ

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا

(یعنی مومنو! مشرک تو پلید ہیں اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں) گویا مشرکوں اور مسجد حرام کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔ انھیں (ظاہر بینوں نے) یہ بھی دیکھا کہ اس نئے سردار میں قوت اور اقتدار کے باوصف بلا کی کشادگی قلب اور صفت بخشش و کرم بھی موجود تھی۔ یہ چیز انہیں مرعوب اور متاثر کرنے کے لئے بہت کافی تھی۔ شاید یہی اسباب تھے کہ یہ تمام کے تمام اہلِ عرب دفعتہً نظامِ جدید کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔ اضطراری طور پر نبی اعظم کچھ دن اور سایہ فگن رہے ہوتے تو شاید عام الناس کا یہ اقرار باللسان مبدل بہ ایمان حقیقی ہو جاتا اور وہ جو بجبر حالات اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے ان کے دل و جگر بھی تشنۂ فریاد آتے مگر اللہ کی مرضی کچھ اور تھی اور اس نے جلد ہی گویا اپنے سفیر کبیر کو واپس بلا لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگ نفسیاتی طور پر اس عظیم حادثہ کے لئے تیار نہ تھے۔ کیا پیغمبرؐ کو بھی عام لوگوں کی طرح موت آ سکتی ہے ؟ ذہنوں میں یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پھر اگر معاملہ کو عامی کی نظر سے دیکھا جائے ، تو ادھر تو یہ سخت خلاف توقع سانحہ ہوا ادھر زمام امور ہاتھ میں لینے کے لئے ایک ایسی شخصیت آگے بڑھی جو لوگوں کی جانی پہچانی شخصیت تھی۔ عام آدمی نے پھر سوچا ہوگا۔ جب صاحب وحی اور ایک ایسے زبردست انسان کو جس نے اپنے ہر مخالف کو شکست دی ، موت آ سکتی ہے تو اس غیر نبی کے لئے تو موت اور بھی یقینی ہوگی

یوں دل میں جو کچھ تھا ظاہر ہو گیا ، سارے خدشات اور سارے توہمات ، سب ہی جیسے پھوٹ پڑے اور اہلِ عرب نے جیسے اس بات پر تصدیق کی مہر سی لگا دی کہ ان کا اسلام نبوت کے جلال و اقتدار کے سبب تھا اور دل ان کے اب تک وہی رنگین بتان آذری ہیں کہ جو تھے! نتیجہ سامنے تھا۔ فتنۂ ارتداد اپنی تمام شعلہ سامانیوں کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور زکوٰۃ کے باب میں نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ مانعین زکوٰۃ کے وفود حضرت ابوبکرؓ سے آن کے صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ نماز تو ہم بے شک پڑھیں گے البتہ زکوٰۃ سے ہم معذور

ہیں! دراصل دولت اب لوگوں کے نزدیک دین سے زیادہ قیمتی شے ہو چکی تھی اور شاید لوگ اسے اپنے لئے کسرِ شان بھی سمجھنے لگے تھے کہ زکوٰۃ کا محصول وہ ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیں جس کے پاس ان ہی کی طرح نہ تو وحی آتی تھی اور نہ اخبار سماوی!

ایک دوسری صورت حال جو اسی دور میں پیش آئی تھی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ اہلِ عرب کے ایک گروہ نے تو اس بات کا بھی انتظار نہ کیا تھا کہ چراغ رسالت گل ہو لے اور ان بے صبروں نے اس سے پیشتر ہی کہ اُمت کا سرِ گرامی بزمِ جہاں کو چھوڑ جائے ارتداد کا اظہار کر دیا تھا۔ اور اصل سبب اس ارتداد کا یہ تھا کہ ان لوگوں کو زکوٰۃ کا دینا بہت ناگوار تھا۔ یہ لوگ وہ تھے جو دولت دنیا کو دین پر ترجیح دے رہے تھے۔ کچھ یہ بات بھی تھی کہ انھیں قریش میں نبوت کا ہونا فی نفسہٖ کھل رہا تھا۔ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ قریش میں (جو پہلے ہی سے ممتاز تھے) نبوت کے آجانے سے کیا کچھ اقتدار اور جلال و عظمت کے عناصر آ گئے تھے اور شاید مدعیان نبوت اور ان کے ہوا خواہوں نے سوچا۔ نبوت قریش ہی کا طرّہ امتیاز کیوں رہے اور انہیں میں نبوت کا لایا ہوا یہ اقتدار کیوں قائم رہے۔ خصوصاً جبکہ اس اقتدار میں ہمہ گیری اور جہاں گیری کی صلاحیت بھی تھی۔ چنانچہ یہ سلسلہ جلد ہی شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ربیعہ میں، خصوصیت کے ساتھ بنو حنیفہ میں یہ فتنہ اٹھا۔ اس کے بعد ہی مسیلمہ کذاب نے یمامہ میں اپنی نبوت کا اعلان کیا۔ یہ شخص نبی ہوتے ہی مقفیٰ اور مسجع عبارتیں، جو اس کے زعمِ باطل میں اسے وحی ہوتی تھیں، بکنے لگ گیا۔ مثال کے طور پر۔

لَنَا نِصْفُ الْاَرْضِ وَلِقُرَيْشٍ نِصْفُهَا، وَلٰكِنْ قُرَيْشًا قَوْمٌ يَظْلِمُوْنَ ”

یعنی زمین کے آدھے حصے سے ہمارا اور آدھے سے قریش کا تعلق ہے۔ مگر قریش ہیں کہ زیادتی پر تلے ہوئے ہیں!

ادھر یمن بھی جھوٹے نبیوں کا شکار ہوا اور وہاں الاسود العنسی نام کے ایک شخص نے اپنی نبوت کا اعلان کر دیا۔ اس پر بھی قافیہ پیمائی اور مسجع عبارتوں کا بھوت سوار رہا۔

نبی کریمؐ کے وصال سے پہلے ہی بنی اسد میں بھی یہ لعنت در آئی اور وہاں طلیحہ نامی شخص نے سخن گستری شروع کر دی اور اعلان یہ کیا کہ گویا۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں !

بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی ایک محترمہ بھی جن کا اسم گرامی سجاح تھا دعویٰ نبوت لے کے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس عورت کا تعلق دراصل بنی تمیم سے تھا لیکن بعد میں بنی ثعلب میں ان کے بس گئی تھی۔ اس کی قافیہ سنجی بھی رنگ لا کے رہی اور اس کی ذات سے بھی بے شمار لوگ گمراہ ہوئے پھر قحطانی بھلا کیوں خاموش بیٹھے رہتے۔ انھوں نے بھی آل عدنان پر اس بات پر رشک کرنا شروع کر دیا کہ نبوت ان میں ہی کیوں رہے اور دوسرے قبائل اس شرف سے کیوں محروم رہیں۔ چنانچہ الاسود العنسی نے ظہور کیا۔ ادھر ربیعہ کو مضر پر رشک آیا اور خود مضر کے اندر اسد و تمیم قریش سے جلنے لگے، انہوں نے سوچا۔ آل مضر میں قریش ہی کیوں اس صفت سے ممتاز ہوں چنانچہ بنی اسد میں طلیحہ اور بنی تمیم میں سجاح نبوت کے علم لے کے کھڑے ہو گئے۔

غرض ایسا نظر آرہا تھا کہ پوری دنیا اسلام سے منحرف ہو کے کفر کی جانب گامزن ہو جائے گی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ شعلہ جو بھڑکا تھا وہ پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔

اس فتنہ کی شعلہ سامانی اور ایک زبردست اکثریت کا اسلام سے انحراف اور انقطاع ایک زبردست آزمائش تھی جس میں حضرت ابوبکرؓ کو مبتلا ہونا پڑا۔ اسی طرح نبی کریمؐ کی وفات کے فوراً بعد مسلمان بھی اس آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ دنیا میں کوئی چیز انسانی شخصیت کو کسی عظیم آزمائش کے موقع پر اس کے عزم و ثبات کے اظہار سے زیادہ اجاگر کرنے والی نہیں ہوتی۔ بڑی شخصیت ظہور پذیر ہوتی ہی اس وقت ہے جب وہ مشکلات اور خطرات کو خاطر میں لائے بغیر ان سے ٹکر لیتی ہے۔

کارِ خلافت کے شروع ہی میں حضرت ابوبکرؓ کو جن مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑا ان میں محض مانعین زکوٰۃ اور مدعیان نبوت اور ان کے پیروؤں کی سرکوبی ہی نہیں شامل تھی ایک اور مسئلہ بھی درپیش تھا بے حد سنگین اور بے پناہ حد تک مشکل۔ وہ مسئلہ تھا شام کے نصرانیوں کے مقابلہ کے لئے عسکری تیاریوں کی تکمیل، اور ان کے تمام سیاسی ہتھکنڈوں کا مثبت اور دندان شکن جواب اور آئندہ فتنوں کے قطعی سدباب کے نقطہ نظر سے ان کی جمعیت کو منتشر کرنا۔

اس سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرہ نمائے عرب کے حدود پر خود بنفس نفیس

لشکر کشی فرمائی تھی اور موتہ اور تبوک کے غزوات کی اصل علت تھی ہی یہ کہ شام کے نصرانی جزیرہ نمائے عرب کے لئے مزید خطرہ نہ بننے پائیں۔ اسی مصلحت کے پیش نظر آنحضرتؐ نے محض موتہ اور تبوک ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنی وفات سے قبل ان نصرانیوں سے جو اب شام میں جمع ہو رہے تھے ٹکر لینے اور ان کی قوتوں کو پامال کرنے کے لئے ایک لشکر بھی تیار کرا لیا تھا۔ اس لشکر کی قیادت آنحضرتؐ نے نوعمر اسامہ بن زیدؓ کے سپرد فرمائی تھی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسامہ کے والد زیدؓ کو موتہ کے غزوہ میں شہید کر دیا گیا تھا اب چونکہ حضرت زیدؓ کو حدود شام کے عربوں نے شہید کیا تھا اس لئے ان کے بیٹے اسامہ بن زیدؓ میں قدرتی اور نفسیاتی طور پر زبردست جوش انتقام موجود تھا۔ یقیناً آنحضرتؐ کی ژرف نگہی نے آپ کے سامنے معاملہ کا یہ پہلو بے نقاب کر دیا تھا۔ اسی لئے آپ نے ایک ایسے لشکر کی رہنمائی اور فرمان دہی جس میں آپ کے چیدہ اصحاب منجملہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ تک شامل تھے، نوجوان اسامہؓ کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

آنحضرتؐ کی بیماری اس لشکر کی روانگی کی تاخیر کا سبب بنی اور جب آنحضرتؐ کو احساس ہو گیا کہ یہ بیماری موت کا پیش خیمہ ہے تو آپ نے وصیت فرمائی کہ جو لشکر اسامہ بن زیدؓ کی فرمان دہی میں جانے والا تھا وہ بدستور ان ہی کی رہنمائی اور امارت میں روانہ ہو۔

حضرت ابو بکرؓ نے خلافت کی زمام سنبھالتے ہی دیکھا کہ پوری دنیائے عرب از سر نو مبتلائے کفر و نفاق ہو چکی ہے اور آپ کے وہ ساتھی جن کے تدبیر اور سلیقہ پر آپ اعتماد کر سکتے تھے سب کے سب لشکر اسامہؓ میں بھرتی ہو چکے ہیں (اور اگر وہ مرکز سے اس نازک موقع پر چلے گئے تو آپ تن تنہا اور ان کی رفاقت و اعانت سے محروم رہ جائیں گے)۔

حضرت ابو بکرؓ نے دفعتہً اپنے کو آگ کے دریاؤں کے کنارے کھڑے پایا۔ یہ ایک ایسی آگ تھی جس سے تمام جزیرہ نمائے عرب شعلہ در ہو چکا تھا۔ اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو حضرت ابو بکرؓ اس لشکر کو باہر بھیجکر خود مسائل سے نبرد آزما ہوتے اور یا اس لشکر کی روانگی میں تاخیر برت کے پہلے داخلی فتنوں کی آگ کو بجھاتے اور بعد میں آنحضرتؐ کی وصیت پر عمل کرتے۔

سخت آزمائش کا مقام تھا۔ حضرت ابو بکرؓ زبردست اور سنگین بحران سے دوچار تھے۔ آئندہ ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ حضرت ابو بکرؓ اس آزمائش میں کس طرح پورے اترے اور مشکلات پر آپ نے کیسے قابو پایا۔

باب ۳

آفتابِ رسالت کا غروب
اور
ابوبکرؓ کی نئی آزمائش

لیکن خود اس آزمائش سے بھی پہلے حضرت ابوبکرؓ کو ایک اور سخت بحران کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور یہ اس وقت جب ابھی آپ نے معاملات کی باگ ڈور خود نہیں سنبھالی تھی ۔ یہ آزمائش رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی شکل میں سامنے آئی ۔ اس آزمائش کا ہدف کچھ حضرت ابوبکرؓ ہی کی ذات نہ تھی بلکہ ہو سکتا تھا کہ اس میں مبتلا ہو کے مسلمان اپنے دین ہی سے منحرف ہو جاتے۔ مسلمان اب تک یہ سوچتے تھے کہ آنحضرتؐ اس وقت تک ضرور اس دنیا میں تشریف فرما رہیں گے جب تک مندرجہ ذیل آیت کے مطابق جس کا متن ہے ۔

(هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ) یعنی اللہ تعالیٰ ہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ یہ دین تمام دوسرے ادیان پر غالب آ جائے خواہ یہ غلبۂ حق مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار اور تلخ معلوم ہو۔

یہی مسلمان سورہ براءۃ میں پڑھتے ہیں ۔

(هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا) یعنی اللہ تعالیٰ ہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کا لایا ہوا دین تمام دوسرے ادیان پر غالب آ جائے اور اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کی نگہداشت کرتے رہنا ہی سب

سے اہم امر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم نے جہاں تک کہ جزیرہ نمائے عرب کا تعلق تھا بے شک دینِ حق (اسلام) کو تمام دوسرے مروجہ ادیان و مذاہب پر غالب کر دیا تھا لیکن اسے ابھی دُنیا کے بقیہ حصے میں دوسرے دینوں پر غلبہ پانا باقی تھا۔ پھر یمن نے الاسود العنسی کے ساتھ ہو کر اور بنو حنیفہ نے خود آنحضرتؐ کی زندگی میں مسیلمہ کے ساتھ ہو کر اسلام سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ تو پھر (اس دور کے عام مسلمانوں کے نظریہ کے مطابق) نہ تو آنحضرتؐ کے وسیلہ سے عرب ہی میں اللہ کا دین تمام دوسرے دینوں پر غالب آیا تھا اور نہ دوسرے ممالک میں! اور اس کام کے پایہ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی آنحضرتؐ دنیا سے جدائی اور اللہ کا جوار اختیار فرماتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بات کچھ زیادہ اچنبھے کی نہیں معلوم ہوتی کہ خود بعض نہایت درجہ سچے مومنوں کو آنحضرتؐ کی موت کے بارے میں شک پیدا ہو جائے۔ آخر حضرت عمرؓ نے شک کا اظہار کیا تھا۔ اسی طرح ان امور کو ذہن میں رکھنے کے بعد یہ بات بھی آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے کہ ان لوگوں نے جو گویا محض زبان سے عبودیت کے مدعی تھے کیوں کفر اور انکار کی راہ اختیار کر لی تھی جیسا کہ مانعین زکوٰۃ نے کیا تھا اور کیوں اہل مدینہ کے حالات انتہائی پریشان کن ہو گئے تھے؟

اب اگر اس بات کو ذہن میں رکھ لیا جائے کہ حضرت ابو بکرؓ آنحضرتؐ کے لئے محبوب ترین شخصیت تھے اور اسی طرح حضرت ابو بکرؓ بھی بہ جان و دل فدائے پیغمبر تھے۔ تو شاید اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اس آزمائش کا اثر صدیقِ اکبرؓ کے دل پر کیا کچھ پڑا تھا۔ لیکن آپ جانتے ہیں ابو بکرؓ اس آگ میں بے خطر کود پڑے اور ذرا ہچکچائے بغیر اس آزمائش سے گذر گئے۔ یہ بھی آپ لوگوں کے علم میں ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے سچے اور نیک نفس مومنوں کو کیسے تسکین دی اور انہیں سخت ذہنی بحران سے کیسے نکال لیا۔ تاریخ کا یہ بڑا ہی خوبصورت اور دل انگیز منظر ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے محض ذیل کے قرآنی کلمات ادا کر کے ایک پوری قوم سے شک اور تذبذب اور ہراس و یاس کو یکسر ختم کر دیا۔

(وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ، اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا وَسَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ) (آل عمران)

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنیادی اور اساسی طور پر اللہ کے ایک رسول ہیں اور آپ سے پہلے بھی آپ ہی کے مقدس مشن پر رسول آچکے ہیں۔ اب اگر آپ کو سانحہ مرگ پیش آگیا ہے یا آپ قتل ہو چکے ہیں تو کیا یہ مناسب ہوگا) کہ تم لوگ دفعتہ بدل جاؤ اور پیٹھ دکھانے لگ جاؤ۔ تم پر یہ واضح ہو جانا چاہیئے کہ منہ موڑ کر اور پشت دکھا کر تم خدا کا کچھ بھی تو نہ بگاڑ سکو گے۔ عنقریب اللہ شکر گذاروں کو صلہ دے گا۔

(اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ)(الزمر۔ یعنی۔ آپ کو (مراد نبی اکرمؐ) اور ان لوگوں کو سب کو مرنا پڑے گا۔)

اس عظیم حادثہ کے وقت حضرت ابوبکرؓ نے نہ تو گریہ زاری جائز سمجھی اور نہ نبی کریمؐ کی موت کے واقع ہونے میں آپ نے کسی قسم کے شک کا اظہار کیا۔ اس کے برخلاف اس مرد گرامی نے مومنین صادق کو اللہ کا یہ قول یاد دلا کے کہ نبی اعظمؐ کو بھی موت سے مفر نہ ہوگا انہیں شک اور گریہ زاری کی منزل پائین سے باہر نکالا اور ان میں جرأت اور حقائق کو قبول کرنے کی قوت پیدا کر دی۔

اب دیکھنا یہ ہے، اور اس کے جانے بغیر چارہ بھی نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے اس عزم و ثبات اور صبر و استقامت اور مشکلات پر آخر کار قابو پانے کی صلاحیت کا اصل سرچشمہ اور منبع کیا تھا؟

باب ۴

صدیقِ اکبرؓ کی شخصیت

اس تمام ثبات اور عزم کا سرچشمہ حضرت ابوبکرؓ کی وہی عظیم صفت تھی جو آپ کے لقب یعنی صدیق (انتہائی راست باز اور امین اور وہ جس کے قول اور عمل میں کامل انطباق اور ہم آہنگی پائی جائے) میں مضمر ہے۔ دراصل حضرت ابوبکرؓ محض ایک قریشی بھی تھے۔ یوں کہ آپ کا تعلق قبیلہ قبیلہ قریش سے تھا اور دوسرے درجہ میں آپ ایک عرب بھی تھے۔ اس کے بعد آپ کی حیثیت ایک انسان کی بھی تھی، ایک عام قریش کی طرح آپ کو بھی بعض باتوں سے خوشی حاصل ہوتی تھی، بعض سے دکھ۔ وہ چیزیں آپ کو بھی متاثر کرتی تھیں جن سے عرب متاثر ہوتے تھے۔ پھر ایک عام انسان کی مانند آپ کے یہاں بھی رنج و راحت، لذت و الم، توانائی اور کمزوری اور خوشی و غم کے مواقع آتے رہتے تھے۔ ان سب چیزوں سے قطع نظر حضرت ابوبکرؓ ایک اور صفت کے لئے بھی مشہور تھے وہ صفت تھی طبیعت کی نرمی اور گداز اور دوسروں کو مبتلائے رنج دیکھ کے بیتاب اور متاثر ہو جانے کی صفت۔

پھر سوال اٹھتا ہے حضرت ابوبکرؓ جیسے نرم خو اور رقیق القلب انسان کے لئے آخر یہ کیسے ممکن ہو سکا کہ آپ ان عظیم اور دشوار مشکلات پر جو آپ کو پیش آئیں بلا تکلف قابو حاصل کر لے گئے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ وہی ابوبکرؓ ہیں جن کے بارے میں ان کی بیٹی حضرت عائشہؓ نے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ اگر مرض الموت میں آنحضرت نے اپنے بجائے ان سے امامت کے فرائض انجام دینے کے لئے کہا تو بہت ممکن ہے شدت تاثر سے آپ کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکے اور لوگ یہ تک نہ سن سکیں کہ کب آپ نے اللہ اکبر کہا اور

سمع اللہ لمن حمدہ کہا! حضرت عائشہؓ نے تو بلکہ آنحضرتؐ سے صاف صاف عرض کیا تھا کہ رسول اللہ! اگر آپ نے ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تو ممکن ہے شدت الم سے ان کی آواز ہی گلوگیر ہو جائے اور مقتدی ان کی آواز تک نہ سن سکیں۔ ایک اور سوال اٹھتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نبی کریمؐ کی نگاہوں میں اس درجہ محترم اور محبوب کیسے بن گئے، اور آپ کو آنحضرتؐ کا وہ تقرب کیوں کر حاصل ہو گیا جو کسی دوسرے کو نصیب نہ ہو سکا۔ آنحضرتؐ خود اس بات کا بار بار اعلان فرما چکے تھے حضرت عمرو بن العاصؓ نے جب رسالتمآبؐ سے ایک بار یہ سوال کیا تھا کہ آپ کی نگاہوں میں سب سے زیادہ محبوب شخصیت کس کی ہے۔ تو اس وقت آپؐ کا جواب تھا "ابوبکرؓ" ہمیں راویوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایک دن آنحضرتؐ نے منبر نبوی پر خطاب فرماتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کا بھی ضمنی تذکرہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ:۔

اگر میرے لئے یہ ممکن ہوتا کہ میں اس امت میں کسی شخص کو اپنا خلیل بنا سکتا یعنی اسے میں وہ محبت دے سکتا جو محبت کی سب سے آخری منزل ہے (اور جسے صرف باری تعالےٰ کے لئے مخصوص کیا جا سکتا ہے، تو میں یقیناً اس کے لئے ابوبکرؓ کا انتخاب کرتا۔ تاہم جب تک ہم دونوں (مراد رسالتمآب اور حضرت ابوبکرؓ) اس دنیا میں ہیں، ہماری برادری اور رفاقت جاری رہے گی۔ آنحضرتؐ جب تک مکہ میں تشریف فرما رہے حضرت ابوبکرؓ کے گھر صبح و شام تشریف لے جاتے رہے اور پھر مکہ سے مدینہ جاتے وقت یعنی ہجرت کی انتہائی نازک اور کٹھن گھڑی میں آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ ہی کو ہمسفری کا عظیم شرف بخشا۔ اسی طرح آنحضرتؐ اپنے تمام معاملات میں (مشورہ کے لئے) حضرت ابوبکرؓ ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ ان سب باتوں کا وہی ایک جواب ہے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یعنی یہ کہ حضرت ابوبکرؓ میں صدیقی صفات موجود تھے۔ مردوں میں آپ سب سے پہلے شخص ہیں جسے اسلام کی دعوت پر لبیک کہنے کا لافانی اور زندہ جاوید شرف حاصل ہوا۔ اور پھر آپ کا یہ اسلام اپنے کامل ترین معنیٰ میں بے ریا، پاک اور صاف بھی تھا اور اس اسلام کا مزاج عمیق ترین صدق دلی اور اخلاص کوشی اور صداقت باطنی سے بنا تھا۔ آپ کا ذوقِ یقین پختہ ترین ذوق یقین تھا، ہر شائبہ شک و ریب سے پاک، آنحضرتؐ کی ہر بات آپ کے لئے ابدی صداقتوں کی حامل تھی آپ نے ہر موقع پر آنحضرتؐ کے لئے ایثار نفس کیا۔

دین و دانش کی ہر آزمائش میں آپ پورے اترے حسن اور نشاط کے ساتھ، اور بڑی بڑی نفسیاتی اور سیاسی آزمائشوں سے امت کو نکالا اور اس کی فکری اور عملی قیادت کی۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس دن آنحضرت ؐ نے اس امر کا اعلان کیا کہ رات میں آپ کو مسجد حرام (کعبہ) سے مسجد الاقصیٰ تک لیجایا گیا تو ایک طرف اہلِ قریش نے آپ کی بات کو سچ جاننے سے انکار کر دیا اور دوسری طرف خود مسلمان بھی مذبذب سے ہو رہے تھے کہ اس اعلان کو سچائی پر محمول کریں یا نہ کریں۔ مگر اس موقع پر ایک شخص ایسا بھی موجود تھا جس نے اس خبر کو بغیر کسی تردد، تذبذب اور لیت و لعل کے قبول کر لیا تھا۔ یہ عظیم المرتبت شخص ابوبکر رض تھا۔

اسی صورت سے حدیث کے معتبر راویوں نے ہم کو یہ بھی بتایا کہ حضرت ابوبکر رض ہی تنہا وہ شخص تھے جنہوں نے آنحضرت ؐ کے بظاہر اہلِ مکہ سے وہ رعایت بخش صلح کرنے پر جو صلح حدیبیہ کے نام سے موسوم ہے، اطمینان کا اظہار کیا تھا اور جس وقت کہ تمام لوگ اس صلح کی شرائط سے مضطرب اور بدحواس تھے، بلکہ یک گونہ خفگی کا شکار ہو گئے تھے، ایک آپ کی ذات تھی جس نے اسے رضایت بخش اور قابلِ قبول پایا تھا۔ حد تک تو یہ ہے کہ حضرت عمر رض جیسے جلیل القدر صحابی کو جو آنحضرت ؐ سے اس درجہ قریب تھے اور جنہیں آنحضرت ؐ اوروں پر ترجیح دیتے تھے، اس صلح سے سخت تکدر محسوس کیا تھا۔ حضرت عمر رض نے اس موقع پر آنحضرت ؐ سے سوال کیا تھا کہ جب مسلمان حق پر ہیں اور مشرکین مکہ حق پر نہیں ہیں تو پھر دین کے معاملہ میں اس مراعات بخشی کے اظہار کی کیا ضرورت پیش آئی۔ اور مسلمانوں نے اپنے ظالم حریفوں سے اپنے مفاد کو پس پشت ڈالتے ہوئے صلح کرنا کیوں مناسب سمجھا؟ آنحضرت ؐ نے حضرت عمر رض کے اس استفسار پر جو دراصل عام مسلمانوں کے جذبات کا ترجمان تھا فرمایا تھا، قدرے ناراضگی کے ساتھ، کہ آپ میں عبودیت کی صفت ہے اور آپ کا اور اللہ کا رشتہ عبد اور معبود یعنی پرستار اور آقا کا ہے اور اللہ کبھی بھی اس امر کی اجازت نہ دے گا کہ اس کا پرستارِ اعظم اس کی راہ میں ضائع اور برباد ہو جائے۔

اس گفتگو کے بعد حضرت عمر رض نے حضرت ابوبکر رض سے بھی اس مسئلہ میں اپنا اطمینان کرنا چاہا۔ اور عجیب اتفاق کہ حضرت ابوبکر رض کو نبی ؐ کے جواب سے توارد ہوا یعنی آپ رض نے بعینہ وہی الفاظ

فرمائے جن کا اصل مفہوم ابھی واضح کیا جا چکا ہے۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ حضرت ابوبکرؓ نے کبھی بھی کوئی ایسی بات زبان سے ادا کی ہو یا کوئی ایسا فعل آپ سے سرزد ہوا ہو جس سے نبی برحقؐ کو اذیت اور آزار پہنچے۔ آپ کی یہ روش اسلام میں آنے کے بعد سے موت تک یعنی اپنے آخری لمحات تک جاری رہی۔ آپ کا مسلمانوں کے لئے ایثار اور ان کی نصرت میں بے دریغ اپنی دولت لٹانے کا عمل، اس کے علاوہ ہے۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ پیشہ کی رو سے تاجر تھے۔ اسلام لاتے وقت آپ کی دولت چالیس ہزار درہم تھی لیکن جس وقت آپ نے ہجرت کے موقع پر آنحضرتؐ کی معیت میں مدینہ کی راہ لی تھی تو آپ کی یہ تمام دولت سمٹ کے پانچ ہزار درہم رہ گئی تھی! ہوا یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی تمام کی تمام دولت نبی اکرمؐ اور مسلمانوں کی اعانت کی راہ میں قربان کر دی تھی۔ آپ ہی تھے جس نے سیکڑوں رنجور اور ستم رسیدہ مسلمانوں کو جو مشرکین کے غلام کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے اپنی دولت بے دریغ لٹا کے آزاد کرایا تھا۔

پھر یہی نہیں کہ آپ مسلم اوّل تھے آپ اسلام کی ہر آزمائش میں بھی سب سے بہتر طور پر پورے اترتے تھے، ثبات قدم میں آپ کا کوئی مثل اور نظیر نہ تھا۔ یقین کامل کی دولت سے آپ سے بڑھ کر کوئی مالا مال نہیں ہوا تھا۔

ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام لانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو ایک بالکل ہی نئی زندگی ملی اور آپ کی ذات اور ضمیر میں ایک مکمل انقلاب آ گیا۔ اب سابق ابوبکرؓ صدیق اکبرؓ بن چکے تھے جن کے خمیر میں ایثار و وفا، سکون قلبی و ذہنی، اور عزم و ثبات شامل تھے۔ اب آپ عقل سے زیادہ عشق تھے جہاں محو تماشائے لب بام ہونے کا کوئی امکان ہی نہ رہ گیا تھا۔ یہی بے مثل صفات تھیں جن سے متاثر ہو کے آنحضرتؐ نے ہجرت کے تاریخی کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لیا تھا۔ اور یقیناً یہی عزم و ایثار، جرأت و شجاعت، حلم و مروت سلیم الفکری اور کشادہ نظری رسولؐ کی ذات سے وابستگی اور کفر و شرک کی قوتوں سے کمال بیزاری کی صفات تھیں جن کے صلے میں آپ کو ثانی اثنین فی الغار کا لقب ملا۔ غار ثور میں صرف دو شخص تھے۔ آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ۔ اس لئے ظاہر ہے حضرت ابوبکرؓ ثانی اثنین، دو میں کے دوسرے ہوئے۔ مترجم) یہ ذیل کی آیت کے

حوالے سے ثابت ہے۔

(اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا)

لیعنی ، اگر تم نے اس کی مدد نہ بھی کی تو کیا ہوا۔ اللہ نے اس کی اُس کٹھن موقع پر دستگیری کی جب آپ (رسول کو) کفار اور منکرین اسلام نے مکہ سے نکلنے پر مجبور کیا اور جب یہ نوبت پہنچ چکی تھی کہ نبیؐ کو ایک غار میں پناہ لینی پڑی تھی جس میں اس نے (رسولؐ نے) اپنے دوسرے ساتھی کو یہ کہا کہ "ہمارس بندھائی تھی کہ درست اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

بعض کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ کو ثالث ثلاثہ یعنی تین کے گروہ کا تیسرا فرد (اول دو، خدائے تعالیٰ اور رسالتمآبؐ ہوئے) بھی کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا سے یہ تو واضح ہی ہے کہ خدا بھی وہاں تھا جہاں انسانی تاریخ کے یہ دو جلیل القدر قائد عزلت گزین ہوئے تھے حضرت ابوبکرؓ کی تادیب اور تربیت اور آپ کی شخصیت کے ارتقا میں خود قرآن نے دلچسپی لی تھی۔ قرآن ہی نے آپ کو ہمیشہ بنیادی اور اساسی چیزوں کی طرف متوجہ ہونے اور غیر اہم باتوں سے محترز رہنے کی تعلیم دی تھی۔ قرآن ہی نے آپ میں یہ جذبہ بیدار کر دیا تھا کہ اگرچہ مصائب کا سامنا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور ضمناً دوسرے انسانوں سے نیکی بھی ہو جاتی ہے تو خواہ مصائب کتنے ہی الم انگیز اور طبیعت پر ناگوار — اور بشری نزاکتوں کے لئے صبر آزما ہوں، انھیں جھیلنا چاہیئے۔ واقعہ افک یعنی تہمتِ حضرت عائشہؓ کے قضیہ میں یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے نفس کو قطعاً اللہ اور رسول کی خوشنودی کے تابع بنا دیا تھا۔ اس سلسلہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایک صاحب نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والوں کے گروہ میں شمولیت اختیار کی تھی اور وہ اتفاق سے حضرت ابوبکرؓ کے قرابت داروں میں بھی تھے۔ اور آپ وقتاً فوقتاً ان سے حسن سلوک فرمایا کرتے تھے۔ تہمت کے بعد بحیثیت باپ کے حضرت ابوبکرؓ شدید رنج و تاثر میں مبتلا ہوئے اور یہ چاہا کہ احسان اور منت کا ہاتھ کھینچ لیں اور اس تہمت تراش کو یوں تھوڑی سی تکلیف پہنچائیں۔ لیکن سورۂ نور میں افک کے واقعہ کے ذکر کے ساتھ یہ آیت بھی اتری۔

"وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ"

یعنی "تم میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے رزق میں کشادگی عطا فرما رکھی ہے انھیں چاہیے کہ وہ اپنے قرابت داروں، غربا اور ناداروں اور ان کی خاطر ترک وطن کرنے والوں سے حسن سلوک کرنا نہ چھوڑیں۔ ان لوگوں کو یہ زیادہ زیب دیتا ہے کہ وہ دوسروں کو معاف کر دیں۔ کیا تم لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ جو بخشش کرنے والا اور حد درجہ کرم گستر ہے تم کو مغفرت سے نوازے۔"

حدیث کے راویوں نے لکھا ہے کہ اس آیت کو سن کر جس کے اصل مخاطب ابوبکرؓ ہی تھے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ ہاں مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ مجھے مغفرت کی دولت بیدار ملے اور اس کے بعد ہی آپ نے اس شخص تک کے حق میں جس نے آپ کو غالباً سب سے بڑا ذہنی آزار پہنچایا تھا اپنی روش بدل دی اور حسنِ سلوک کا دوبارہ اجراء فرما دیا۔

جہاں تک کہ آپ کی رفاقتِ رسولؐ کا سوال ہے آپ نے کمال صدق و راستی، نیکی اور شرافت اور خلوص کا ثبوت دیا۔ اب یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ آنحضرتؐ کی نگاہوں میں کیوں حضرت ابوبکرؓ کی اتنی منزلت تھی اور آنحضرتؐ نے حضرت عائشہؓ، اور حضرت حفصہؓ کے یہ کہنے کے باوجود کہ ابوبکرؓ بہت نرم دل ہیں اور ممکن ہے یہ رقتِ قلبی اور شدتِ محبتِ نبویؐ آنحضرتؐ کے بجائے امامت کے فرائض انجام دیتے وقت اور ہی رنگ لائے (یعنی ممکن ہے اس احساس سے کہ آنحضرتؐ بسبب ضعف اب اس قابل نہیں کہ بنفسِ نفیس مسلمانوں کو نماز پڑھائیں آپ پر رقت طاری ہو جائے اور مقتدی آپ کی آواز تک نہ سن سکیں) حضرت ابوبکرؓ ہی کو اس نیابت کے لیے منتخب فرمایا۔ اس لیے کہ آنحضرتؐ کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ کر اللہ، رسولؐ اور اسلام کے لیے کوئی دوسرا خیر خواہ نہ تھا۔

اور اب یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک دن جب آپ کے مرض میں کچھ افاقہ ہو رہا تھا، حضرت ابوبکرؓ کو جو نماز پڑھا رہے تھے اور جنھوں نے آپ کی آہٹ پا کے پیچھے ہٹنا چاہا تھا کیوں نہیں ہٹنے دیا تھا اور اشارہ سے کیوں اپنی جگہ بدستور اپنے فرائض

انجام دینے کا حکم دیا تھا اور خود آپ کے بائیں طرف تشریف فرما ہو گئے تھے۔ تو گویا اب حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کی اقتدا میں اور مسلمان حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا میں نماز ادا کر رہے تھے۔

ابوبکرؓ آنحضرتؐ کی بات خوب سمجھتے تھے۔ شاید اس لئے بھی کہ نہ تو آنحضرتؐ کا کوئی اس حد تک مزاج شناس تھا اور نہ کسی کو آپ کے یہاں وہ تقرب حاصل تھا۔ حضرت ابوبکرؓ میں یہ صلاحیت تھی کہ آپ آنحضرتؐ کی باتوں کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ آنحضرتؐ نے ایک دن اپنی تقریر میں ایک جملہ کہا جس کا مطلب یہ تھا اللہ نے اپنے ایک معبود کو اس امر میں مختار بنایا کہ اگر وہ چاہے تو دنیاوی لذتیں اختیار کرے اور اگر وہ چاہے تو آخرت کی نعمتیں اور ابدی لافانی مسرتیں حاصل کرے اور اس بندہ معبود نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی۔ اس موقع پر ابوبکرؓ نے بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا تھا کہ اپنی جانیں اور اپنی اولاد تک آپ پر نثار کر کے رکھ دیں گے۔ عام لوگ یہ نہ سمجھ سکے تھے کہ آنحضرتؐ کے ارشاد سے اس اعلان کو کیا ربط ہو سکتا تھا! لیکن ابوبکرؓ پر یہ بات روشن ہو چکی تھی کہ یہ ارشاد گرامی دراصل اشارہ ہے اس بات کا کہ جلد ہی رسالتمآبؐ اس دنیا سے پردہ فرما لیں گے۔ احادیث کے راوی حضرات بعض احادیث بکثرت بیان کرتے ہیں اور ان میں اپنے سیاسی اختلافات کی بنا پر کثرت سے اختلاف کرتے ہیں۔ ایک گروہ اس بات کا مدعی ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے مرض الموت میں حضرت عائشہؓ سے ان کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابوبکر کو بلا بھیجا تاکہ حضرت ابوبکرؓ کے لئے ایک ایسا فرمان لکھوا دیا جائے جس سے بعد میں لوگوں کے لئے (جانشینی کے موضوع پر) اختلاف کی کوئی گنجائش نہ رہ جائے۔ لیکن اسی گروہ کے قول کے مطابق، بعد میں آپ نے فرمایا "جانے دو۔ ابوبکرؓ کے باب میں لوگ کوئی اختلاف نہیں کریں گے۔"

ایک گروہ کہتا ہے کہ آنحضرتؐ نے نفس فرمان لکھوانا چاہا تھا۔ ابوبکرؓ یا عبدالرحمٰنؓ کے نام نہیں لئے تھے اور جو لوگ اس وقت آنحضرتؐ کی خدمت میں شرف یاب تھے ان میں اس بارے میں اختلاف ہو گیا۔ بعض کا خیال تھا فرمان لکھا جائے اور بعض اس رائے کے خلاف تھے۔ اسی گروہ نے اس موقع کا حضرت عمرؓ کا مقولہ نقل کیا ہے۔ جو ان کے مطابق کچھ اس قسم کا تھا "رسول اللہ صلعم پر مرض غلبہ پا چکا ہے (اس لئے اس قسم کی کوئی کوشش آپ کے لئے مزید نقاہت کا باعث ہوگی) اور پھر دہر قسم کی رہنمائی کے لئے ہمارے

پاس قرآن تو موجود ہی ہے۔

میں نے کہیں دوسری جگہ اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ میں ان روایات کو مطلقاً مشتبہ سمجھتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ روایات بعد کے سیاسی فرقوں کے وجود میں آنے کے بعد گھڑلی گئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کے بارے میں یہ ارادہ فرما لیا ہوتا کہ آپؐ حضرت ابوبکرؓ یا کسی اور کے لئے کسی قسم کی وصیت فرمائیں تو کوئی شخص آپؐ کو اس ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ جو بھی ہو، جو امر واقعہ ہے، اور ایک یقینی اور مستند سی حقیقت، وہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے نہ ابوبکرؓ کے لئے اور نہ کسی دوسرے کے لئے، وصال کے موقع پر کسی قسم کی وصیت نہیں فرمائی تھی۔ اگر کوئی وصیت موجود ہوتی (جسے یقیناً تمام مسلمان جان جاتے) تو سقیفہ بنو ساعدہ میں کسی قسم کے اجتماع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور انصار بھی آنحضرتؐ کی وصیت کو فوراً مان لیتے اور کسی قسم کی مخالفت نہ کرتے۔ اور اگر حضرت علیؓ کے حق میں کوئی وصیت موجود ہوتی تو سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ خود حضرت علیؓ کی بیعت میں داخل ہوتے[1] لیکن وصیت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر تمام مہاجرین و انصار، بجز سعد بن عبادہؓ کے متفق ہو چکے تھے سب سے پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت قبول کی، آپ کے بعد حضرت عمرؓ نے، ان دونوں حضرات کے بعد حضرت عثمانؓ نے۔ اور اگر حضرت علیؓ کو اس کا علم اور یقین ہوتا کہ آپ کے حق میں رسالتمآبؐ کی وصیت ہے تو آپ موت کو ترجیح دیتے لیکن اس وصیت کو عملی شکل دینے کے لئے پوری پوری کوشش فرماتے۔

حقیقت یہ ہے، اور میرے نزدیک یہی نظریہ قابلِ ترجیح ہے، کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے واقعہ کے بعد، جب سے مسلمان آپس میں بٹ گئے، راویوں نے خود اپنے ساتھ اور امت کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ ان میں سے اکثر نے روایت کے بیان کرنے میں سچائی سے بالکل

---

[1] اسامہ بن زیدؓ کی کم سنی —— اور مدینہ کے حالات کے انتہائی نازک اور سنگین ہو جانے کے سبب آنحضرتؐ کے وصال کے بعد ایک بہت بڑی جماعت صحابہ اس بات کے خلاف تھی کہ لشکرِ اسلام شام کی طرف روانہ ہو لیکن حضرت ابوبکرؓ نے تمام مصلحتوں اور مشوروں کو رد کرتے ہوئے محض اس بنا پر یہ لشکر روانہ کیا کہ اس سلسلہ میں نبی اکرمؐ کے واضح احکام موجود تھے۔ اس سے فاضل مؤلف کی تائید مقصود ہے اور یہ دکھانا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کی کسی منشا کے خلاف کسی حال، کسی حیثیت اور کسی صورت میں نہ جا سکتے تھے۔ (مترجم)

کام نہیں لیا۔ ان لوگوں نے کچھ اس قسم کے تصورات اپنے ذہن میں قائم کئے کہ مزاجی اور نفسیاتی اعتبار سے گویا آنحضرتؐ کی وفات کے فوراً ہی بعد کے مسلمان، انہیں کے زمانے کے لوگوں کی طرح کے رہے سہے ہوں گے۔ قدیم تواریخ اور متکلمین کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آگے چل کر مسلمانوں میں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا، بے شک دوسرے امور میں بھی مسلمانوں میں شدید اختلافات رونما ہوئے۔ لیکن اس مسئلہ کا جہاں تک تعلق ہے، یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ سے متعلق مسئلہ کا یہاں مناظرہ اور بحث میں بہت کُھل کھیلا گیا۔ چنانچہ معتقدین حضرت ابوبکرؓ اس کے قائل ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ افضل المسلمین ہیں اور نبیؐ کی خلافت کا حق یُوں بھی سب سے زیادہ آپ ہی کو پہنچتا تھا۔ اس ضمن میں بعض ایسی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں جن سے بڑے تصنع آتی ہے۔ اسی طرح متکلمین میں وہ لوگ جو حضرت علیؓ کے باب میں تکلف اور غلو سے کام لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر معتقدینِ ابوبکرؓ کہتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ مردوں میں پہلے شخص ہیں جسے اسلام کی توفیق عطا ہوئی۔ ان کے مخالف اس سے انکار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ سلام میں پہلے مسلمان ہیں۔

ابوبکری گروہ متکلمین اعلان کرتا ہے کہ حضرت علیؓ اسلام لاتے وقت محض بچہ تھے اس لئے مکلّف نہ تھے۔ اور حضرت ابوبکرؓ کبر سنی کے زمانہ میں اسلام سے مشرف ہوئے اور معمّر آدمی اور بچہ کے اسلام کا فرق ظاہر ہے۔

اس کے بعد حضرت علیؓ کے سن کے بارے میں بھی اختلاف رونما ہوتا ہے۔ ابوبکری گروہ متکلمین و محدثین کہتا ہے کہ نبیؐ کی نبوت کے موقع پر حضرت علیؓ کی عمر محض نو سال تھی اور بعض لوگ تو عناداً اور خصومت کا شکار ہو کے یہ تک کہتے ہیں کہ اس وقت (نبوت کی ابتدا کے وقت) آپ محض چھ سال کے تھے۔

ظاہر ہے یہ زیادتی ہے۔ ہجرت کے موقع پر آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو مدینہ میں اس مصلحت کے پیشِ نظر رُک جانے کی ہدایت کی تھی کہ وہ آنحضرتؐ کے پاس جمع شدہ لوگوں کی امانتوں کو لوٹا دیں۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو ہدایت فرمائی تھی کہ وہ آپ کے بستر پر اپنی چادر اوڑھ کر سو جائیں تاکہ جو لوگ آپ کے قتل کرنے کی نیت سے آپ کے گھر کا محاصرہ

گئے ہوئے تھے انہیں یہ خیال رہے کہ آپؐ مستقل محو خواب ہیں۔ لیکن جب صبح ہوئی تو ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ سونے والی شخصیت حضرت علیؓ کی تھی۔

ہجرت کے بعد ہی بدر کا معرکہ پیش آیا۔ اس معرکہ میں حضرت علیؓ کی آزمائش ہوئی جس میں وہ پورے طور پر پورے اُترے۔ اس سے یہ بات ہویدا ہے کہ نبوت کے وقت آپ لڑکپن کی حدود سے نکل کے جوانی کے دور اوّل میں داخل ہو چکے تھے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ ہجرت کے موقع پر جب آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو مدینہ میں لوگوں کی امانتیں واپس کرنے کے مقصد سے رک جانے کا حکم دیا تھا اس وقت حضرت علیؓ کی عمر بیس سال سے زائد رہی ہوگی۔

یہ بہر حال طے ہے کہ ادھیڑ عمر والوں میں حضرت ابو بکرؓ سب سے پہلے اسلام لائے۔ اب اس بات کے پیش نظر، کہ حضرت ابو بکرؓ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آنحضرتؐ کے ہم قبیلہ تھے اور ان کا آپ سے کسی قسم کی قرابت کا رشتہ اس وقت تک نہ قائم ہوا تھا اس لحاظ سے بہت بڑی فضیلت کے حامل قرار پاتے ہیں کہ اس کے باوجود آپ نے اسلام لانے میں سب پر سبقت حاصل کی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔

حضرت علیؓ، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، آنحضرتؐ کے پروردہ یافتہ اور پروردہ تھے۔ اور آنحضرتؐ کے ساتھ ہی رہتے بھی تھے اس لئے کہ آنحضرتؐ نے اپنے چچا ابو طالب سے ان کا بار تکفل کرنے کی غرض سے، آپ کو اپنی کفالت میں قبول فرمایا تھا۔ اس لئے یہ بھی تسلیم کرنے میں عذر نہ ہونا چاہیئے کہ اپنے لڑکپن کے آخری اور شباب کے بالکل ابتدائی دور میں حضرت علیؓ نے اسلام قبول کرنے میں دوسروں پر سبقت حاصل کی۔

دونوں زعماء اور آئمہ نے (حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ) نے اسلام کی جانب سبقت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں، ایک نے (حضرت ابو بکرؓ نے خالص قرب اور تقرب الی النبی اور آنحضرتؐ کی زندگی کے گہرے مشاہدہ سے متاثر ہو کے اسلام قبول کیا تھا اور دوسرے نے یعنی (حضرت علیؓ) نے اس وقت جبکہ آنحضرتؐ نے اپنے اقربا کے سامنے بھی دعوت پیش کی تھی، سب سے پہلے اس دعوت پر لبیک کہا تھا۔ لیکن مختلف فرقوں کی عداوتیں اور خصومتیں یہیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس مہم کے پیش نظر آنحضرتؐ سے بے شمار، اور بیچ در بیچ احادیث بھی روایت

کی جاتی ہیں جن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو حضرت علیؓ پر یا اس کے برخلاف حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ پر ترجیح دی جاسکے مثلاً شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ آنحضرتؐ کے وصی تھے، اس نظریہ کے مخالف گروہ کا خیال ہے کہ سب سے پہلے آنحضرت نے حضرت ابوبکرؓ ہی کے حق میں وصیت فرمانی چاہی تھی پھر اس اطمینان کے بعد کہ مسلمان ان کے باب میں اختلاف کا شکار نہ ہوں گے۔ آپ نے اس خیال کو ترک کر دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی احادیث روایت ہوتی ہیں اور اس سلسلہ میں طبقات ابن سعد دیکھی جاسکتی ہے، جن کا لب لباب یہ ہے کہ مثلاً حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرتؐ سے اپنے خواب بیان فرمائے۔

"میں نے خواب دیکھا ہے کہ جیسے میں غلاظتوں کو کچلتا اور روندتا ہوا چلا جا رہا ہوں، یا میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرے سینہ پر دو سیاہ داغ ہیں۔ یا مثلاً میرے اوپر ایک یمنی چادر ہے۔"

پھر آنحضرتؐ سے ان خوابوں کی تعبیریں دیا جانا منسوب ہے۔

غلاظتوں کے انبار کو روند کے چلنے کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کے حاکم بنائے جاؤ گے' وہ سینے کے دو داغ اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ تمہارا دور دو سال کے لئے ہوگا یمنی چادر اس بات کی بشارت ہے کہ تمہارے یہاں ایک بیٹا ہوگا جو بے حد عالم ہوگا۔

ظاہر ہے یہ احادیث تکلف زدہ ہیں۔ ایسے ہی کچھ اور بھی خواب ہیں جو آنحضرتؐ سے منسوب ہیں اور جن کی تعبیریں حضرت ابوبکرؓ سے منسوب ہیں۔ ان خوابوں کے متعلق ابن سعد نے اپنی طبقات میں روایت بیان کی ہے۔ گویا نبی کریمؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا تھا:

"ابوبکر میں نے خواب دیکھا ہے جیسے میں اور تم کسی بالائی منزل پر چڑھ رہے ہیں اور میں تم سے اڑھائی زینے آگے بڑھ گیا ہوں۔"

حضرت ابوبکرؓ کا تعبیری جواب یہ ہوتا ہے۔

"اچھا خواب ہے یہ، رسول اللہ۔ اللہ آپ کو قائم اور مسرور اور مطمئن رکھے۔" لیکن آنحضرتؐ نے اپنا خواب دوبارہ مزید بیان کیا۔ خواب کو تیسری بار سننے پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ رسول اللہؐ۔ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ آپ کو اپنی رحمت اور بخشائش کے جہان

میں واپس بلا بھیجے گا اور میں آپ کے بعد اڑھائی برس زندہ رہوں گا۔

کیا خوب۔ حضرت ابوبکرؓ کو یہ تو معلوم تھا کہ ان کا انتقال کب ہوگا اور وہ بھی آنحضرتؐ کے وصال کے کتنے دنوں بعد! لیکن اپنے مرض الموت میں حضرت عمرؓ کو نامزد کرتے وقت انھیں یہ خوف تھا کہ مبادا استخلاف کے دوران ہی ان کی روح پرواز کر جائے۔ اسی طرح جب آپ کو موت قریب آتی دکھائی دی تو آپ نے اپنی بیٹی حضرت عائشہؓ سے وہ مال و دولت واپس منگوا بھیجا جو آپ نے انھیں دیا تھا تاکہ آپ اس مال کو باضابطہ اپنی میراث میں شامل کر دیں۔ اس بات کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی موت کے صحیح تعین پر ہرگز ہرگز قادر نہ تھے اس لئے یہ روایات مستند نہیں معلوم ہوتیں۔ مترجم)

مجھے یقین ہے یہ سب کی سب روایات جسے بعد میں تراشا گیا ہے اتنی ہی ضعیف ہیں جتنی مثلاً یہ روایت کہ آنحضرتؐ نے پہلے چاہا کہ حضرت ابوبکرؓ کے لئے وصیت فرما جائیں لیکن بعد میں لوگوں کے آئندہ رد عمل درباب ابوبکرؓ سے مطمئن ہو کے اس ارادہ سے اعراض فرمایا۔

جو بات قطعی طور پر ثابت ہے وہ یہ ہے کہ قرآن میں امر خلافت یا اس کی وراثت کے بارے میں کوئی نص قطعی موجود نہیں ہے۔ دراصل آنحضرتؐ کی کسی وراثت اور جانشینی سے متعلق وصیت پر مسلمانوں کا اجماع نہیں ہوا۔ اور اگر آپ کوئی وصیت فرما جاتے تو آپ کی وصیت سے مہاجرین اور انصار میں کوئی ایک شخص بھی اعراض نہ کرتا۔

ابوبکرؓ کی فضیلت اور افضلیت اس درجہ واضح سی چیز ہے کہ اس کے لئے قطعاً اس تمام آورد اور روایت سازی کی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح حضرت علیؓ کا مقام اس سے کہیں بلند تھا کہ ان کے لئے یہ سب پاپڑ بیلے جاتے۔ وہ (حضرت علیؓ) آنحضرتؐ کے چچا کے بیٹے، آپ کے داماد اور حسنؓ اور حسینؓ اسباط پیغمبر کے والد ہیں۔ اسلام کی خاطر حضرت علیؓ نے جو مصائب برداشت کئے ہیں اور جن جن آزمائشوں سے گذرے ہیں ان کے بارے میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں۔ اسی طرح آنحضرتؐ کو آپ سے جو محبت تھی اس کا آپ نے بارہا اعلان بھی فرمایا۔ تو مقام علیؓ کے تعین کے لئے مزید اختراع احادیث کی بھلا کیا ضرورت پیش آئی؟ مثلاً وہی حضرت عباس والی حدیث کو لیجیے جس میں یہ ہے کہ گویا حضرت عباس نے آنحضرتؐ کے چہرہ اقدس پر موت کے آثار دیکھ لئے تھے اور بنی عبدالمطلب میں جب کسی

کے ساتھ یہ حادثہ پیش آنے کو ہوتا تو حضرت عباسؓ پہچان جاتے تھے کہ یہ بس اب سدھارا اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت علیؓ جب ایک دن آنحضرتؐ کو دیکھ کے بیت نبوی سے باہر آئے تو لوگوں کے پوچھنے پر آپ نے آنحضرتؐ کی حالت کو قابلِ اطمینان بتایا۔ اسی موقع پر حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ تھاما اور کہا کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ تین دن اور گذرنے پر تم جبر و جور کا شکار ہو جاؤ گے اور میرا خیال یہ ہے کہ آنحضرتؐ اس موجودہ تکلیف سے جانبر نہ ہو سکیں گے۔ مجھے اپنے خاندان (بنی عبد المطلب) کے لوگوں کے بارے میں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ کس وقت اور کس مرض میں قریب المرگ ہو جایا کرتے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم حضورؐ کے پاس جا کے یہ معاملہ واضح کرا لو کہ آپ کے بعد امارت اور ریاست کس کے تصرف میں ہوگی۔ تاکہ ہم لوگ کم از کم یہ جان جائیں کہ ریاست ہم سے متعلق ہوگی یا کسی دوسرے خاندان کے فرد سے۔ روایت کے متعلق حضرت علیؓ نے فرمایا۔ واللہ اگر ہمارے پوچھنے پر آنحضرتؐ نے ہمیں امارت سے محروم رکھا تو پھر لوگ ہمیں قیامت تک امیر نہیں بننے دیں گے۔ میں تو ایسا سوال ہرگز ہرگز نہیں کروں گا۔

زیادہ تعجب انگیز یہ ہے کہ خود طبری نے دو طریقوں سے اسی حدیث کو روایت کیا ہے اور ظاہر روایت بیان کرتے وقت اس میں کے آورد۔ اور تصنع کی پرواہ نہیں کی۔

اس روایت کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں میں یہ بات واضح ہو سکے کہ حضرت علیؓ کو خود بھی اس کا علم نہ تھا کہ وہ نبی اکرمؐ کے وصی ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ اس کے متوقع تھے کہ ایک نہ ایک دن خلافت ان کے سپرد ہو جائے گی۔ پھر حضرت علیؓ کو اس روایت کی رو سے یہ خوف تھا کہ اگر ان کے پوچھنے پر آنحضرتؐ نے یہ فرما دیا کہ خلافت بنی ہاشم کے خاندان میں نہیں رہے گی تو شاید پھر امت کبھی بھی بنی ہاشم کے لئے خلافت کا مستحق اور حقدار بننا پسند نہ کرے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ حضرت علیؓ ذاتی طور پر اس سے بہت بلند تھے کہ اس قسم کی بات کرتے اور خصوصاً رسول اللہؐ سے شدید محبت کرنے کی بنا پر تو وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ اس روایت میں اگر کوئی حصہ درست اور قرین قیاس ہو سکتا ہے تو یہ کہ حضرت علیؓ کو اس بات کا احساس تھا کہ آنحضرتؐ اپنی بیماری میں مبتلا ہیں اور اس عالم میں بھی امت کے بارے میں فکر مند اور مشغول تدبیر ہیں۔ لہٰذا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ آنحضرتؐ پر مزید فکری بار

ڈالیں پھر یہ امر بھی آپ کے لئے یعنی (حضرت علیؓ) کے لئے دامن گیر رہا ہوگا کہ آنحضرتؐ کی نگاہوں میں اس درجہ محترم اور موقر ہو چکنے کے بعد آپ کے سامنے ایک جاہ طلب اور اقتدار خواہ بن کے جائیں۔

حضرت علیؓ جانتے تھے کہ آنحضرتؐ نے آپ سے کتنی محبت کی تھی، آپ سے کتنا سلوک کیا تھا اور آپ کی خدماتِ اسلام کی کتنی قدر کی تھی۔ حضرت علیؓ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ اگر آنحضرتؐ نے یہ طے کر لیا ہوگا کہ کسی کے لئے وصیت اور ہدایت فرما جائیں تو کوئی قوت آپ کو ایسا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی اور اگر آپ کی نیت اس بات کی نہ ہوگی تو کوئی آپ کو اس امر پر آمادہ بھی نہ کر سکے گا۔ اور چونکہ نبی اکرمؐ ہمیشہ احکام سماوی کے مطابق نطق فرما ہوتے تھے اس لئے اگر وصیت کے بارے میں کوئی الٰہی احکام ہوتے تو بغیر کسی کے پوچھے یا چاہے ہوئے آپ ضرور بالضرور اس باب میں کوئی صریح ارشاد فرما جاتے۔ راویوں نے ایک اور قصہ بھی گھڑ دیا ہے۔ میں اسے بھی بے بنیاد جانتا ہوں۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابوسفیان کو اس بات کا احساس ہوا کہ بیعت کا معاملہ حضرت ابوبکرؓ کے لئے قطعی ہوتا جا رہا ہے اور اب ان کے صاحب امر ہو جانے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ گئی تو ابوسفیان پر دورِ جاہلیت کی عصبیت یعنی قبیلہ پرستی غالب آئی۔ اس لئے کہ یہ بات بالکل واضح تھی کہ حضرت ابوبکرؓ نہ بنی عبد مناف میں تھے نہ بنی قصی میں، بلکہ محض بنی تیم میں سے تھے چنانچہ ابوسفیان گرجے اور تڑپنے لگے اور کہا کہ اگر میں نے چاہا تو میں ابوبکر کے خلاف شہسواروں کی ایک پوری فوج اکٹھی کر دوں گا، یا، مثلاً عبد مناف کی اولاد کدھر گئی؟ اس روایت کی رو سے ابوسفیان نے بعد میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو بھی انہیں جذبات سے متاثر کرنا چاہا اور انھیں اس موقع پر (خلافت کے خلاف) اکسانا چاہا۔ اس قصہ میں بھی ہے کہ ابوسفیان نے گویا (عرب قاعدے کے مطابق) اپنی بات کو زیادہ موثر بنانے کے لئے چند مشہور شعر بھی پڑھے تھے جن کا مطلب اور مفہوم یہ ہے:

"ظلم و ستم کے موقع پر بس دو ہی کام آنے والے تھے اور سر دست دونوں کے دونوں مجروح اور مضطرب حالت میں ہیں۔"

قصہ یہیں نہیں ختم ہوتا۔ اس کی رو سے ابوسفیان حضرت علیؓ سے بیعت کرنی چاہتے ہیں اور حضرت علیؓ یہ کہہ کے اس بیعت کو قبول نہیں کرتے کہ تم نے ہمیشہ اسلام کا برا چاہا اور کبھی اس کی مدد نہ کی۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔

ابوسفیان نے اگر یہ بات کہی ہوتی یا حضرت علیؓ کو یہ دعوت دی ہوتی تو جس صورت سے ہمارے راویوں کو اس کا علم ہو گیا۔ شیخینؓ کو بھی علم ہو گیا ہوتا اور وہ یقیناً ابوسفیان کو اس دعوت (الی التفرقہ) پر تنبیہ فرماتے۔ یہ سب کچھ ایک کہانی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اور ایسا نظر آتا ہے کہ راویوں نے یہ روایت بنی عباس کو خوش کرنے اور بنی امیہ کو بدنام کرنے کے لئے گھڑی تھی۔ اس قسم کی روایتوں کی تعداد بہت کافی ہے۔

بعض راویوں نے اس قصے میں کچھ ایسے اضافے فرمائے ہیں کہ اس کا غیر مستند ہونا یقینی سا ہو جاتا ہے۔ اضافہ یہ ہے کہ پہلے تو ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت میں بہت غلو اختیار کیا لیکن جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے بیٹے کو ولایت بخش دی ہے تو ابوسفیان صلہ رحمی کا خیال کر کے چپ ہو بیٹھے۔ خلافت کے بارے میں متعصب راوی بہت کھل کھیلے ہیں اور محض سیاسی جماعتوں کے مفاد کے لئے اس باب میں بہت جھوٹ سچ کہا گیا ہے اور پھر مؤرخوں نے یہ روایتیں بغیر کسی تحقیق اور چھان بین کے بیان کر دی ہیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسائل گڈمڈ ہو گئے اور ان کے سمجھنے اور ان کی تاویل کرنے میں مختلف لوگوں نے مختلف رائیں اختیار کر لیں۔

جو چیز میرے نزدیک لائق اعتبار ہے بلکہ تقریباً یقینی سی، وہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ، حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ منتخب کئے جاتے وقت رسالت مآبؐ کی تجہیز و تکفین میں منہمک تھے ادھر راویوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انصار نے جب آنحضرتؐ کی وفات کی خبر سنی اور ساتھ ہی حضرت ابوبکرؓ کی تقریر بھی جس کے ضمن میں آپ نے قرآن کی بعض آیات تلاوت فرمائیں۔ (مثلاً محض محمدؐ کو پوجنے والوں کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ محمدؐ تو وفات پا چکے ہیں لیکن جو اللہ کو پوجتا ہے اسے جاننا چاہیئے کہ اللہ قائم اور زندہ ہے جسے کبھی بھی موت نہیں آ سکتی) جس سے آنحضرتؐ کی وفات کے بارے میں شک میں مبتلا ہونے والوں پر بات واضح ہو گئی، میں نے ابھی کہا کہ انصار نے جب یہ سب کچھ سنا تو وہ بنی ساعدہ میں جو سعد بن عبادہ کے وسیع مکان کا بیرونی حصہ تھا۔ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ یہاں انصار نے آپس میں مشورہ کیا اس مشورہ میں یہ ٹھہری کہ چونکہ انصار مدینہ کے اصل رہنے والے ہیں اور مہاجرین، مدینہ میں باہر سے آ کے بسے ہیں اور ان میں اب کوئی صاحب وحی بھی موجود نہیں، تو اب انصار ہی کو یہ حق پہنچتا ہے، نہ کہ مہاجرین کو کہ وہ نبیؐ کے بعد اقتدار اعلیٰ سنبھال لیں۔ اس کے بعد ان لوگوں نے قبیلہ خزرج سے سعد بن عبادہ کا نام پیش کیا تاکہ

ان کی بیعت قبول کر لی جائے۔ یہ بات حضرت عمرؓ کو معلوم ہوگئی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو فوراً ہی آنحضرتؐ کے مکانِ مقدس پر بُلا بھیجا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے آدمی سے کہلا بھیجا کہ وہ مصروف ہیں لیکن حضرت عمرؓ نے دوبارہ اپنے آدمی کو بھیجا اور اب کے یہ پیغام بھیجا کہ ایک ایسا معاملہ آ کھڑا ہوا ہے کہ ان کا (ابوبکرؓ کا) آنا ناگزیر سا ہے۔ آخر حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور انصار کے ارادوں سے واقف ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ کے ساتھ خود انصار کے پاس تشریف لے گئے۔ راستے میں ان دونوں بزرگوں کو حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ مل گئے اور وہ بھی آپ دونوں کے ساتھ ہو لیے۔ اور جس وقت یہ تینوں (اسلام کے فرزندانِ گرامی) انصار کے پاس پہنچے تو لوگ تقریباً طے کر چکے تھے کہ سعد بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت ہو جائیں۔ ان حضرات نے انصار سے اس امر میں پہلے تو گفتگو کی، پھر باضابطہ بحث کی اور آخر میں ابوبکرؓ نے انصار کو قائل کر دیا کہ قریش سے تعلق رکھنے والے مہاجرین آنحضرتؐ کے ہم قبیلہ اور قرابت دار ہیں اور وہ نبیؐ کے اقتدار اور آپ کی سطوت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت قبول کر لی۔ یعنی آپ کو آنحضرتؐ کے بعد اُمت کا سردار مان لیا اور جس وقت انصار ہی کے ایک شخص نے اپنی برادری کو یاد دلایا کہ آخر انھوں نے کوئی دنیاوی شوکت و جلال کی خاطر تو آنحضرتؐ کو گوشۂ عافیت پیش کیا نہ تھا اور یہ کہ انھوں نے درحقیقت اللہ عزوجل کی خوشنودی کے لئے آنحضرتؐ کی نصرت و اعانت کا ابدی اور لافانی شرف حاصل کیا تھا تو انصار نے یک لخت اور بطور وستہ جمعی حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔

یوں ادران عجیب و غریب حالات میں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا آغاز ہو گیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ اس وقت آنحضرتؐ کی تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں لگے ہوئے تھے۔ بہر حال یہ سب کچھ اُسی ایک دن میں ہو گیا، جس دن آنحضرتؐ کا وصال ہوا تھا۔

اس سلسلہ میں راویوں نے ایک طرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ و حضرت ابوعبیدہؓ کے درمیان اور دوسری طرف انصار میں اوس اور خزرج کے مابین جس جس قسم کے سوال و جواب کا ذکر کیا ہے اور جو جو عبارتیں اس باب میں تصنیف کی ہیں مجھے وہ سب غیر اطمینان بخش معلوم ہوتی

ہیں اور سب ناقابلِ اعتبار! ہمارے ان راویوں کا انداز روایت کچھ ایک ایسے شخص کا انداز روایت معلوم ہوتا ہے جس نے گویا اس موقع قوم کو خود جمع ہوتے دیکھا تھا۔ ان کے مجمع میں شریک ہوا تھا ساری باتیں اور تقریریں سُنی تھیں۔ اور محض سُننے پر ہی اکتفا نہ کیا تھا۔ ان سب گفتگوؤں کے لیے یہ احتیاط بھی برتی تھی کہ وہ حرف بہ حرف ضبط تحریر میں آجائیں۔ اور ہو سکے تو مقررین کے انداز ہائے بیان اور ان کے حرکات و سکنات تک مصور کر دیئے جائیں۔ بس اتنی سی کسر رہ گئی تھی کہ آوازوں کے نشیب و فراز نہیں ریکارڈ ہو سکے لیکن عجیب بات کہ یہ قیل وقال اور حرف و حکایت سب بعد میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔ خلفاء راشدینؓ کے دور مبارک کے اختتام اور بنی اُمیہ کے دور کے آغاز پر۔ پھر یہ طرح و سخن طرازی اور گفتگو و تقریر کی باتیں ہمارے قصہ گویوں اور مورخوں تک کوئی کتابی شکل میں بھی نہیں پہنچیں، بلکہ یہ چیزیں سینہ بہ سینہ آئیں۔ پھر ظاہر ہے اس میں قوتِ حافظہ نے بھی اپنا معروف پارٹ ادا کیا ہوگا۔ بعض چیزیں یقیناً ترتیب و معنی کے لحاظ سے بدلی بھی گئی ہوں گی پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ سیاسی مصلحتوں نے اس میں مزید گلکاریاں کی ہوں گی۔ مثلاً راویوں نے یہ خیال کیا کہ اوس کے قبیلہ نے پہلے آپس میں مشورہ کیا۔ اس موقع پر کسی نے کہا "دیکھو اگر یہ خزرجی (قبیلہ خزرج کے لوگ) تمہارے حاکم بن بیٹھے اور آخر یہ سعد بن عبادہ لاکھ انصار کے طبقہ سے سہی اصولاً تو خزرجی ہیں، تو پھر تم لوگوں پر انھیں قیامت تک برتری حاصل رہے گی۔ اس کے بعد اوس والوں نے اسی میں مصلحت دیکھی کہ حضرت ابوبکرؓ کی امامت و زعامت قبول کریں تاکہ کم از کم ان کے ہم چشم اور پرانے رقیب خزرجی تو ان پر تسلط نہ ہو سکیں! جہاں تک ہم انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اس کے دور کے عام مسلمانوں کی سیرتوں اور ان کے مخصوص کرداروں کو سمجھ سکے ہیں۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں، اور واقعات ہمارا ساتھ دیتے ہیں کہ اسلام میں عربوں نے آن کر جیسے وہ دنیا ہی بدل دی تھی دل و نظر کی، اب نہ لوگوں میں وہ رشک و حسد کا جذبہ تھا نہ بغض و عداوت کے شرارے۔ اسلام آیا تو سارے کے سارے جاہلی کینے یکسر نیست و نابود ہو گئے تو پھر آخر یہ کیسے قرینِ قیاس ہو سکتا ہے کہ سرِ دار کے اُٹھتے ہی (مراد، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم) بلکہ عین اسی دن جس دن امت کے سر سے اس کا سایۂ عاطفت ہٹتا ہے دفعتہً سارے کینے ساری

عداوتیں اور سارے بغض محو کر گئے تھے۔ ہمیں یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ ان کے آدیوں میں بہت سے وہ غلام بھی تھے جنہیں جبراً و قہراً اسلام کے معاشرہ میں داخل ہونا پڑا تھا اور جن کے دلوں میں ابھی اسلام کے خلاف نفرت اور عناد کے جذبات موجود تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے شہر فتح کر لئے گئے تھے جن سے اقتدار چھن گیا تھا اور جنہیں بنو اُمیہ کے دور میں اپنے عہدوں سے بھی محروم ہونا پڑا تھا۔ پھر جب خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پہ بکثرت بہتان و افتراء سے باز نہیں رہا گیا تو آپ کے اصحابؓ کیسے محفوظ رہ سکتے۔ میری سمجھ میں سقیفہ بنو ساعدہ کے قضیہ میں حقیقت صرف اتنی ہے، مورخوں کی بتائی ہوئی بات سے بہت زیادہ جلد سمجھ میں آجانے والی۔

آنحضرتؐ کے وصال کے بعد انصارؓ کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ جب آنحضرتؐ کے فوراً بعد مہاجر اہلِ قریش آپ کے جانشین اور خلیفہ ہوں گے تو بہت ممکن ہے یہ بات ایک روایت سی بن جائے اور امارت اور امامت انہیں کے لئے محفوظ رہ جائے، تو ہوگا یہ کہ جب تک اللہ سے ڈرنے والے اور صالح قسم کے لوگ جنہوں نے آنحضرتؐ کی صحبتیں اٹھائی ہیں خلافت کا بار سنبھالے رہیں گے ہمارا حق پامال نہ ہوگا لیکن جب یہ برگزیدہ اصحاب امارت کی مجلس سے اٹھ جائیں گے تو ممکن ہے ان کے جانشین (جنہیں قریش ہی میں سے منتخب کیا جائے گا) ہم پر ظلم و جور کریں۔ انہیں خدشات کے پیشِ نظر انصارؓ کے گروہ نے آئندہ کے لئے کچھ احتیاطیں برتنی چاہیں لیکن جیسے انہیں بھی اس امر کا احساس ہو گیا تھا، حضرت ابوبکرؓ کے ان کے آنے سے پہلے ہی۔ کہ انصار ان کی امارت اور حکومت کبھی قبول نہیں کریں گے۔ اب ان بزرگوں نے یہ سوچا کہ مہاجرین سے یہ کہیں کہ امارت کو دونوں گروہوں میں، مہاجرینؓ اور انصار میں (جو از روئے قبیلہ یا نسب یا روایات نہیں بلکہ اسلام سے متعلق دو مختلف نوع کی خدمات کی بنیاد پہ ایک دوسرے سے ممتاز اور مشخص تھے۔ مترجم) برابر برابر بانٹ لیا جائے ایک امیر انصار کی جانب سے ہو ایک مہاجرین کی جانب سے، تاکہ اگر ان میں سے کوئی اسلامی نقطہ نگاہ سے اعتدال کا دامن چھوڑے تو دوسرا اسے ٹوک دے اور یوں حکومت میں توازن قائم رہے!

حضرت عمرؓ نے انصارؓ کی اس پیش کش کے جواب میں کہا تھا کہ یہ غیر ممکن ہے کہ ایک رسّی سے دو اونٹ باندھ دیے جائیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ جواب صحیح اور مناسب تھا۔ اور اگر کہیں انصار کی بات مان لی جاتی تو امورِ حکومت قطعاً درہم برہم ہوجاتے۔ پھر دونوں امیروں اور حاکموں میں اختلافِ رائے کے پیدا ہونے کے بعد تو مسلمانوں کی زندگیاں پُر آشوب ہو جاتیں اور ممکن تھا کہ عداوتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا اور نوبت جنگ و جدال تک پہنچ جاتی۔

جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں جلیل القدر زعماء اور وزرائے پیغمبر، انصار کو صحیح رائے پر لانے میں یکساں کامیاب ہوگئے۔ اور سقیفہ سے (جہاں امت نے ایک تاریخی اور معرکہ آرا، اور عاقلانہ فیصلہ کیا) اس وقت تک نہیں واپس ہوئے جب تک کہ خود انصار نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں قبول کرلی۔ سوچنے کی بات ہے اگر انصارؓ اقتدار اور حکومت کے فی نفسہٖ خواہاں ہوتے اور شریکِ حکم ہونے کے ایسے ہی خواہشمند، تو حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے رفقا یعنی حضرت عمرؓ و حضرت ابوعبیدہؓ چند گھنٹوں میں ان لوگوں کو کیسے قائل اور مطیع کرلیتے!۔

راوی یہ بھی لکھتے ہیں کہ سعد بن عبادہ نے جنہیں انصارؓ نے خلافت کے لئے اکسایا تھا، حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ نہ تو عام مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے، نہ جمعہ کے اجتماع میں آتے تھے اور نہ عام مسلمانوں کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرتے تھے! لیکن ان روایتوں کے برخلاف دوسری روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سعد بن عبادہ نے بھی تمام لوگوں کی طرح حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ تسلیم کیا تھا۔ اس تمام مباحثہ میں بات صرف اتنی ہے کہ سعد بن عبادہؓ نے بیعت میں کچھ دیر ضرور لگائی تھی۔ اس کے اسباب ہیں، ایک تو سعد بیمار رہتے تھے اور دوسرے کبھی کبھی انہیں وہ انصار کا اوّل اوّل خلافت کے عہدہ جلیلہ کے لئے انہیں آمادہ کرنا یاد آتا تھا اور اس یاد سے وہ ایک تلخی اور بے مروتی کا احساس کرتے تھے، اس لئے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کی گفتگوؤں کے بعد انصارؓ نے پھر سعد کی طرف بالکل توجہ نہ کی تھی۔ سعدؓ یہ سوچتے تھے تو انھیں دکھ ہوتا تھا جو بالکل فطری اور طبعی بات تھی۔

جو راوی اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ سعد بن عبادہ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت قبول کی تھی انھوں نے اس باب میں مزید گل کھلائے ہیں ——— ان کا ارشاد ہے کہ سعد کو جنوں نے قتل کر ڈالا تھا۔ ان محقق راویوں نے جنوں سے یعنی سعد بن عبادہ کے قاتل جنوں سے کچھ اشعار بزبان عربی بھی منسوب فرمائے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے۔

"ہم (جنوں) نے خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہم نے ابھی ترکش کے دو تیر بھی نہیں خالی کئے تھے کہ سعد کا سینہ چھلنی ہو گیا۔"

میں نہیں سمجھتا اس روایت پر مزید جرح و بحث کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

باب ۵

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت

دو مسئلے اور باقی رہ جاتے ہیں جن میں راویوں نے زبردست خلط مبحث کیا ہے اور انھیں سے مسلمانوں میں بہت سی غیر مستحسن اور سخت ناخوشگوار قسم کی تفرقہ بندی بھی پیدا کر دی ہے۔ ہم یہاں اس مسئلہ کو اس کی اصلی شکل میں پیش کئے دیتے ہیں۔

پہلا مسئلہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں پر حضرت علیؓ کے بیعت کرنے کا مسئلہ ہے۔ اس باب میں راویوں میں زبردست اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت اسی وقت قبول کر لی تھی جب دوسرے مسلمانوں نے ایسا کیا تھا۔ پھر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بیعت کے وقت حضرت علیؓ اپنے مکان میں بیٹھے ہوئے تھے اور جس وقت کسی نے آکے آپ کو اطلاع دی کہ حضرت ابوبکرؓ بیعت لینے کے لئے مسجد نبوی میں بیٹھ چکے ہیں اور لوگ ان سے بیعت ہو رہے ہیں تو باوجود اس کے کہ حضرت علیؓ اس وقت برہنہ جسم تھے آپ مسجد کی جانب اسی حالت میں تیزی سے بڑھے اور جب آپ بیعت ابوبکرؓ سے بالکل فارغ ہو چکے تو کہیں آپ کو دفعتہً خیال ہوا کہ کمال عجلت میں آپ اپنی ردا (چادر) اور ازار (یہاں قمیص سے مراد) بھی بدن پر ڈال کر نہیں گئے تھے۔ چنانچہ یہ چیزیں آپ نے بعد میں گھر سے منگا بھیجیں۔ اس روایت کا عدم اعتدال بالکل ہی ظاہر ہے۔

بعض راوی یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت قبول کرنے میں تاخیر

برتی تھی۔ اور آپ کے ساتھ حضرت زبیر بن العوامؓ نے بھی تاخیر برتی تھی اور کچھ مدت گذرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے ان دونوں حضرات کو بلا بھیجا اور بلا کے کہا کہ اگر تم لوگ برضا و رغبت امیر کی اطاعت قبول نہ کروگے تو تم کو ایسا کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ یہ روایت کس درجہ ناقابلِ قبول ہے۔ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں حضرت ابوبکرؓ کے لئے یہ بات ناقابلِ تصور تھی کہ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد ہی اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی زندگی میں حضرت علیؓ کو حضرت عمرؓ کی سخت گیری کا ہدف بنا دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس روایت کے اختراع کرنے والوں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ یہ ثابت کرسکیں کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت برضا و رغبت نہیں قبول کی تھی۔ اکثر راوی روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت بہت بعد میں قبول کی تھی۔ ان کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی ہاشم نے اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور عام مسلمانوں کے مسلک کی مخالفت کی تھی اور یہ مخالفت چھ ماہ تک قائم رہی تھی۔ پھر جب چھ ماہ کے بعد حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کا انتقال ہو گیا تو ان حضرات نے بیعت قبول کر لی۔ اس روایت کا استبعاد بھی بالکل ہویدا اور واضح ہے۔ آخر ایسا کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ حضرت علیؓ اور بنی ہاشم مسلمانوں کی عام جماعت سے الگ ہٹ کر اپنی ایک الگ راہ تفرقہ اختیار کر لے اور حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی موت کے انتظار میں بیٹھے رہتے اور ادھر حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے انتقال کے بعد ہی بیعت کی طرف (حضرت ابوبکرؓ کی) دوڑ پڑتے کیونکہ اس وقت انہیں یہ نظر آتا ہے کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے مرتے ہی عام لوگ ان سے اپنی توجہ ہٹا لیں گے۔

حضرت علیؓ جس درجہ فضیلت مآب تھے، مسلمانوں کے خیر خواہ تھے اور آنحضرتؐ کے زمانہ میں جس جس طرح آپ نے سختیاں جھیلی تھیں، اس کے پیشِ نظر یہ روایت قطعاً ناقابلِ قبول معلوم ہوتی ہے۔ دراصل راویوں نے دو مسائل بالکل ہی آپس میں گڈمڈ کر دیئے ہیں۔

پہلا مسئلہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں میں حضرت علیؓ کی بیعت کا ہے اور دوسرا حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی آنحضرتؐ کے ترکہ کے سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ سے مبینہ ناراضگی کا ہے۔ دخترِ اصغرِ پیغمبر، حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے اپنے والد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فدک اور خیبر میں

واقع جائداد سے اپنا حصہ طلب کیا۔ جسے حضرت ابوبکرؓ نے اس لئے دینے سے معذرت کا اظہار کیا کہ آپ نے خود رسالت مآبؐ سے یہ سن رکھا تھا کہ انبیا علیہم السلام کا عام لوگوں کی طرح کوئی وارث نہیں ہوتا اور وہ جو کچھ چھوڑتے ہیں اس کی حیثیت صدقہ کی ہوتی ہے۔ روایت کی رو سے حضرت فاطمہؓ نے یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ سے گفتگو تک کرنا چھوڑ دی! اس روایت نے مزید گل کھلائے ہیں۔ اس کی رو سے گویا یہ حضرت ابوبکرؓ کے اس برتاؤ کے بدلے میں ہوا! جو مبینہ طور پر آپ نے حضرت فاطمہؓ سے کیا تھا۔ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو حضرت فاطمہؓ کے مرنے تک کی اطلاع تک نہ دی اور انہیں راتوں رات دفن کر دیا۔ (اور مزے کی بات یہ کہ) بعد میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ میں صفائی بھی ہوگئی! حضرت فاطمہؓ کے مرتے ہی!! سمجھ میں نہیں آتا اس بات کا اور بیعت کا تعلق بھی کیا ہے۔ ظاہر ہے حضرت علیؓ نے بھی عام مسلمانوں کی طرح حضرت ابوبکرؓ کی بیعت قبول کی تھی جس میں نہ غیر معمولی عجلت کی تھی اور نہ کسی رنجش خاطر کا ثبوت دیا تھا۔ اور اگر حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی یوں ہی مخالفت کرنی تھی تو آپ بڑی آسانی سے اس مخالفت کا اظہار سقیفہ بنی ساعدہ میں کر سکتے تھے اور جس دلیل سے حضرت ابوبکرؓ نے انصارؓ کو قائل کیا تھا اسی دلیل سے آپ (حضرت علیؓ) بھی حضرت ابوبکرؓ کو قائل کر سکتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے انصارؓ کے گروہ کے سامنے یہ کہا تھا کہ قریش کے مہاجر آنحضرتؐ کے بعد امت کی امیری اور آپؐ کے منصب و اقتدار کے انصار سے زیادہ مستحق ہیں اس لئے کہ وہ آپؐ کے اہل خاندان اور اہلِ قرابت ہیں۔

پھر اس میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں کہ حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مقابلہ میں آنحضرتؐ سے زیادہ قریب تھے۔

لیکن جیسا کہ میں نے اس سے پہلے عرض کیا حضرت علیؓ نے راویوں کے زعم ہائے باطل اور خیال ہائے بے بنیاد کے باوجود ایسا نہیں کیا یعنی (حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی مخالفت نہیں کی) آپ کو ایسا کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ دوسرے تمام مسلمانوں کی طرح آنحضرتؐ سے حضرت علیؓ کے رشتے سے خوب واقف تھے۔ جہاں تک امت کا تعلق ہے اس کے پیشِ نظر حضرت ابوبکرؓ کے تجربات، آپ کی بڑائی، مسلمانوں اور آنحضرتؐ کی خاطر آپ کا

حسن سلوک و وفاداری، آنحضرتؐ کا ہجرت کے موقع پر (جو اسلام کی تاریخ میں سب سے اہم اور سب سے نازک موقع تھا) حضرت ابوبکرؓ کو اپنی رفاقت سے مشرف کرنا، اور مرض الموت کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ کو اس بات کا حکم دینا کہ وہ آپ کی بجائے مسلمانوں کو نماز پڑھائیں، یہ ساری چیزیں مسلمانوں کے سامنے تھیں چنانچہ مسلمان یہ کہتے سُنے گئے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو ہماری دینی امامت کے لئے پوری اُمت میں منتخب کیا تو کیوں نہ ہم اپنے دنیاوی امور بھی انہیں کو نہ سونپ دیں یعنی ان کو دنیاوی امور میں بھی امام اور زعیم بنائیں۔

سب سے اہم اور معرکہ کی بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت ایک متنفس نے بھی نہیں کی۔ نہ بنی ہاشم میں سے کسی نے مخالفت کی اور نہ ہی کسی دوسرے قبیلہ سے کسی نے مخالفت کی اور اس باب میں اس کے علاوہ جو کچھ بھی کہا جاتا رہا ہے وہ دراصل نتیجہ ہے بعد کی افترا پردازیوں اور سخن سازیوں کا، یعنی اس وقت کی سخن سازیوں کا جب گروہوں اور فرقوں میں بٹ چکے تھے۔ کسی شخص کے لئے بھی تاریخی اور علمی طور پر ممکن نہیں کہ اس بات کو قطعی طور پر ثابت کر سکے کہ حضرت علی کو شیخین کا خلافت کے معاملہ میں آپ پر ترجیح پانا آپ کو ناگوار ہوا تھا۔ کم از کم خود حضرت علیؓ نے ہمیں اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ پھر اس سلسلہ کی روایات پر ہم کیسے اطمینان کر سکتے ہیں۔ یہ سب قطعاً غیر مستند ہیں اور پھر حضرت علیؓ کا مقام اس سے بلند ہے کہ وہ زبان سے شیخینؓ کی بیعت کا اقرار کریں اور دل میں کچھ اور چھپائے رہیں۔ درصورتیکہ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت علیؓ نے خلافت شیخین کے دور میں ہمیشہ خیر خواہی کا ثبوت دیا۔ اور حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے اکثر موقعوں پر مدد تک چاہی اور جب کبھی انصار و مہاجرین کے خاص خاص زعماء سے مشورہ لیا گیا۔ آپ سے بھی یعنی (حضرت علیؓ) سے بھی خصوصی طور پر مشورہ لیا گیا۔ کہیں دوسری جگہ میں نے ذکر کیا ہے کہ جس وقت حضرت عثمانؓ کے خلاف ایک جماعت اُٹھی اور اس سلسلہ میں خوب مخالفتوں کا بازار گرم ہوا تو حضرت علیؓ نے بے حد خیر خواہی اور خیر اندیشی کا ثبوت دیا۔ یقیناً حضرت علیؓ پر ظاہر و باطن کی عدم ہم آہنگی کا الزام لگانا بڑی جسارت کا کام ہے۔ حضرت علیؓ ان سچے اور انتہائی اُجلا کھرے مسلمانوں میں تھے جن کے باطن اور ظاہر یکساں تھے۔ جن میں للہیت بھی تھی۔ اور جنہوں نے مسلمانوں کے

لیے سعد درجہ صداقت اور نیکی اور خیر اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے تمام عمر حتی الامکان مسلمانوں اور اسلام کو آفات اور گزند سے بچائے رکھا۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے احتیاطاً اور مصلحتاً یا نعوذ باللہ تقیہ کے طور پر یعنی ڈر کے مارے مختلف خلفاؑ کی (مراد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی بیعت کی وہ آپ پر اتہام لگاتے ہیں۔ اور آپ کی رسالت مآبؐ اور اللہ تعالیٰ سے محبت، اور ساتھ ہی خود رسالت مآب کی آپ سے محبت جس کا مظاہرہ خیبر کے موقع پر عطائے پرچم کی شکل میں ہوا تھا، اس کے پیش نظر ہرگز مناسب نہیں کہ ایسا اتہام آپ کی ذاتؓ الاتبار پر لگایا جائے۔

اس باب کے شروع میں میں نے جن دو مسئلوں کا ذکر کیا تھا۔ ان میں سے ایک تو یہ مسئلہ تھا جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرا مسئلہ حضرت عمرؓ سے منسوب ایک قول سے اپنے لئے سامان وجود مہیا کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ سے ذیل کا یہ قول منسوب ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت اچانک ظہور میں آگئی اور وہ بالکل ہی ناگہانی واقعہ ثابت ہوئی اور اللہ نے اسے ہر قسم کی برائی سے محفوظ رکھا اب کچھ لوگ حضرت عمرؓ کے اس قول کو جس کی صحت کے بارے میں میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بنیاد بنا کے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو مشتبہ اور مشکوک قرار دیتے ہیں لیکن یہ رکیک اور مہمل سی بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ، مکہ، طائف اور قبائل عرب میں پھیلے ہوئے تمام مہاجر اور انصار مسلمان حضرت ابوبکر کی بیعت اور خلافت پر سبھی اکٹھے ہوئے تھے نہ صرف یہ بلکہ امر خلافت اور اس پر حضرت ابوبکر جیسی شخصیت کا تمکن ان تمام لوگوں کے لیے انتہائی خوشگوار بات تھی۔ ان لوگوں نے ہر معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ سے خیر خواہی کی، مشورہ دیا، اور آپ نے جن باتوں سے روکا ان سے باز بھی رہے۔ ظاہر ہے امت کا یہ تعاون نہ ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ فتنہ ارتداد کا اس عزم و ثبات کے ساتھ بالکل مقابلہ نہ کر پاتے۔ مہاجرین اور انصار کے لشکر ہرگز مرتدین کی سرکوبی کے لئے روانہ نہ کر سکتے اور مانعین زکوٰۃ کو اس بات پر قہراً مجبور کر سکنے کی قوت کا بالکل مظاہرہ نہ کر سکتے کہ جو کچھ آنحضرتؐ کے دور میں زکوٰۃ کی شکل میں دیتے تھے اب بھی دیتے رہیں۔ اسی طرح پوری امت کے خیر سگالی کے جذبات اور تمام مہاجرین اور انصار کے تعاون مطلق کے بغیر آپ مہاجرین اور انصار کے گروہ کو عراق پر جہاد کے لئے جو ان دنوں مجموعی طور پر فارس و شام و روم سے متعلق تھا اور جس پر فوج کشی مرادف تھی تین عظیم اور قوی سلطنتوں سے ٹکرانے کی، نہ

بیعجلت ہے۔ دراصل متذکرہ بالا بلیغ اور مختصر سے جملہ سے اگر واقعی وہ کہا گیا حضرت عمرؓ کی مراد یہی ہی ہوگی کہ ابتدائے کار حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ان معنی میں کامل نہ ہوئی تھی کہ ابھی تک سواد اعظم کی رائے کی مہر تصدیق اس پر ثبت نہ ہوئی تھی اور عام مسلمانوں سے اس باب میں استصواب یا مشورہ نہیں کیا جا سکا تھا۔ اور وہ انصار کے اجماع کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں دفعتہً اور اچانک تکمیل مراحل سے گذر گئی تھی۔ اس موقع پر انصارؓ نے پہلے یہ ارادہ کیا تھا کہ سعد بن عبادہ کو اپنا امیر بنا لیں گے لیکن ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابو عبیدہؓ کے مواعظ کے بعد صورتِ حال بدل گئی۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے انصارؓ کو آمادہ کیا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ میں سے کسی کو اپنا امیر چن لیں۔ لیکن ان دونوں بزرگانِ امت ختم الرسل نے یہ پسند نہیں کیا کہ انہیں ابوبکرؓ پر ترجیح دی جائے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً حضرت ابوبکرؓ کے حق میں دستبردار ہوتے ہوئے ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی اور اس کے بعد انصار کے گروہ نے بھی بعینہٖ یہی کیا۔ لیکن اگر انصارؓ نے اسے ناپسند کیا ہوتا اور سعد بن عبادہؓ ہی کی امارت پر مصر رہتے تو حالات کا رُخ دوسرا ہو جاتا۔ پھر ہوتا یہ کہ لوگ اس وقت تک تو کچھ نہ کرتے جب تک رسالت مآب کی تدفین عمل میں نہ آ جاتی، لیکن اس کے بعد ہی مہاجرینؓ اور انصارؓ میں اہل الرائے حضرات یقیناً کہیں جمع ہوتے اور خلیفہ رسول اللہ کا دوبارہ انتخاب کرتے۔

یوں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت اچانک واقع ہوئی اور بقول حضرت عمرؓ اللہ نے اسے ہر قسم کی برائی سے بچائے رکھا۔ چنانچہ جہاں تک اس بیعت کا تعلق تھا نہ تو مسلمانوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا نہ اس پر کسی نے شک کیا اور نہ اسے آجکل کی زبان میں کسی متنفس نے چیلنج کیا۔ لوگوں نے اس بیعت کو برضا و رغبت قبول کیا۔ اس موقع پر ان کے اندر رائی سا بھی کسی قسم کا خلجان یا ہیجان نہ تھا۔ یہی نہیں بعد میں ان مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ سے خیر خواہی اور خیر اندیشی کا بھی ثبوت دیا اور حضرت عمرؓ کی مقبولیت، امامت، زعامت اور اُمت پر ان کے محیر العقول اثر و نفوذ اور اقتدار اور تحکم کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ آپ نے اپنے مرض الموت میں اپنی جانشینی کے لئے جب حضرت عمرؓ کی سفارش فرمائی تو اس وصیت اور سفارش کو فوراً قبول کر لیا گیا۔ اس وصیت کے نفاذ کی تفصیلات

ہمیں مورخوں نے بتائی ہیں حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے جسے صبح قیامت تک انسانی زندگی کے ہر لحہ متغیر حالات میں انسان کی بنیادی رہنمائی کرنی ہے اخلفائے کے انتخاب اور چناؤ کے کسی خاص نظام کو امت پر نہیں نافذ کیا۔ آنحضرتؐ کے طریق میں بھی ہمیں یہی روش کارفرما نظر آتی ہے۔ قائد کے انتخاب کے سلسلہ میں آنحضرتؐ کے عہد کے مسلمان نظام بیعت کے عادی ہو گئے تھے۔

ہجرت سے پہلے انصار کے سربراہوں کا آنحضرتؐ سے آپ کو گوشہ عافیت پیش کرنے اور اعانت و نصرت سے شرف یاب ہونے کا قول دینا، پھر اسی قسم کی یقین دہانی کی مدینہ میں تکرار، ایک عام مسلمان کا اقرار اسلام، کسی خاص شخص کا اپنے پورے گروہ یا قبیلہ کی جانب سے نیابت کے طور پر اسلام کا قبول کرنا، قریش کا فتح مکہ کے موقع پر بیعت کرنا، پھر مختلف گروہوں کی جانب سے نمائندہ اشخاص کا یہ فخر حاصل کرنا، ان سب واقعات کا عام مسلمانوں پر یہ اثر ہوا کہ انھوں نے طے کیا کہ آنحضرتؐ کی خلافت بھی بیعت ہی کے ذریعہ سے قائم کی جائے اور آپ کے منصب اقتدار کو تسلیم کرنے کی جو شکل آپ کی زندگی میں تھی رہی آپ کے بعد بھی جاری رہے۔

آنحضرتؐ اور دوسرے اشخاص میں جو فرق تھا اگر اسے دیکھا جائے تو آنحضرتؐ سے کی ہوئی بیعت اور خلفاء سے کی ہوئی بیعت میں بھی فرق تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ آنحضرتؐ صاحب وحی و الہام تھے۔ اور بیعت لیتے وقت آپ محض اپنی ذات والا تبار ہی کی جانب نہیں لیتے تھے بلکہ در اصل خدائے عزوجل کی جانب سے بھی بیعت حدیبیہ کے موقع پر سورۂ فتح کی یہ آیت نازل ہوئی تھی:۔

(اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ، يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ، فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ، وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا) یعنی؛ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ پھر جو عہد کو توڑنے کا نقصان اسی کو ہے اور جو اس بات کو جس کا اس نے خدا سے عہد کیا ہے پورا کرے تو خدا اسے عنقریب اجر عظیم دے گا۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ سے بیعت ہونے کے بعد اسے توڑنا ممکن نہ تھا اور کوئی ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں یہ عمل در اصل مرادف قرار پاتا خود اللہ سے نقض عہد کرنے کا۔ آنحضرتؐ کے دست مبارک پر بیعت کرنے والے کو جو اس علامتی عمل سے گویا آپ

کے اقتدار کو تسلیم کر لیتا تھا) آنحضرتؐ سے رد و قدح کرنے یا آپ کی فرمائی ہوئی کسی بات کو، خصوصاً جب وہ اللہ کی جانب سے نازل ہوئی ہوتی، رد کرنے کی قطعاً مجال نہ تھی۔ تمام دیگر امور میں، خواہ وہ قرآنی آیات کے اجمال کی تفصیل ہوں یا دینی اور دنیاوی امور سے متعلق ہوں، آپ کا حرف حرف آخر اور قانون مطلق تھا۔

البتہ جس وقت آنحضرتؐ اپنے رفقاء اور وزراء سے کسی ایسے معاملہ میں مشورہ طلب فرماتے تھے جس کے بارے میں کوئی سماوی حکم نہیں نازل ہو چکا ہوتا تھا تو لوگ آپ کو مشورہ دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ کبھی کبھی آپ سے اختلاف رائے بھی کرتے تھے اور نیک نیتی سے آپ کو بعض فیصلوں سے باز رکھتے تھے۔ مثلاً حباب بن منذر کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ بدر کے موقع پر حباب نے آنحضرتؐ سے پوچھا تھا کہ یہ جو آپ نے اس جگہ (وہ پہلی جگہ جو آنحضرتؐ نے صف آرائی کے لئے منتخب فرمائی تھی) مجاہدین کو اتارا ہے تو یہ اللہ کے حکم سے ہے یا اس میں صلاح و مشورہ کی بھی گنجائش ہے، اثبات میں جواب سننے کے بعد حباب نے آپ کی رائے سے اختلاف کیا اور آنحضرتؐ نے حباب کے مشورہ کو قبول فرما لیا۔ کیونکہ وہ جگہ جو حباب نے تجویز کی تھی معرکہ کے نقطہ نگاہ سے بہتر پائی گئی۔ اب جہاں تک عام لوگوں کی بیعت خلفاء کا تعلق ہے۔ یہ ان کے اور خلفا کے درمیان ایک آپس کا عہد اور معاملہ ہوتا تھا۔ جسے فریقین میں سے کوئی بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات کے ذریعہ عہد شکنی سے روکا ہے۔ مثلاً سورہ نحل کی ذیل کی آیت میں صاف طور پر یہ احکامات موجود ہیں۔

(وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَیْكُمْ كَفِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَیْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا یَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَیُبَیِّنَنَّ لَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ) یعنی

اور جب خدا سے عہد (واثق) کرو تو اس کو پورا کرو اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو مت توڑو کہ تم خدا کو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو جانتا ہے،

اور اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے محنت سے تو سوت کاتا، پھر اس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ (اور یہ بھی نہ ہوا کہ تم اپنی قسموں کو آپس میں اس بات کا ذریعہ بنانے لگو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ غالب رہے۔ بے شک اللہ تم کو آزماتا ہے اور حشر کے دن تمہارے سارے معاملات تم پر واضح کر دے گا۔"

اسی طرح سورہ الاسرائیں میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

(وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا) یعنی

اور عہد پورے کرو (عہد شکنی مت کرو) عہد کے بارے میں پرسش ہوگی۔

سورہ بقرہ کی ذیل کی آیت سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وفا عہد یعنی وعدہ کو پورا کرنے اور سنبھالنے کی خصلت اور صفت کو نیکی کا درجہ دیا گیا ہے اور یہ چند مخصوص درجہ کی نیکیوں میں سے ایک ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ) یعنی

نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق و مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور فرشتوں پر اور خدا کی کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور غلامی کی قید سے) گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کرلیں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو (خدا سے) ڈرنے والے ہیں۔

خلافت خلیفہ اور اس کی رعیت کے درمیان ایک عہد و پیمان ہے اور جو چیز اسے قائم رکھنے والی ہے وہ خلیفہ کی یہ آمادگی اور اس کا یہ عزم ہیں کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولِ معظم کے

طریق کو اپنے تمام کاموں میں مشعل بنائے رکھے گا۔ اس کے دوسرے اہم فرائض یہ ہوں گے کہ وہ حتی الوسع مسلمانوں کی خیراندیشی کرے گا اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ دکھائے گا۔ دوسری جانب مسلمان بھی اس امر کے مکلف ہوتے ہیں کہ بغیر کسی چون وچرا کے اس قسم کے صاحب امر اور خلیفہ کے احکام کی اطاعت کریں اور اس کے تمام امتناعی قوانین کو مان لیں۔ اب خلافت کے اس تصور کی رُو سے اگر خلیفہ اپنے عہد کو عملاً توڑ دیتا ہے۔ اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ سے منحرف ہو جاتا ہے ، اسی طرح مسلمانوں کی فلاح وصلاح کا خیال بھی اسے نہیں ستاتا تو رعیت پر ایسے خلیفہ کی اطاعت ہرگز واجب نہیں رہ جاتی اور رعیت کو یہ حق حاصل رہتا ہے کہ خلیفہ سے اپنے عہد و پیمان اور اپنی امارت کے حلف پہ قائم رہنے کا مطالبہ کرے۔ اگر وہ قائم رہتا ہے تو فبہا ورنہ پھر مسلمانوں پر واجب ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے امیر سے بیزاری اختیار کریں اور کسی دوسرے کی خلافت کی خواہش کریں۔ اسی طرح اگر (خلیفہ اپنے عہد پہ قائم ہے) اور ادھر رعیت کے کچھ افراد اطاعتِ امیر نہ کر کے عہد شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں تو خلیفہ کو یہ حق حاصل رہتا ہے کہ باغیوں کی سرکوبی کرے اور غیر مطیع لوگوں کو از سرِ نو مطیع کرے۔ اگر یہ لوگ اپنے کیے سے باز آ جاتے ہیں تو خیر ورنہ خلیفہ کو اسلام سے یہ حق مل جاتا ہے کہ ان اشخاص سے جنگ کرے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ احکام الٰہی کو (جن کا ایک خلیفہ راشد نافذ کرنے والا ہوتا ہے) تسلیم کر لیں اور خلیفہ کے از سرِ نو مطیع بن جائیں۔

خلافت راشدہ کے پیش نظر بیعت لے لینے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جو کچھ بھی ارشاد فرمایا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا:

"اگر میں کسی اچھے منصوبہ کو لے کر بڑھتا ہوں تو تم میرے ساتھ تعاون کرنا، میری اعانت کرنا، لیکن جوں ہی مجھ سے اسلام کی مصلحت کے خلاف کوئی فعل سرزد ہونے لگے مجھے فوراً ٹوک دینا۔"

اس کے بعد صدیق اعظم رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا تھا:-

"تم صرف اس وقت تک میرے احکامات ماننا جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کے پیش نظر اقدامات کرتا رہوں، اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول

کی منشا کے خلاف عمل کروں تو تم پر میری حکومت تسلیم کرنا اور میرے اقتدار کو ماننا ضروری نہیں، یعنی تم بے شک مجھے معزول تک کر سکتے ہو۔"

اسی طرح جب برسراقتدار خلیفہ راشد اپنے بعد کسی دوسرے شخص کی خلافت کے لئے سفارش اور وصیت کرتا ہے اور اس موقع پر مسلمانوں کے چیدہ چیدہ نمائندوں اور قائدوں سے مخاطب ہوتا ہے تو اس صورت میں بھی بیعت مکمل ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے مرض الموت میں حضرت عمرؓ کا نام خلافت کے لئے تجویز کیا، لیکن جب تک آپ نے رسول اللہ کے معزز رفقاء کی ایک جماعت سے اس باب میں مشورہ نہیں لے لیا آپ مطمئن نہیں ہوئے اس کے بعد آپ نے حضرت عثمانؓ کو یہ حکم دیا کہ آپ کا فرمان لے کے امت سے جا کے یہ پوچھیں کہ کیا وہ اس شخص کی بیعت پر جس کا نام فرمان میں درج ہے متفق ہوتے ہیں، اور جب لوگوں نے اثبات میں جواب دے دیا تو آپ کو اطمینان ہوا اور آپ نے پھر حضرت عمرؓ کو بلا کے نصائح فرمانا شروع کئے۔

لیکن اس کے باوجود مسلمان اس بات کے پابند نہ تھے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت تسلیم کر لیتے۔ نئے یا نامزد خلیفہ کے لئے لازم تھا کہ تجدید عہد کرتا اور از سر نو مسلمانوں کو یہ یقین دلاتا کہ وہ نہ صرف اپنے عہد پر قائم رہے گا اور اللہ اور رسولؐ کی فرمانبرداری کرے گا۔ بلکہ ان کی بھلائی اور بہبود کے لئے پوری پوری سعی بھی کرے گا۔ اسی طرح مسلمانوں پر بھی لازم قرار پایا تھا کہ وہ خلیفہ (راشد) کی اطاعت کریں اور اس کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کریں۔

جس وقت حضرت عمرؓ زخمی ہوئے تو آپ نے اصحاب پیغمبرؐ میں چھ افراد کی ایک کاؤنسل بنائی جسے امر کا اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے ہی میں سے ایک شخص کو خلیفہ چن لیں گے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوتا تھا کہ وہ شخص جو ان چھ میں سے چنا جائے گا وہ اس بات سے معاف ہوگا کہ براہ راست از سر نو اپنے اور امت کے درمیان (خلافت راشدہ کے اصولوں کے مطابق) معاہدہ نہ کرے۔

حضرت ابوبکرؓ کے حضرت عمرؓ کے استخلاف کا مطلب صرف یہ تھا کہ آپ نے ان کی امت سے محض سفارش کی تھی، ان کا نام پیش کیا تھا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کی مقرر کردہ مجلس شوریٰ نے جب اپنا فیصلہ حضرت عثمانؓ کے حق میں دیا تو یہ بھی عثمان رضی اللہ کے نام کی محض سفارش تھی۔

اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب تک ان دونوں بزرگوں نے براہ راست مسلمانوں سے بیعت نہیں لے لی تھی (خلافت راشدہ کے اصولوں پر) اس وقت تک بیعت مکمل نہیں ہوئی تھی۔

ثابت ہوا کہ بیعت خلافت کا بنیادی رکن ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام کے عہد اوّل میں مسلمان اس بات کو مکروہ جانتے تھے کہ اکاسرہ (جمع کسریٰ، لقب شاہنشاہ ایران) کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے مسلمان خلافت میں میراث کے قائل ہو جائیں۔ یعنی اسے باپ سے بیٹے میں منتقل ہونے کے قابل شے سمجھ بیٹھیں۔ میرے لئے ناگزیر سا ہو گیا تھا کہ جملہ معترضہ کو قدرے طویل ہو جانے دوں۔ در اصل مقصود، یہ بیان کرنا تھا کہ یہ جو حضرت عمرؓ سے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اچانک انجام پا گئی) یہ خلافت پر کوئی طعن نہیں ہے، نہ اسے طعن کا ذریعہ و وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ شروع میں سقیفہ بنی ساعدہ میں جو عمل انجام پا گیا تھا اس کے پابند تمام مسلمان نہیں ہو سکتے تھے اور خود حضرت ابوبکرؓ بھی یہ کبھی نہیں پسند کر سکتے تھے کہ جب تک اس پر (ان کی خلافت پر) عام مسلمان برضا و رغبت مجتمع نہ ہو جائیں انہیں اس کا پابند بنایا جائے۔

باب ۶

ابوبکرؓ کی قوت و عظمت کا سرچشمہ

آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں حضرت ابوبکرؓ کی حیثیت ایک عام مسلمان فرد کی تھی جس کے پیچھے کوئی خاص گروہ نہ تھا۔ عام صحابہؓ کی مانند حضرت ابوبکرؓ بھی رسول اللہ کے فرمانبردار اور اطاعت گزار تھے۔ آنحضرتؐ کی زندگی میں جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے، حضرت ابوبکرؓ کی دو خصلتیں خاص طور پر نمایاں ہوئیں۔ پہلی، آپ کی نبی کریمؐ سے محبت اور دوسری اپنی جان اور اپنے مال سے رسالت مآبؐ کی خاطر داری، دلداری اور پاسداری۔ اسی طرح امتِ مسلمہ کے تمام افراد کے لئے بھی صفت غم زدائی اور جان نثاری!

ابوبکرؓ سے آنحضرتؐ بھی سب سے زیادہ محبت کرتے تھے اور اتنی محبت وہ کسی دوسرے شخص سے نہ فرماتے تھے۔ یہی حال اُمت کا بھی تھا۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ آنحضرتؐ حضرت ابوبکرؓ کو ہر موقع پر دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں تو انہوں نے بھی یہی روش اختیار کرلی اور حضرت ابوبکرؓ سے بے پناہ محبت کرنے لگے۔ لیکن خلیفۃ الرسول ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے دفعتہً محسوس کیا کہ انھوں نے ایک عظیم ذمہ داری قبول کرلی ہے ایسی ذمہ داری جس سے وہ بغیر اللہ کی مدد و نصرت اور دستگیری کے عہدہ برآ نہ ہوسکتے تھے۔ اسی طرح ابوبکرؓ کو اخیار امت کے تعاون کی بھی زبردست حاجت تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس کا احساس تھا کہ آنحضرتؐ کے فوراً بعد منظر عام پر آنے کے لوازمات یہ ہوں گے کہ جمہور امت ان سے یہ مطالبہ کریں گے کہ وہ اسی راہ پر چلیں جو رسالت مآبؐ کی راہ تھی۔ شاید یہی سبب تھا کہ زمام امور سنبھالتے ہی وہ پہلی بات جو حضرت ابوبکرؓ نے کہی

وہ یہ تھی کہ وہ ایک عام فرد امت مسلمہ ہیں اور لازمی طور پر سب سے بہتر فرد نہیں ہیں۔ اسی لئے آپ نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ امور سلطنت میں آپ کی مدد کریں لیکن جہاں دیکھیں کہ آپ سے لغزش ہو رہی ہے، وہاں آپ کو ٹوک دیں۔ اور روک دیں حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر مسلمانوں کے سامنے اس بات کا عہد بھی کیا تھا کہ وہ ہر کام میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کریں گے۔ آپ نے مسلمانوں کو یہ اختیار بھی دے دیا تھا کہ اگر انہیں آپ ایسا کرتے نظر نہ آئیں تو وہ بے شک آپ کی اطاعت سے نکل جائیں! اسی موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں کو حکومت کی جانب سے یہ بھی قول دیا کہ آپ کمزوروں کے حقوق کو کسی حال میں پامال نہ ہونے دیں گے اور امت کے مقتدر لوگوں کو خواہ وہ کتنے ہی با اثر اور صاحب حیثیت کیوں نہ ہوں ظلم نہ کرنے دیں گے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے یہ کہا کہ وہ اصولاً آنحضرتؐ کے دور کی ہر بات کی تقلید کریں گے اور بر دست اجتہاد اور جدت سے گریز کریں گے یعنی نئے تجربات کی طرف زیادہ توجہ نہ کریں گے۔ بلکہ آنحضرتؐ ہی کے بنائے ہوئے خاکے میں رنگ بھریں گے۔ یہ بیانات دیتے ہوئے یہ اعلانات کرتے وقت اور اپنے دوران حکومت حضرت ابوبکرؓ نے ان باتوں کی مکمل معنویت محسوس کی تھی، اور اس باب میں آپ کے ذہن میں ہر چیز بالکل روشن اور واضح تھی۔ آپ ہر ممکن طور سے آنحضرتؐ کی تقلید فرماتے تھے اور اسی طرح جن جن چیزوں سے آنحضرتؐ نے اجتناب برتا تھا۔ ان سے آپ نے بھی تمام مصلحتوں کو ٹھکراتے ہوئے اجتناب کیا۔ چنانچہ عہد صدیقی کا پہلا کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے طے کر لیا کہ حالات کچھ ہی ہو جائیں۔ مصالح کا تقاضا کچھ بھی ہو۔ آنحضرتؐ کے شروع کئے ہوئے تمام منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

بیعت کے مکمل ہو جانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ وہ بالکل آنحضرتؐ کی ہدایات کے مطابق، ہو بہو مطابق، اسامہ بن زید کی سرکردگی میں جانے والے لشکر کو روانہ فرما دیں گے۔ چنانچہ لشکر اسامہؓ کے ہر فرد کو لشکر گاہ میں آنے کا حکم دیا گیا۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد حالات حد درجہ سنگین ہو چکے تھے۔ اس عظیم سانحہ (وفات نبی اعظمؐ) سے صرف مہاجرین اور انصار ہی ہراساں اور بدحواس نہ ہوئے تھے بلکہ پورا عرب بدحواسی کا شکار تھا لیکن مہاجرین و انصار کی بدحواسی عام بادیہ نشین عربوں کی بدحواسی سے قدرے مختلف

تھی مہاجرین اور انصار تو اس واقعہ کے جلد ہی بعد سنبھل گئے۔ بلکہ قلیل ترین مدت میں وہ اپنے ہوش و حواس واپس لانے میں کامیاب ہو گئے اور اس ہوش و خرد کی واگذاری کے سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کی تلقین اور قرآن سے آپ کے استشہاد نے بہت کام کیا۔ لیکن عام مسلمانوں کی مدہوشی حد درجہ خطرناک اور نتائج کے لحاظ سے دور رس ثابت ہوئی۔ مہاجروں اور انصار کے گروہ کے برخلاف بادیہ نشین عرب ابھی تک دل سے اسلام کی تعلیمات کے شیدائی نہ ہوئے تھے۔ زبانیں البتہ ان کی، توحید و رسالت کی معترف تھیں۔ کہیں پہلے اس صورت حال کی طرف اشارہ کرنے والی ایک آیت کا (سورۃ الحجرات کی آیت کا) حوالہ دیا گیا ہے۔

سورہ براۃ میں بھی ارشاد ہوتا ہے۔

"اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ۭ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ"

"دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ احکام الٰہی کو، جو رسولؐ پر نازل ہوئے ہیں، بجا لائیں۔ خدا میں تمام دانش اور تمام دانائی ہے اور بعض بادیہ نشین اللہ کی راہ میں صرف کی ہوئی رقوم کو ایک قسم کا تاوان سمجھتے ہیں اور انھیں اس بات کا انتظار ہے کہ مسلمانوں پر مصائب اور بلائیں نازل ہوں۔ یہ مصیبتیں خود ان بداندیشوں پر نازل ہوں گی اور اللہ ہر چیز سنتا اور جانتا ہے۔"

جیسا کہ آپ اگلے صفحات میں دیکھیں گے آنحضرتؐ کو اس صورت حال سے بذریعہ وحی مطلع کر ہی دیا گیا تھا اور آنحضرتؐ نے ان بادیہ نشینوں سے کوئی تعرض نہ کیا اور ان کی جانیں اور ان کے مال محفوظ رہنے دیئے۔ شاید اس لئے کہ یہ لوگ (باوجود قلبی انکار اور ذہنی ارتداد کے) اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے۔ دینی ارکان بجا لاتے تھے اور زکوٰۃ بھی ادا کرتے تھے۔ پھر آنحضرتؐ کس طرح ان کے خلاف کوئی اقدام فرماتے۔ ارتداد کی فتنہ سامانیاں آنحضرتؐ ہی کے عہد سے شروع ہو گئی تھیں یمن میں اسود العنسی یمامہ میں مسیلمہ، بنی اسد میں طلیحہ نے نبوت کے جھوٹے دعوے کئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب مدعیان نبوت کے پاس اپنے آدمی اور مراسلات

نیھبجے اور اس میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ اگر آنحضرت رفیق اعلیٰ سے نہ جا ملتے تو یقیناً ان جھوٹے دعویداران نبوت کے خلاف تلوار اٹھا لیتے ! جب ابوبکرؓ نے اقتدار سنبھالا تو آپ کے سامنے محض ان جھوٹے مدعیان نبوت ہی کا مسئلہ نہ تھا۔ آپ نے تو یہ دیکھا کہ پورے عرب نے منافقت اختیار کر لی ہے اور جیسے جیسے عام لوگوں کو آنحضرتؐ کے وصال کے متعلق علم ہوتا جاتا تھا وہ جاہلیت کی طرف عود کرتے جاتے تھے۔ لیکن اس بات کے باوجود ان لوگوں نے جاہلی روایات کے پیش نظر باقاعدہ مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا۔ بحث وتمحیص اور معاملہ فہمی شروع کر دی۔ چنانچہ ان لوگوں کے وفود نے حضرت ابوبکرؓ کے پاس آ کے مطالبہ کیا کہ وہ صرف زکوٰۃ کی ادائگی سے معافی چاہتے ہیں باقی نماز، روزہ اور حج کے معاملہ میں وہ اسلام کی روش پر رہیں گے اور ہر حال میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کہتے رہیں گے۔

ابھی میں نے کہا کہ ان لوگوں نے جہلاء اور غافل لوگوں کے انداز میں مسئلہ پر نظر ڈالی تھی یہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ ان کا مطالبہ قبول کر لیں گے۔ مطالبہ یہ تھا کہ اگر انہیں زکوٰۃ کی ادائگی سے معاف کر دیا جائے تو وہ اسلام کے بقیہ ارکان کو تسلیم کر لیں گے۔ شاید یہ لوگ بھول گئے تھے کہ زکوٰۃ اسلام کا ایک رکن ہے اور اسے دینے سے انکار کرنے والے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں رہ جاتا۔ یہی سبب تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں کی پیشکش کو یکسر ٹھکرا دیا اور ان سے جنگ کرنے کا اعلان فرما دیا۔ اور یہ کہا کہ اگر یہ لوگ آنحضرتؐ کے عہد میں زکوٰۃ کی شکل میں ایک اونٹ کی ادھی جیسی حقیر شے بھی ادا کرتے تھے تو وہ بھی بدستور ان سے وصول کی جائے گی۔

عربوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور کفر ونفاق کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے حق میں اللہ کا یہ قول کہ "ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود سے (جن کی تشریح بذریعہ وحی ہوئی تھی) واقفیت ہو اور وہ اللہ کی راہ کے مصارف کو تاوان سمجھتے ہیں اور مسلمان کے لیے مصائب کے انتظار میں بیٹھے ہیں" سچ کر دکھایا تھا۔

ادھر ان لوگوں نے یہ اعلان کیا، ادھر ابوبکرؓ نے اعلان جنگ کر دیا اور عین اسی وقت یہ بھی طے کر لیا کہ رسول اللہؐ کے حکم کے مطابق لشکر اسامہؓ کے حدود میں روانہ کر دیں

اب حضرت ابوبکرؓ اور مسلمانوں کے لئے ان کے سامنے آنے والے خطرات اور مشکلات میں سب سے بڑی مشکل پیش آئی۔ مصیبت یہ تھی کہ ایک طرف حضرت ابوبکرؓ نے طے کر رکھا تھا۔ کہ چونکہ رسالت مآبؐ اس کا حکم دے گئے تھے یا لشکر اسامہؓ ہر صورت بھیجا جائے گا۔
دوسری طرف تمام عرب کفر و انکار کی لپیٹ میں آ چکا تھا اور چونکہ لشکر اسامہ کے ساتھ تمام جری اور جرّار اور اہل عقل جا چکے تھے۔ اس لئے خود مدینہ کو اطراف کے بادیہ نشینوں کے حملوں سے خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔
امت کے زعمائے نے اس عظیم خطرہ کو محسوس کیا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے یہ بھی کہا کہ ناگزیر حالات کے پیش نظر وہ لشکر اسامہؓ کی روانگی کو مؤخر کر دیں۔ یہ لوگ اسے بعد میں روانہ کرنے کے خلاف یوں بھی تھے کہ خود مدینہ کو اطراف کے لوگوں سے خطرہ تھا مگر کیا ابوبکرؓ نے یہ مشورہ تسلیم کیا؟ ہرگز نہیں آپ نے شد و مد سے اپنے نظریہ کو قائم رکھا۔
حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک حالات کا تقاضا کچھ بھی ہو جاتا، واقعات کا مطالبہ کچھ بھی ہوتا آنحضرتؐ کے احکامات سے سرتابی نہیں کی جا سکتی تھی۔
صحابہ کا اصرار جاری رہا لیکن حضرت ابوبکرؓ کے عزم و ثبات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ نے کہا "بخدا اگر مجھے یہ خوف بھی ہوتا کہ مجھے جنگلی درندے اچک لے جائیں گے تو بھی اسامہؓ اور ان کے لشکر کے بھیجنے سے میں گریز نہ کرتا"
اس کے بعد انصار نے حضرت ابوبکرؓ سے ایک اور بات کا بھی مطالبہ کیا کہ کسی ایسے شخص کو قائد لشکر بنایا جائے جو کم از کم اسامہؓ سے سن میں تو زیادہ ہو۔ اس سلسلہ میں ان لوگوں نے حضرت عمرؓ کو اپنا وکیل بنا کے حضرت ابوبکرؓ کے پاس روانہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے انصار کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی کی اور ان کے خیالات کو بار بار دہرایا۔ اس پر خلیفۃ الرسولؐ نے کہا کہ ابن خطاب تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جسے آنحضرتؐ نے لشکر کی فرمان دہی بخشی تھی میں اسے معزول کروں!
اس جواب کے بعد حضرت عمرؓ حضرات انصار کے پاس لوٹ آئے۔ انصار قانع اور قائل ہو گئے اب اسامہ کے لئے اپنے لشکر کے ساتھ باہر نکلنے کا وقت آ گیا تھا۔ امیر لشکر

کے ساتھ ساتھ خود صدیق اکبرؓ بھی پا پیادہ روانہ ہو گئے۔ حضرت اسامہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا کہ کم از کم اگر وہ انھیں مشایعت کا یہ فخر بخش رہے ہیں تو انھیں پیادہ تو ہو جانے دیں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس بات کی اجازت نہ دی۔ اس کے بعد حضرت اسامہؓ کو اس امر کی ہدایت کی کہ آنحضرتؐ کے احکامات کا جوں توں نفاذ ہو۔ اسی طرح آپ نے انھیں اور اہلِ لشکر کو اس بات کی ہدایت فرمائی کہ وہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے باز رہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کو نہ چھیڑیں جو ہر چیز کو ترک کر کے معبود کی عبادت میں لگے ہیں۔ ایک بات اور، عام زندگی کو معطل اور برباد نہ کریں۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہؓ سے اجازت لے کے حضرت عمرؓ کو جنہیں اس لشکر کے ساتھ جانا تھا، مدینہ میں روک لیا تاکہ امورِ مملکت میں ان سے مدد لیتے رہیں۔ اسامہؓ نے اجازت دیدی۔ اور حضرت ابوبکرؓ مدینہ لوٹ آئے اور بادہ نشینوں کی متوقع غارتگری کے پیشِ نظر معاملات پر کڑی نگاہ رکھنی شروع کر دی۔ آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ مسجد نبوی میں مجتمع رہیں اور کسی بھی خطرہ کے مقابلہ کے لئے تیار رہیں۔ آپ نے مسلمانوں کو کسی لمحہ بھی کسی بڑے خطرہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے چوکس رہنے کی ہدایت فرمائی۔ اس اقدام کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ کے ان تمام ناکوں پر جن سے ہو کے صحرا کے راستے جاتے تھے اور جن سے داخل ہو کر اطراف کے دیہاتی یلغار کر سکتے تھے بڑے درجہ کے اصحاب رسولؐ کو متعین کر دیا۔ انہیں میں حضرت علیؓ بھی تھے اور اس سے بھی یہ بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ نہ حضرت علیؓ نے بیعتِ ابوبکرؓ سے انکار کیا تھا اور نہ امت کی جماعت سے الگ اپنی کوئی راہ بنائی تھی۔ ان تمام لوگوں کا کام یہ تھا کہ وہ ناظروں کی طرح شہر کی حفاظت کریں اور جوں ہی بادیہ نشین کوئی یورش کرنا چاہیں خلیفۃ الرسولؐ کو اطلاع دیدی جائے۔

اہلِ غطفان اور ان کے ہمدرد جان چکے تھے کہ مدینہ سے اسامہ کا چیدہ لشکر روانہ ہو چکا ہے اور یہ لشکرِ اسلام شام کی جانب گامزن ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کی نیت خراب ہونی شروع ہوئی کہ مدینہ پر یلغار ہونی چاہیئے۔ ان لوگوں نے سوچا۔ لیکن یہ غارت گری پر آمادہ لوگ اس کام کو اس طرح انجام دینا چاہتے تھے کہ انھیں کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ ایک رات یہ لوگ مسلمانوں پر شب خون کے ارادے سے آرہے۔ ابوبکری ناظروں نے ان کی آمد محسوس کر لی

اور ایک شخص کے ذریعہ حضرت ابوبکرؓ سے کہلا بھیجا۔ اس کے بعد خلیفۃ الرسولؐ اپنے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ دشمن سے مقابلہ کے لیے خود نکل آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کو شکست ہوئی۔ اب اہل مدینہ نے یہ چاہا کہ ان غارتگروں پر مزید یورش کریں لیکن ان لوگوں نے پہلے ہی اپنی پشت پر ایک حفاظت اور ایک روک کھڑی کر دی تھی مسلمان جب اس روک کے قریب (جو غالباً مختلف ذرائع سے بنائی گئی تھی) پہنچے تو انہوں نے اپنے اونٹوں کے بدک جانے کے خوف سے جنگ نہ کی چنانچہ انھوں نے اپنے اونٹوں کو پاؤں سے مارنا شروع کر دیا اور مدینہ میں آکے دم لیا۔

اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں حضرت ابوبکرؓ مسلمان پیادوں کے ساتھ غارتگر دشمن سے نمٹنے کے لیے پھر نکلے اور ساب کے ان کو باضابطہ شکست دے دی۔ اب دشمن موت اور قید کے خوف سے زمین عرب پر منتشر ہو چکا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان شورہ پشتوں اور غارت گروں کی زمینوں میں جا کے ان پر مسلمانوں کے گھوڑے اور اونٹ پھیلا دیئے تاکہ انھیں دوبارہ پچھلے عزائم کے اظہار کی جرأت نہ ہو۔

اس فتح کا مسلمانوں پر زبردست نفسیاتی اثر پڑا۔ ان میں قوت کا احساس ازسرِ نو پیدا ہو گیا اور وہ مدینہ پر مزید غارتگری کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ اب انھیں اُسامہ کے لشکر کا انتظار تھا جبکہ اُسامہ کا لشکر بھی اطراف شام میں تہلکہ مچا کے، غنائم کے ساتھ مدینہ واپس آچکا تھا۔

یہ لشکر دو ماہ چند دن کے بعد لوٹا تھا۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ نے اسے کچھ دن آرام کرنے اور سستانے کی اجازت دیدی۔ لیکن اس عالم استراحت میں بھی اس لشکر کے سپرد یہ کام تھا کہ جب تک مسلمان مجتمع نہ ہو جائیں وہ مدینہ کا دفاع کرتا رہے۔ اس فتح کے اثر سے مرتد قبائل نے اپنے اپنے یہاں کے مسلمانوں کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ابوبکرؓ میں جذبۂ انتقام اور مسلمانوں کے خون ناحق کا عوض لینے کا داعیہ بیدار ہوا۔ اب آپ نے یہ طے کر لیا تھا کہ ان شورہ پشتوں کا قلع قمع کر دیں گے اور انھیں ایسا سبق پڑھائیں گے کہ انھیں مدینہ کی طرف آنکھ اٹھانے کی دوبارہ جسارت تک نہ ہوگی۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ قسم بھی کھائی تھی کہ مسلمانوں کے خون کا بدلہ لے کے رہیں گے اور اس معاملہ کو کسی حال نہ چھوڑیں گے۔ اب ان تمام عرب کے مرتدوں سے جنگ کی تیاری شروع ہو گئی۔ مدینہ سے چوبیس میل کے فاصلہ

پر ذوالقصہ کے مقام پر، جہاں مدینہ پر یورش کرنے والے بدنہادوں کو شکست دی گئی تھی نکل کر، حضرت ابوبکرؓ نے مختلف لشکر ترتیب دیئے اور پھر ولایتیں اور امارتیں (فوجی) تقسیم کیں اور مندرجہ ذیل گیارہ قائدین لشکر میں سے ہر ایک کے سپرد، ایک ایک گروہِ مرتدان کی سرکوبی کی مہم ہو گئی۔

۱۔ خالد بن ولید کو حکم ہوا کہ پہلے وہ طلیحہ اور اس کے ساتھیوں سے لڑیں اور اس سے فارغ ہونے کے بعد بنی تمیم کے مالک بن نویرہ کی طرف متوجہ ہوں۔

۲۔ عکرمہ بن ابی جہل کو حکم ہوا کہ وہ مسیلمہ سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہو جائیں۔

۳۔ مہاجر بن ابی امیہ کو حکم ہوا کہ وہ اسود العنسی کے، جو اب قتل ہو چکا تھا، ان پیروؤں سے جنگ کریں جو اب تک باقی رہ گئے تھے اور اس سے فارغ ہونے کے بعد قبیلہ کندہ کے مرتدین سے لڑیں۔

۴۔ خالد بن سعید بن العاص کو شام کے حدود پر روانہ کیا گیا۔

۵۔ عمرو بن العاص کو قضاعہ سے جنگ کرنے کا حکم ملا۔

۶۔ حذیفہ بن محصن کو حکم ہوا کہ وہ اہل دَبا سے جنگ کریں یہ دَبا عمان کا قدیم پائے تخت تھا۔

۷۔ عرفجہ بن ہرثمہ کو مہرہ سے جنگ کا حکم ہوا۔

۸۔ شرجیل بن حسنہ کو عکرمہ بن ابی جہل کے مددگار کی حیثیت سے بھیجا گیا کہ مسیلمہ سے جنگ کرنے میں ان کی مدد و اعانت ہو۔ انھیں یہ حکم تھا کہ جب وہ اس کام سے فارغ ہو جائیں تو قضاعہ کی مہم میں عمرو بن العاص کی مدد کریں۔

۹۔ طریف بن حاجز کو سُلیم اور ان کے حلیف اہل ہوازن سے لڑنے کا حکم ہوا۔

۱۰۔ سُوید بن مقرن کو حکم ہوا کہ تہامہ یمن کے قبائل میں مرتدوں سے جنگ کریں۔

۱۱۔ العلاء بن الحضرمی کو حکم دیا گیا کہ وہ بحرین میں جنگ کریں۔

ان سب قائدین فوج کی نامزدگی، ان کے لیے مختلف قبائل میں کارگذاری کے لیے احکامات کا صدور، قبائل کی حیثیتیں، یہ سب باتیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ عرب تمام

کا تمام از سر نو کفر میں مبتلا ہو چکا تھا اور محض چند لوگ اپنے دین پر قائم رہ سکے تھے۔ ان مسلمانوں میں وہ لوگ بھی تھے جنہیں آنحضرتؐ کے دور میں اسلام کی تعلیمات پھیلانے، نظام نو سمجھانے اور معاشی بدحالی اور عدم توازن کو ختم کرنے کے لئے جس کا ذریعہ اغنیاء اور امرائسے زکوٰۃ وصول کر کے فقراء میں تقسیم کرنا تھا روانہ کیا گیا تھا۔

راویوں کے کہنے کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے اپنے قائدین لشکر کے نام ایک فرمان بھیجا تھا مجھے اس کے متن پر اعتماد نہیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے یہ حکم ضرور دیا تھا کہ ہر قائد لشکر اپنے اپنے لئے متعین قبیلہ کی جانب جنگ کے لئے چل پڑے لیکن جاتے ہی جنگ نہیں کرنے لگے۔ بلکہ پہلے اہلِ قبیلہ کو دعوت دے کہ وہ اس عظیم نظام فکر کو جسے اسلام کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس سے وہ نکل گئے تھے دوبارہ قبول کریں۔ بصورت قبول، قائد کا یہ کام تھا کہ حکومت کی جانب سے اہلِ قبیلہ کو تمام مراعات بخش دے اور ساتھ ہی ان سے غیر ادا شدہ زکوٰۃ اور دوسرے محاصل بھی لے لے۔ لیکن انکار کی صورت میں قائد پر فرض تھا کہ وہ ادنےٰ سی رعایت کئے بغیر پورے تشدد سے قبیلہ سے جنگ کرے اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھے جب تک قبیلہ اپنے کو اسلام کے سپرد نہ کر دے۔ اس کے بعد، بلاشبہ حکومت کے اس نمائندہ کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ قبیلہ کو اس کے جائز حقوق ادا کر دے۔

حضرت ابوبکرؓ نے قائدین فوج کو حکم دیا تھا کہ قبیلہ میں پہنچنے کے بعد ان کا پہلا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ قریب ترین نماز کا انتظار کریں (مثلاً اگر صبح طلوع آفتاب کے بعد پہنچے ہیں تو ظہر کا انتظار کریں) پھر اذان کہلوائیں۔ اب اگر اذان پر مقابل لوگ لبیک کہیں یعنی اس پکار کے جواب میں کہ (حی علی الصلوٰۃ) وہ نماز کے لئے آ جائیں تو ان سے ابھی نہیں لڑنا چاہیئے بلکہ ان سے اسلام کے بارے میں سوالات کرنے چاہئیں (کہ آیا ان کے ذہن میں اس نظامِ نو کا تصور واضح بھی ہے یا نہیں) اب اگر وہ اسلام کو ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کے ذریعہ اسے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا تو ان لوگوں سے مسلمانوں کا سا برتاؤ کیا جانا ضروری ہے لیکن اگر یہ لوگ انکار و جحود پر ہی قائم رہیں

تو ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جانی چاہیئے تھی جب تک وہ دین کی طرف رجوع نہ کرلیں۔

بعض راوی یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے فرمان کی گیارہ نقلیں کروائیں اور ایک ایک نقل فرمان کے ساتھ ہر لشکر کے ساتھ اپنا نمائندہ خصوصی کر دیا اور ان نمائندوں کو حکم تھا کہ وہ ان فرامین کو قبائل کے روبرو پڑھیں اگر قبائل فرمان کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو انھیں جان کی امان بخشی کی جائے ورنہ انھیں اسلام کی طرف دوبارہ لانے کے لیئے جنگ کی جائے۔

مورخوں نے اس فرمان کا متن ضبط تحریر کیا ہے لیکن ہم کو اس متن کے انہیں الفاظ پر مشتمل ہونے پر اعتماد نہیں۔ اگر ایسا ہوا ہو گا تو اس فرمان کا متن اس فرمان کے متن کے مطابق رہا ہو گا جو حضرت ابوبکرؓ نے قائدین لشکر کے لئے صادر فرمایا تھا۔

قائدین اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہاں مجھے اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ ان قائدین کی لشکر آرائیوں اور ان کی فتح و نصرت کی داستان بیان کروں یا اس قسم کی زبانی کی تفصیلات میں الجھ جاؤں جو مثلاً عکرمہ بن ابی جہل کو پیش آئی تھیں۔ اصل مقصود یہ ہے کہ یہاں خالدؓ بن ولید کے موقف کے بارے میں ضرور قدرے تفصیل میں جاؤں۔ یہ اس لئے کہ اس موقف خاص کا مسلمانوں پر خاص اثر پڑا اور اس سے شیخینؓ کے طرز فکر کے قدرے ایک دوسرے سے مختلف ہونے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

سردست میں مدینہ کی طرف پھر پلٹ رہا ہوں۔ اور ارتداد کے مسئلہ پر تھوڑی سی روشنی ڈالوں گا۔ راویوں نے بھی اس باب میں کافی رائے زنی کی ہے۔

اس سے پہلے میں بیان کر چکا ہوں کہ مسلمان زعماء نے حضرت ابوبکرؓ کو رائے دی تھی کہ اُسامہ کے لشکر کو سردست بھیجنا ملتوی کر دیں۔ میں نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس بات کو نہیں مانا تھا اور بہر حال یہ چاہا تھا کہ آنحضرتؐ منویات اور ارادے پایہ تکمیل کو پہنچیں۔

راویان اخبار اس بات کے بھی مدعی ہیں کہ گویا بعض زعماء نے حضرت ابوبکرؓ کو مرتد لوگوں سے جنگ کرنے سے بھی باز رکھنے کی سعی کی تھی۔ ان روایات کی رُو سے حضرت عمرؓ نے حضرت

ابوبکرؓ سے پوچھا تھا کہ جب یہ لوگ اللہ کی وحدانیت اور اس کے معبود ہونے کے قائل ہیں اور آنحضرتؐ نے صرف اس وقت تک لوگوں سے جنگ کو جائز قرار دیا تھا جب تک وہ لاالٰہ الا اللہ نہ کہہ لیں اور یہ کہنے کے بعد کہنے والوں کا خون بہانا نا جائز ہو جاتا ہے، تو پھر خلیفۃ الرسول کیسے اور کس بنیاد پر ان جنگوں کا آغاز کر رہے ہیں۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے جواب رد دیتے ہوئے کہا تھا۔ میں تو اس وقت بھی جنگ سے باز نہ آؤں گا جب تک یہ مرتد لوگ ایک عقال (اونٹ کی اچھی) تک، جسے یہ آنحضرتؐ کے عہد میں دیتے آئے ہیں، دینے سے گریز کریں گے اس لیے کہ ایسا کر کے یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق پیدا کرتے ہیں۔ درانحالیکہ یہ غیر اسلامی بات ہے کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، بعض راوی یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی طرح حضرت عمرؓ کی سمجھ میں بھی اس جنگ کی مصلحت آ گئی تھی۔

لیکن میں اس واقعہ کو اس شکل میں تسلیم کر لینے کے لیے تیار نہیں۔ اس دور کے زعمائے امت یقیناً دین کے رموز اس حد تک سمجھتے تھے کہ ان کے لئے ہرگز ضروری نہ تھا کہ وہ زکوٰۃ جیسے مسئلہ کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ سے بحث مباحثہ کریں۔ جہاں تک حضرت عمرؓ کا تعلق ہے وہ اسلام کے مسائل کے درک میں کسی سے کم نہ تھے کم از کم حضرت عمرؓ کی اسلام کے لئے سخت گیری ہمیں یہی بتاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ جو فقہا اور متکلمین نے بعد میں روایتیں گھڑھ لی ہیں۔ یہ یکسر بے بنیاد ہیں۔ اس لئے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ میں کبھی بھی اس قسم کے اختلافاتِ نظر و فکر نہ ہوئے تھے۔

جتنی سی بات قابلِ قبول نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ زعمائے امت نے عرب کے کفر و نفاق کے نرغہ میں آ جانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو اسامہؓ کے لشکر کی روانگی میں تاخیر کا ضرور مشورہ دیا تھا۔ اس مشورہ میں بھی مصلحت یہ تھی کہ مسلمانوں کی ساری قوت فتنہ ارتداد کے سدِ باب میں صرف نہ ہو۔ بلکہ آنحضرتؐ کی تقلید میں اس قوت کے ذریعہ عربوں کے اسلام کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کا مداوا کیا جائے۔

تو گویا ان روایات کے راوی ان بزرگانِ امتِ مرحومہ سے متعلق، ایسی روایات تالیف کر کے ان سے کچھ سلوک نہیں کرتے۔ ان روایات کی رو سے تو ان بزرگوں کی جنہوں نے

بڑی کٹھن آزمائشوں کے دور میں آنحضرتؐ کا مکہ میں ساتھ دیا تھا، کچھ اس قسم کی تصویر بنتی ہے کہ گویا یہ لوگ عربوں سے سخت خائف تھے اور انھیں یہ ڈر تھا کہ کہیں آس پاس کے عرب انھیں ہڑپ نہ کر جائیں۔ آخر یہ وہی لوگ تو تھے جنہوں نے اپنے سردارؐ کا عزم راسخ دیکھا تھا اور اسے، ابوطالب کو یہ جواب دیتے سُنا تھا کہ اگر یہ قریش جو مجھے میرے مشن سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، میرے ہاتھوں میں شمس و قمر بھی تھما دیں گے یا اس سلسلہ میں مجھے بھی ہلاک کر دیں گے تو بھی جب تک اسلام غالب نہ ہو جائے گا میں اپنا کام برابر کئے جاؤں گا۔

یہ وہی بلاکشان اسلام تھے جنہوں نے نبی اکرمؐ کے ساتھ بدر اور احد اور احزاب کے سخت اور زہرہ گداز معرکے سر کئے تھے۔ اور یہ سب اس دور میں جب مسلمان کسی گنتی کسی شمار میں نہ تھے۔ اور ہر طرف کفر سے گھرے ہوئے تھے، پھر کیا اس وقت ان جری اور دلاور رفقائے محمدؐ کے عزم کی تلوار کند ہوئی تھی، یا ان کی ہمت ذرا پست ہوئی تھی یا ان کے ثبات و استقلال میں کوئی کمی آئی تھی؟ ہرگز نہیں۔

کیا دفعتہً عزم و ثبات کے یہ درس بھلا دیئے گئے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے فوراً ہی بعد یہ مےگساران بادہ محبت اعرابیوں سے جنگ کے خیال سے لرزہ براندام ہونے لگ جاتے۔

آپ نے حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ کا موقف دیکھا ہی تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس صلح کی شرائط کو قبول کرنے سے آنحضرتؐ کو باز رکھنا چاہا تھا۔ آپ نے اس وقت سردارِ جہاںؐ اور صدیق اکبرؓ سے یہ تک کہا تھا کہ آخر ہم دینی معاملات میں ذرا سی بھی رعایت کیوں برتیں؟ تو اب عقلی اور منطقی طور پر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت عمرؓ دفعتہً اپنے تمام پچھلے طرز ہائے عمل آنِ واحد میں بھول کیوں جاتے ہیں اور ابوبکرؓ کے ساتھ عربوں سے پیکار آزما ہونے سے ڈرنے کیوں لگتے ہیں تمام اصحاب نبیؐ اس بات سے واقف تھے کہ قرآن میں متعدد بار زکوٰۃ کا ذکر صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ آیا ہے۔ جہاں کہیں صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ زکوٰۃ کا ضرور ہے۔ آنحضرت کا یہ قول بھی سب کے سامنے تھا کہ اسلام کی اساس کے طور پہ پانچ چیزیں کام کرتی ہیں۔

۱۔ اللہ کی وحدانیت اور معبودیت کی گواہی۔
۲۔ رسالت مآب کی رسالت عظمیٰ کی شہادت۔

۳۔ نماز کی ادائیگی

۴۔ زکوٰۃ کی ادائیگی، اور

۵۔ رمضان کے روزے

پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا، کہ تھوڑے ہی دنوں بعد، یہ لوگ عربوں کے لاالٰہ الا اللہ کہنے پر اکتفا کرے جائیں اور انہیں اس امر کی اجازت دیدیں کہ وہ ایک اہم رکن اسلام کی فرضیت کے بارے میں خلیفۃ الرسولؐ سے بحث کرنے لگیں۔ یا اس حدیث کے بعض حصوں پر یقین کر لیں جس کی بُنیاد پر حضرت ابوبکرؓ سے، روایات کی رو سے، مقاتلہ کے باب میں مباحثہ ہوا تھا، اور بعض حصوں کو ترک دیں اور مجبوراً حضرت ابوبکرؓ کو انہیں اس سلسلہ میں یاد دلانا پڑے۔

راوی یہ بھی کہتے ہیں کہ دمشق کی فتح کے بعد چند مسلمانوں نے شراب پی اور جس وقت حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو اس سلسلہ میں لکھ بھیجا تو حضرت عمرؓ نے لکھا، ان لوگوں سے سب کے سامنے شراب کے بارے میں پوچھو۔ اگر یہ اسے جائز بتائیں تو ان کی گردنیں مار دی جائیں لیکن اگر یہ اسے حرام بتائیں تو ان پر صرف حد جاری کی جائے؟ تو گویا حضرت عمرؓ، حضرت ابوعبیدہؓ سے فرماتے ہیں کہ متہم لوگوں سے شراب کی حرمت اور حلت کے بارے میں سوال کیا جائے۔ اگر یہ اسے حلال قرار دیں تو ان کی گردنیں اڑا دی جائیں کیونکہ ایسا کر کے وہ قرآن کے ایک صریح حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہوں گے اور اگر اسے حرام قرار دیں تو بھی ان پر حد شرعی ضرور جاری کی جائے کیونکہ ان لوگوں نے ایسا کر کے ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا۔ اب اس عمرؓ کے لئے جو شراب پینے اور اسے جائز قرار دینے کے جرم میں مجاہد مسلمانوں کی گردنیں کٹوا سکتا ہے، ہرگز ممکن نہ تھا کہ منکرین اور مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے سلسلہ میں وہ خلیفۃ الرسولؐ کو ٹوکتا۔ آخر زکوٰۃ تو اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔

راوی کچھ بھی کہا کریں، واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ بھی ثابت قدم رہے اور آپ کے ساتھ مہاجرین و انصار بھی، اور ان کے پیرو بھی، ان سب کا مقصد یہ تھا کہ عرب کو شکست و ریخت سے بچا لیں۔ اور بہت تھوڑی مدت میں اللہ تعالٰے نے ان بزرگوں کو کامیابی عنایت فرمائی، جیسے آنحضرتؐ کے زمانہ میں فرمائی تھی۔ چنانچہ عرب پھر سے اسلام میں داخل ہو گئے، اور زکوٰۃ بھی دینے لگے۔ ادھر طلیحہ کے ساتھ

بھی ہار گئے۔ پھر خود طلیحہ بھی بھاگا اور بعد میں مسلمان ہو گیا اور اس نے از سرِ نو اسلام لانے کے بعد ایران کی مہم میں اعلیٰ لیاقت کا ثبوت دیا۔ اسی طرح مسیلمہ کے ساتھی بھی شکست پا گئے اور مختلف مراحل کے بعد اسلام میں داخل ہو گیا۔

یہ سب کچھ ابوبکری دور میں انجام پا گیا۔ اگرچہ یہ دور بے حد مختصر تھا۔ اس سے اگر کچھ ظاہر ہوتا ہے تو یہ کہ اس شدید آزمائش میں حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ساتھی ثابت قدم رہے۔ آخر یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اللہ کے ساتھ اپنے پیمان کو بنھایا تھا اور ان کے قلب نظر اور دل و جگر سب اسلام و اخلاص میں ڈوب چکے تھے۔ سورہ آل عمران کی فیل کی آیت میں جو وعدے مذکور ہیں انھیں ان عاشقان پاک طینت نے سچ کر دکھایا تھا۔

(وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ) یعنی کشتگانِ راہِ الٰہی کو عام مُردوں کی طرح سمجھنا غلطی ہے، یہ لوگ اللہ کے نزدیک زندہ ہیں (یعنی زندہ جاوید ہیں) اور ان کو رزق مل رہا ہے۔ یہ لوگ بعد میں شہید ہو کے ان کے گروہ میں شامل ہونے والوں کے بارے میں خوشیاں منا رہے ہیں کہ قیامت کے دن ان کو بھی نہ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

چنانچہ ان شہیدانِ راہِ وفا نے دل کھول کر خدا کے کام میں اعانت کی اور اللہ نے بھی ان کی قربانیوں کو قبول کرتے ہوئے ان کے حق میں اپنے وعدے پورے کر دیئے، اور جیسا کہ سورہ محمد میں ارشاد ہوا ہے، اللہ نے ان کو اپنی مدد سے نوازا۔

(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ)

اگر اہلِ ایمان لقیقین صاحبان عزم اللہ کے کام میں مدد دیں گے تو اللہ بھی اپنی اعانت سے نوازے گا اور ان میں ثبات قدمی پیدا کر دے گا۔

جو لوگ فتنہ ارتداد کے سلسلہ کی جنگوں کی تفصیلات اور اس باب میں نیکوکار مسلمانوں کی آزمائشوں کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔ انہیں یقیناً ان بہادروں کے کارناموں پر جو دین کی نصرت اور اس کی سربلندی کی راہ میں کسی چیز سے بھی نہ جھجکے، اور عرب کرتی اعظم کی وفات

پر کفر کی جانب پلٹ گیا تھا۔ اسلام کی طرف کشاں کشاں لے آئے، استعجاب ہوگا۔ اور ان کے دل میں قلعہ ارانی تموج ریزہ ہوجائے گی۔ یقیناً ان میں بے شمار حضرات نے خصوصاً مسیلمہ کے مقابلہ میں جو جنگ لڑی گئی اس میں، شہادت پائی تھی مسیلمہ کے ہمنوا خواہ بنو حنیفہ نے مسلمانوں کے مقابلہ میں ثبات قدمی دکھائی تھی اور ان کے قائد عکرمہ بن ابی جہل کو جنہوں نے پیش قدمی میں مدد کا انتظار کئے بغیر عجلت کی تھی شکست دیدی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عکرمہ کو اس واقعہ پر سخت تنبیہہ کی تھی۔ بعد میں یرموک کی جنگ میں انہیں عکرمہ نے، اسلام کا نام بلند کرکے، اپنے دامن سے یہ داغ مٹا دیا تھا۔ اب حضرت ابوبکرؓ نے مسیلمہ کے مقابلہ کے لئے حضرت خالدؓ کو روانہ کیا۔ پھر بھی بنو حنیفہ نے مسیلمہ کا اس حد تک ساتھ دیا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑسے گئے تھے۔ خوش قسمتی سے اس مہم میں رسول اللہ کے بعض بلند رتبہ اور چیدہ صحابی موجود تھے جو ایک طرف بھاگنے والوں کو ڈانٹتے تھے عار دلاتے تھے اور دوسری طرف رسول اللہؐ کی قیادت میں لڑی ہوئی جنگوں کا تذکرہ کرتے جاتے تھے۔ اسی طرزِ عمل کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں از سرِ نو ثبات و عزم پیدا ہوا اور انہوں نے مسیلمہ کو مار کے دم لیا۔ اب بنو حنیفہ کے قلعے مسلمانوں کے زیرنگیں تھے اور وہ باوجود نارضامندی کے اللہ کے اقتدار کے تحت آ چکے تھے یعنی لائے جا چکے تھے حضرت ابوبکرؓ نے عزم و ثبات قلبی ضبط نفس، اللہ پر مطلق اعتماد اور رسولؐ سے انتہائی عمیق وفاداری دکھا کے یہ ثابت کردیا کہ وہ مسلمانوں کے سب سے بہتر پیشوا اور امام تھے۔

اور پھر ان سب صفات عالیہ کا اظہار کس سکون سے کیا گیا، جیسے آپ کسی مصیبت، کسی آزمائش میں مبتلا ہی نہ ہوئے ہوں۔ جیسے عربوں نے آپ کے تصرف سے نکل جانے کی کوشش ہی نہ کی ہو۔ اس دور میں حضرت ابوبکرؓ کی دو صفتیں بہت زیادہ نمایاں ہوئیں۔

پہلی صفت تو آپ کے کامل اطمینان سے متعلق تھی، اللہ کے وعدوں کے بارے میں جس میں آپ کو ادنیٰ سا شک نہ تھا۔

دوسری صفت آپ کے اس عزم سے عبارت تھی کہ جب تک حالات پر، خواہ وہ کتنے ہی سنگین پر پیچ اور ناگوار کیوں نہ ہوں، قابو نہ پالیا جائے، کوشش جاری رکھی جائے۔ یہاں تک کہ منشائے الٰہی پورا ہو جائے۔

باب

کشمکش

حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں ایک اور سخت مرحلہ آتا ہے جو ہر چند فتنۂ ارتداد سے زیادہ سنگین نہ سہی، لیکن اس نفسیاتی الجھن کے پس منظر میں جو وہ اپنے جلو میں لے آیا تھا، کم سخت اور دشوار نہ تھا۔ شاید اس مسئلہ نے حضرت ابوبکرؓ کو فتنۂ ارتداد سے بھی زیادہ قلبی اذیت دی تھی شاید اس مسئلے کے حل میں آپ نے اپنی راتیں جاگ کے کاٹی تھیں۔ کسے خبر! یہ مسئلہ تھا یہ کہ خلیفۃ الرسولؐ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے بارے میں (جو آنحضرتؐ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں (حضرت فاطمہؓ کی دوسری حقیقی بڑی بہنوں کے اسمائے گرامی علی الترتیب حضرت زینب علیہا السلام، حضرت رقیہ علیہا السلام اور حضرت ام کلثوم علیہا السلام تھے) کیا روش اختیار فرمائیں۔ ہوا یہ تھا کہ حضرت فاطمہؓ نے خلیفۃ الرسولؐ کے سامنے اپنے والد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے ترکہ میں اپنا حصہ حاصل کرنے کی درخواست پیش کی تھی۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کے سامنے آنحضرتؐ کا یہ قول تھا کہ "ہم پیغمبرانِ خداؑ جو بھی چھوڑ جاتے ہیں اس کی حیثیت صدقہ کی ہوتی ہے اور عام لوگوں کے ترکہ کی طرح اسے ورثہ میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔"

اب ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس بات کو ترجیح دینی چاہی کہ آنحضرتؐ کا ارشاد مبارک نافذ ہو اور آپ کی (دوسرے تمام انسانوں کے مقابلہ میں) شان امتیاز یہاں بھی قائم رہے۔ اس مسئلہ کی سنگینی اور اس کا اشکال اس میں مضمر تھے حضرت ابوبکرؓ نے جس دن سے اسلام قبول کیا تھا اس دن سے وہ اس بات کے عادی سے ہو گئے تھے کہ ہر موقع پر آنحضرتؐ کی رضا کو اپنی جان عزیز تک پر ترجیح دیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے تمام لوگوں میں علی الاطلاق اپنے میں یہ خو پیدا کر لی تھی کہ

آنحضرتؐ کے لئے آپ کے اہلِ خاندان کے لئے اور آپ کے اعزا کے لئے سب سے زیادہ حسنِ سلوک برتیں۔ آپ سے بڑھ کر کسی میں رضائے رسولؐ کے حصول کا جذبہ شدید نہ تھا اور شاید اس سے بڑھ کر آپ کے لئے ناخوشگوار اور مبغوض کوئی بات نہ ہو سکتی تھی کہ آپ کی ذات سے آپ کے مرشد کامل کے قرابت داروں کو دکھ پائیں۔ چنانچہ جب حضرت فاطمہؓ نے حضرت سے اس کا مطالبہ کیا کہ آپ انہیں میراث پدری سے ان کا حق دے دیں تو اس وقت خلیفۃ الرسولؐ ایک زبردست الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ وہ کشمکش یہ تھی۔ اگر حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کا مطالبہ پورا کیا جاتا ہے تو رسول اللہ کے ایک صریح حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور (حضرت ابوبکرؓ کے لئے رسول اللہ کی نافرمانی کے مقابلے موت کہیں زیادہ سہل تھی) اور اگر حضرت فاطمہؓ کی بات نہیں مانی جاتی تو ان کو اذیت ہوتی ہے۔ ابوبکری مزاج کے لحاظ سے جو چیز آپ کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہو سکتی تھی وہ یہی تھی کہ حضرت فاطمہؓ کو آپ سے رنجش ہو۔ حضرت فاطمہؓ ایک ایسی شخصیت سے دختری نسبت رکھتی تھیں جس سے زیادہ محبوب شخصیت حضرت ابوبکرؓ کے لئے کوئی ہو بھی نہ سکتی تھی اور جس کی خاطر حضرت ابوبکرؓ اپنا سب کچھ تج دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اس کشمکش کا نتیجہ کیا ہوا۔ آنحضرتؐ کی اطاعت کا جذبہ ہر دوسرے جذبہ پر غالب آیا اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت فاطمہؓ کا مطالبہ قبول کرنے سے معذرت چاہی لیکن ایسا کرنے میں حضرت ابوبکرؓ پر رقت تک طاری ہوئی کیونکہ حضرت فاطمہؓ آنحضرتؐ کی بیٹی تھیں اور حضرت ابوبکرؓ جس طرح اپنی جان بھی آنحضرتؐ پر فدا کرتے تھے، آپ کے قرابت داروں پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ گوارا کیا کہ حضرت فاطمہؓ کو تھوڑی سی رنجش ہو لیکن اللہ اور اس کے رسولِ برحق کے احکامات ضرور نافذ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان چھ مہینوں تک جن میں آنحضرتؐ کے بعد، حضرت فاطمہؓ بقید حیات رہیں اس مسئلہ نے حضرت ابوبکرؓ کو کبیدہ خاطر رکھا اور آپ اس رنج گراں نشین سے کڑھتے ہی رہے۔

ہوا یہ تھا کہ حضرت فاطمہؓ، ترکہ نہ پانے کے بعد خلیفۃ الرسول سے آزردہ سی ہو گئیں تھیں اور حسب اتفاق کہ تھوڑے سے ہی عرصہ کے بعد خدا اور اپنے مقدس والد سے ملحق ہو گئیں تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے لئے اس سے زیادہ کٹھن کوئی آزمائش نہ تھی کہ آپ کے ایک اسلامی اصول اور حکم رسولؐ کے نافذ کرنے کے سلسلہ میں دختر پیغمبرؐ آپ سے آزردہ خاطر ہو جائیں۔ حضرت

ابوبکرؓ پر یہ بات بھی سخت گراں گذری تھی کہ آپ حضرت فاطمہؓ کے جنازہ میں جنہیں رات کے وقت دفن کیا گیا تھا۔ شرکت نہ فرما سکے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے مومن و پاکیزہ بندوں کی تطہیر کا یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ انہیں سخت قسم کی آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے۔ چنانچہ اپنی پبلک زندگی میں حضرت ابوبکرؓ کو ارتداد کے فتنہ سے نمٹنا پڑا اور اپنی نجی زندگی میں خصوصی طور پر آپ کو اس آزمائش سے گذرنا پڑا اور اس آزمائش میں آپ نے آخر میں یہی طے کیا کہ حضرت فاطمہؓ کو ناراض کریں خواہ ان کی ناراضگی آپ پر کتنی ہی گراں ہو اور اللہ اور اس کے رسول کی رضا کو سامنے رکھیں۔

باب ۸

حضرت ابوبکرؓ کی غیر معمولی نرمی
اور
غیر معمولی شدّت

ارتداد کے باب میں ابوبکرؓ کے موقف (طرزِ عمل) پر دوبارہ غور کرنا ضروری ہے۔ اس موقع پر آپ کی دو متضاد صفتیں ظہور میں آئیں۔ ہم دیکھتے آئے ہیں کہ اپنے ابتدائے اسلام سے حضرت ابوبکرؓ اپنی نرمی طبع اور رقّت قلب کے لئے معروف تھے۔ شاید آپ کی یہی نرم خوئی تھی جس نے آپ کو اس امر کی طرف مائل کیا تھا کہ آپ بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں آنحضرتؐ سے یہ سفارش فرمائیں کہ انھیں چھوڑ دیا جائے۔

اس موقع پر حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن آنحضرتؐ نے حضرت عمرؓ کے بجائے حضرت ابوبکرؓ کا مشورہ قبول کیا۔ جو قرابت اور سلوک نیک کا واسطہ دلانے لگے تھے اور یہ فرمانے لگے تھے کہ فدیہ کی رقم سے جو قیدیوں کو رہا کرنے کے بعد ملے گی، مسلمانوں کو تقویت حاصل ہوگی۔ اس کے برخلاف حضرت عمرؓ کے پیشِ نظر اہلِ قریش کی سنگدلی اور شقاوت تھی اور وہ بلائیں اور مصیبتیں تھیں جو مسلمانوں پر قریش کی جانب سے نازل ہوئی تھیں۔ حضرت عمرؓ انہیں باتوں کے پیش نظر مصر تھے کہ ان قیدیوں کو تہ تیغ کر دیا جائے تاکہ ایک طرف قریش کے عزم و ہمت میں فتور واقع ہو اور دوسری طرف اس تجربہ کے بعد کفار میں مسلمانوں کے مقابل آنے یا ان کے خلاف سازش کرنے کی جرأت نہ ہو مگر آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکرؓ ہی کی بات مانی اور فدیہ لے کے قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ اس بات پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ذریعہ مسلمانوں کو ملامت کی۔ کیونکہ مسلمانوں نے فدیہ کی رقوم، اس سے پہلے کہ وہ اپنی صولت اور ہیبت بٹھا سکیں

قبول کر لی تھی لیکن ان سے توقع صرف اس بات کی کی جا رہی تھی کہ وہ ہر معاملہ میں اخروی مصلحتیں سامنے رکھیں۔

سورۂ الانفال کی آیات ۶۷، ۶۸، ۶۹ ملاحظہ ہوں۔

مَا کَانَ .... مَا جِیْمٌ۔

(ترجمہ) "پیغمبر کی شان نہیں کہ اس کے قبضہ میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہا دے۔ تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور خدا آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے۔ اور خدا غالب حکمت والا ہے اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو جو (فدیہ) تم نے کیا ہے اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب (نازل) ہوتا تو جو مالِ غنیمت تمہیں ملا ہے اسے کھاؤ کہ وہ تمہارے لیے حلال طیب ہے اور خدا سے ڈرتے رہو بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔"

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملامت کا اظہار فرمایا، بیزاری دکھائی اور ڈرایا اور اس کے بعد معاف فرما دیا اور بخش دیا۔ ایک بات بالکل یقینی ہے کہ ان آیات نے آنحضرتؐ اور ابوبکرؓ دونوں کے قلوب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس شدید تاثر کے بعد بھی حضرت ابوبکرؓ کی روش میں وہی نرمی اور مروت کے عناصر شامل رہے لیکن جس وقت خلافت کا بار آپ کے کاندھوں پر پڑا اور آپ نے دیکھا کہ اگر ایک گروہ جھوٹے نبیوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے تو دوسرا گروہ زکوٰۃ دینے سے انکار کر رہا ہے کچھ مسلمان قتل ہو رہے ہیں اور کچھ نئے فتنوں کا شکار ہوئے جا رہے ہیں یعنی جب ابوبکرؓ کی نگاہوں کے سامنے یہ سب مناظر آئے تو آپ کے اندر ایک شدید ترین جذبۂ انتقام نمو بیدار ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے محض ارتداد کے قلع قمع کرنے ہی پر اکتفا نہیں کی۔ آپ نے عربوں کو اس بات پر بھی آمادہ کیا کہ ان لوگوں کو جو دائرۂ اسلام سے نکل چکے تھے انہیں زبردستی اسلام کی طرف لوٹا دیا جائے۔ یہی نہیں حضرت ابوبکرؓ نے قسم کھائی تھی کہ مرتد لوگوں نے جن مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ ان کا بدلہ ہر قیمت پر لیں گے۔ آپ نے اپنے فوجی سرداروں کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ دشمنان اسلام کے خلاف لڑائی میں جیتنے کے بعد ان لوگوں کو بھی ضرور بالضرور ٹھکانے لگائیں جنہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ بلکہ ان کو عبرتناک سزائیں دیں۔

جس فوجی لیڈر نے اس معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ کی پوری پوری اطاعت کی، بلکہ اس اطاعت اور اجرائے حکم میں غلو تک کیا وہ خالد بن ولیدؓ تھے۔

خالدؓ نے طلیحہ کو شکست دے کے اس کے ماننے والوں کو سلام میں داخل کر لیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں کا تعاقب شروع کیا اور انھیں چن چن کے بُری طرح مارا جنھوں نے بے گناہ مسلمانوں کو قتل کیا تھا یا گمراہ کیا تھا۔ خالدؓ ان خطا کاروں کو کبھی پہاڑیوں کی بلندیوں سے گروا دیتے تھے، کبھی کنوئیں میں ڈلوا دیتے تھے اور کبھی کبھی عام لوگوں میں رعب، دہشت اور سراسیمگی پیدا کرنے کے لیے ان دشمنانِ اسلام کو زمین میں گڑھوا کے ان پر تیر برسواتے تھے، حضرت خالدؓ فطری طور پر اپنے اندر غیر معمولی شدت اور سختی رکھتے تھے۔

جن لوگوں نے فتح مکہ کی تاریخ پڑھی ہے انہیں یہ بات یاد ہوگی کہ حضرت خالدؓ نے آنحضرتؐ کے احکام کی مخالفت کرتے ہوئے مکہ میں قتل کا سلسلہ شروع کیا تھا جسے آنحضرتؐ نے سختی سے روک دیا تھا۔ اس موقع پر آنحضرتؐ نے اپنے دست ہائے مبارک آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اے اللہ میں خالد کے انجام دیئے ہوئے عمل کا قطعاً ذمہ دار نہیں ہوں میں بری الذمہ ہوں۔"

خالدؓ کی یہ درشتی طبع ہمارے لیے، ان کے مالک بن نویرہ کے معاملہ میں اختیار کئے ہوئے موقف کو بھی واضح کر دیتی ہے، ان کے اسی طرز عمل سے حضرت عمرؓ اور دوسرے مسلمان ان سے برگشتہ خاطر ہوئے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ جب خالدؓ طلیحہ اور اس کے ماننے والوں اور دوسرے شورہ پشتوں کو جنہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا یا گمراہ کیا تھا، نمٹا چکے تو وہ مالک بن نویرہ اور بنی یربوع کے لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے، وہ یہ لوگ تھے جو نہ پورے طور پر مرتد ہوئے تھے نہ مسلمان ہی رہ گئے تھے۔ ان لوگوں نے صدقات کی رقمیں روک رکھی تھیں اور بس یہ دیکھ رہے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے، یعنی اسلام ٹکتا ہے، یا اس کے دشمن غالب آجاتے ہیں۔ اور یہ کچھ بنی یربوع ہی کے ساتھ نہ تھا۔ یہی اکثر قبائل کا انداز تھا۔ اب جب خالدؓ اپنی مہم میں کامیاب ہو گئے اور طلیحہ اور اس کے ساتھی شکست پا گئے تو خالدؓ کی اس فتح و نصرت کا مالک بن نویرہ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے اپنے آدمیوں کو متفرق ہو جانے کا حکم دے دیا اور ساتھ ہی یہ اعلان کر دیا کہ جنگ کی تیاریاں بیکار ہیں۔ چنانچہ خالدؓ جب ان لوگوں کے دیار میں آتے ہیں تو میدان صاف پاتے ہیں نہ ان کے مد مقابل کوئی لشکر آتا

ہے نہ جمعیت، اب خالدؓ ایک جگہ رک جاتے ہیں اور فوجی دستوں کو چاروں طرف پھیلا دیتے ہیں لیکن یہ ابوبکری ہدایات کے مطابق ہوتا ہے یعنی ان لوگوں سے کہہ دیا جاتا ہے کہ جہاں بھی جائیں اذانیں کہیں، اب اگر لوگ ان کی اذان پہ لبیک کہیں تو رک جائیں، اور اس وقت تک جنگ کو ملتوی رکھیں جب تک لوگوں سے اسلام کے بنیادی ارکان کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کرلیں۔

ایک فوجی ٹکڑی اپنے ساتھ بنی یربوع کے کچھ لوگ لے کے آئی۔ انھیں لوگوں میں مالک بن نویرہ بھی تھا۔ مؤرخ رقم طراز ہیں کہ یہ فوجی رستہ جوان آدمیوں کو لے کے آیا تھا اس کے آدمی بنی یربوع کے بارے میں دو مختلف رایوں کا اظہار کر رہے تھے۔ کچھ کہتے تھے کہ ان لوگوں نے اذان کے جواب میں اذان کہی تھی اور کچھ کہتے تھے نہیں کہی تھی اس کے بعد خالدؓ نے سب کو گرفتار کر لینے کا حکم صادر کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک ایسی رات کو ہوا جو انتہائی سرد تھی۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا تھا ٹھنڈ بڑھتی جاتی تھی۔ یہ دیکھ کے خالدؓ نے کسی آدمی سے کہا کہ وہ یہ اعلان کر دے کہ ان قیدیوں کو ٹھنڈ سے بچانے کے لئے کچھ کپڑے وغیرہ دیں۔ اب مصیبت یہ پیش آگئی کہ قبیلہ مذکور کی زبان کی رُو سے اِدْفَئُوْ (لباس پہناؤ) کا مطلب "اِقْتُلُوْا" سمجھا گیا اور یوں مالک اور اس کے ساتھی مار ڈالے گئے۔ اب خالدؓ نے جب شور و شیون سنا تو کہا کہ یہ مشیت ایزدی کی بات تھی جو ہو گئی۔

یہ روایت قطعاً مصنوعی اور مختصر ہوتی ہے۔ اس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ خالدؓ کو مالک اور اس کے ساتھیوں کے قتل کی ذمہ داری سے بری قرار دیا جائے۔ بعض دوسرے راوی اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ خالدؓ مالک سے بحث کر رہے تھے، دورانِ بحث مالک نے کہا: تمہارے صاحب، سرکار آنحضرتؐ نے یہ کہا ہے، مثلاً: اس پہ خالدؓ نے کہا کہ کیا وہ تیرے صاحب اور آقا نہیں اور اسی پہ اسے قتل کروا دیا۔ ایک چیز قطعاً صحیح ہے، خالدؓ ہی مالک کے قتل کے ذمہ دار ہیں بلکہ اس پہ آنحضرتؐ کے ایک چیدہ اور ذمہ دار صحابی ناراض بھی ہوئے اور انھوں نے شہادت بھی دی کہ ان لوگوں نے مالک کے ساتھیوں کو اذان کہتے سنا تھا۔ مالک کے قتل کے بعد یہ بزرگ خالدؓ کے

لشکر سے الگ ہو گئے اور قسم کھائی کہ ان کی فرمانبرداری میں آئندہ کبھی جنگ نہیں کریں گے۔ یہ صاحب مدینہ لوٹ آئے ان کا نام ابو قتادہ الانصاریؓ تھا۔ ابو قتادہؓ سے آنحضرتؐ کے جلیل القدر اصحاب نے اس مسئلہ پر گفتگو کی منجملہ حضرت عمرؓ نے بھی اور ابو قتادہ نے حضرت ابوبکرؓ سے ملاقات کر کے ان سے خالدؓ کی شکایت کی۔ ابوبکرؓ نے انھیں اس بات پر سخت تنبیہہ کی کہ وہ بغیر امیر کی اجازت کے لشکر سے کیسے پلٹ آئے، بعد میں حضرت عمرؓ نے بھی حضرت صدیق اکبرؓ سے کہا کہ خالدؓ کی تلوار ستم ریز ہے انہیں معزول کر دینا چاہیئے۔

حضرت ابوبکرؓ نے قضیہ کو سننے کے بعد کہا کہ خالدؓ سے "تاویل میں غلطی ہوئی لیکن حضرت عمرؓ کا اصرار جاری رہا کہ خالدؓ کو معزول کر دینا چاہیئے اس پر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ: یہ تم کیا کہہ رہے ہو عمرؓ، خالد اللہ کی تلوار ہیں: میں انہیں کیسے نیام میں کر لوں۔

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ کو بلا بھیجا۔ خالد مدینہ آئے اور مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے یہاں آنحضرت کے اصحاب جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے۔ تشریف فرما تھے۔

خالدؓ کے طرز عمل اور ان کے قیافہ سے خود پسندی ظاہر ہو رہی تھی ان کا عالم یہ تھا کہ ان کے کاندھوں پر ایک قبا تھی جس پر فولاد کا رنگ چمک رہا تھا اور ان کی پگڑی میں چند عدد تیر جیسے جمے ہوئے تھے حضرت عمرؓ نے جوں ہی یہ دیکھا خالدؓ کے عمامہ کے تیر اکھاڑ کے پھینک دیئے اور کہا تم نے ایک مسلمان کو قتل کیا اور پھر اس کی عورت بھی اپنے تصرف میں کر لی "! خالدؓ نے ملک کے قتل کے بعد زوجہ مالک سے شادی کر لی تھی۔

راوی لکھتے ہیں :۔ عربوں میں اس قسم کی شادیوں کو خصوصاً جنگ میں بکراہت دیکھا جاتا تھا۔ یہ طے ہے کہ خالدؓ نے ام تمیم سے ان کے شوہر کے قتل کے بعد عقد کر لیا تھا اور میرا خیال یہ ہے کہ خالدؓ نے یہ شادی عدت کی تکمیل کے بعد کی تھی لیکن اگر ام تمیم کو لونڈی سمجھا گیا ہو اور انھیں ان شرائط سے مستثنیٰ سمجھا گیا ہو، تو دوسری بات ہے۔

خالدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے حضور مالک کے پورے واقعہ کو بیان کیا اور خالدؓ کا بیان سننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ان کا عذر قبول بھی کر لیا اور ام تمیم سے شادی پر فہمایش کرنے کے بعد، انھیں ان کے لشکر واپس کر دیا بعض راوی معتقد ہیں کہ خالدؓ جب ابوبکرؓ کے حضور سے برآمد ہوئے

تو بہت خوش نظر آرہے تھے چنانچہ انہوں نے حضرت عمرؓ سے دوبارہ تکرار کرنی چاہی۔ حضرت عمرؓ نے سکوت اختیار فرمایا۔

اس تمام روایت سے خالدؓ کی درشت خوئی اور قتل کے معاملہ میں ان کے تشدد کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے ایک بات اور ظاہر ہوتی ہے وہ خالدؓ کا شوق عقد ہے، اس شوق عقد کا ثبوت بعد میں ملے گا۔

خالدؓ میں ہمیں ایک اور صفت کا بھی سراغ ملتا ہے۔ شاید یہ صفت خالدؓ کے قبیلہ اور بنی مخزوم کی صفت تھی یعنی خود پسندی اور شان و شوکت کے اظہار کی صفت۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود خالدؓ کی فن جنگ سے زبردست واقفیت اور عرب کو اسلام کی جانب دوبارہ لانے کی صلاحیت مسلم ہیں۔

اس سے پہلے اس امر کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے کہ عکرمہ بن ابی جہل نے مسیلمہ کے مقابلہ میں لڑی جانے والی جنگ میں فوجی مدد کا انتظار نہ کیا تھا اور نتیجہ کے طور پر انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ اس پر صدیق اکبرؓ کو جلال آگیا تھا۔

اس کے بعد ایک دوسرے ابوبکری سردار نے مسیلمہ کے لشکر سے ٹکر لی تھی لیکن وہ بھی ناکام رہے تھے یہ تھے شرجیل بن حسنہ، اب حضرت ابوبکرؓ نے مسیلمہ کے لشکر کی قوت اور موقع کی نزاکت کے پیش نظر خود خالدؓ کو مرتدین کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ اس بار انہیں شرجیل کے لشکر کی امارت بھی سونپ دی گئی۔ ان کے ساتھ مہاجرین اور انصار کا ایک مستند گروہ تھا۔

خالدؓ یمامہ کی جانب چلے وہاں انہیں مسیلمہ کی جماعت کے کچھ لوگ نظر آئے جنہیں خالدؓ نے ترکیب سے پکڑ لیا۔ اور پھر انہیں قتل کر دیا۔ ان لوگوں میں سے صرف ایک شخص کو نہیں مارا گیا۔ اُسے ہتھکڑیاں پہنا کے قید میں کر دیا گیا اور اسے ام تمیم کی، جن سے حضرت خالدؓ نے مالک کے قتل کے بعد شادی کی تھی، نگرانی میں دے دیا گیا۔ یہ شخص مجاعہ بن مرارہ تھا۔

راوی کہتے ہیں: خالدؓ مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں کے مقابل آئے۔ جنگ نے شدت اختیار کرلی۔ ایسی شدت کہ اس سے پہلے فتنہ ارتداد کے قلع قمع کے سلسلہ کی کسی جنگ میں اس کا مظاہرہ نہ ہوا تھا۔ اب مسلمان ہر طرف پھیل رہے تھے۔ بھاگ رہے تھے۔ حد یہ ہوئی کہ مسیلمہ کے آدمی

مسلمانوں کا پیچھا کرتے کرتے خالدؓ کے خیمہ میں گھس گئے اور ام تمیم کو مارنا چاہا لیکن مجاعہ چیخ اٹھے اور مسلمانوں کو آواز دی۔ چنانچہ یہ لوگ پلٹ پڑے اور ایک بار پھر گھمسان کا رن پڑ گیا۔ اس رن کا انجام مسلمانوں کی جیت پر ہوا۔ اب مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں نے ایک باغ میں جسے مورخوں نے باغ مرگ کہا ہے پناہ لی۔ مسلمان بھی وہاں پہنچ گئے اور مسیلمہ اور اس کے ساتھی دردناک طور پر مارے گئے۔

اب مجاعہ بن مرارہ نے جو کہ خالدؓ کی قید میں تھا، یمامہ میں اپنی قوم کے زیر تصرف قلعوں کی بابت صلح کی پیش کش کر دی۔ خالدؓ نے یمامہ میں موجود سونے چاندی، ہتھیار اس کے ہر گاؤں کے آدھے باغات اور کھیتوں کے میدان اور نصف حصہ اسیران جنگ کی بنیاد پر صلحنامے پر دستخط کر دیئے۔ صلح کرنے کے بعد خالدؓ نے مجاعہ سے کہا کہ "اپنی بیٹی میرے عقد میں دیدے"۔ مجاعہ نے جواب دیا۔ تم تو میری پشت پر سوار ہو (اسے توڑے ڈال رہے ہو) آخر تم بھی تو ابوبکرؓ کے ماتحت ہو"۔ اب خالدؓ نے اصرار سے کہا "اے شخص اپنی بیٹی میرے عقد میں دیدے" اور اُسے ایسا ہی کرنا پڑا۔ ابوبکرؓ کو کامرانی کی اطلاع پہنچی اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ خالدؓ نے مجاعہ بن مرارہ کی بیٹی سے شادی کی ہے۔ تو آپ نے خالدؓ کو فہمائش کرتے ہوئے لکھا کہ "تم کو تو بس شادی سے کام ہے، ام خالد کے بیٹے خواہ تمہارے ساتھ کے مسلمان کسی عالم میں ہوں"۔

راویوں کا خیال ہے کہ خالدؓ نے اس نامہ کو دیکھ کے کہا تھا ہو نہ ہو یہ عمرؓ کا کام ہے۔ حالت جنگ میں خالدؓ میں طبعاً درشتی اور سختی آ ہی جاتی تھی۔ عراق کی مہم میں جس میں آپ کو عربوں اور ایرانیوں کی متفقہ ٹولیوں سے لڑنا پڑا تھا، ان کی یہ شدت اور بھی نمایاں ہوئی تھی ارتدادی جنگوں اور مسیلمہ کی جنگ کے بیان سے اصل غایت یہی تھی کہ خالدؓ کی بعض صفات نمایاں ہو جائیں۔ شیخینؓ میں بعض امور میں جو زبردست اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا ان کی بنیاد خالدؓ کی یہی بعض عادتیں اور مخصوص صفات تھیں۔ یہ اختلاف رائے جس کا ابھی ذکر ہوا، حضرت ابوبکرؓ کی وفات سے ختم نہ ہوا تھا۔ اس کا سلسلہ جاری رہا تھا اور بالآخر خالدؓ کو معزول اور جنگی اور سپاہیانہ زندگی سے محروم ہونا پڑا تھا۔ خالدؓ کو آخر زمانہ سکون اور امن میں کاٹنا پڑا۔ اپنے مرض الموت میں خالدؓ نے فرمایا تھا۔

"بخدا میرے جسم کے ہر ہر حصہ پر تلوار کے گھاؤ لگ چکے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ میں آج

مر بستر پر رہا ہوں"۔ جہاں تک حضرت ابوبکرؓ کا تعلق ہے۔ آپ حضرت خالدؓ کی شجاعت، قوت کارزائی اور جنگی مہارت سے حد درجہ متاثر تھے۔ اور خالدؓ بھی اس ابوبکری حسنِ ظن کو پورا کر دکھاتے تھے اور ہر موقع پر زبردست جنگی لیاقت اور بصالت و مردانگی کا ثبوت دیتے تھے۔ خالدؓ ہی تھے جنہوں نے طلیحہ کو شکست دی تھی۔ بنی حنیفہ کے باقی ماندہ افراد کو دائرہ اسلام میں لائے تھے اور دونوں موقعوں پر کر زور دست اور ضربت کاری کے مقام تھے، زبردست شجاعت دکھائی تھی۔ ایسی شجاعت حضرت ابوبکرؓ کا کوئی دوسرا فوجی قائد نہیں دکھا سکا تھا۔ عراق کی فتح و نصرت کے سلسلہ میں تو خالدؓ کے کارنامے معجزہ آسا اور حیرت انگیز ہیں۔ اگر عراق کی مہم میں آگے بڑھنے سے ابوبکری احکامات خالدؓ کو روک نہ لیتے تو دورِ فاروقی کے بعض واقعات بہت پہلے پیش آجاتے اور کون جانتا ہے کسریٰ شاہنشاہوں کے پائے تخت مدائن پہنچنے کے معاملہ میں خالدؓ نے سعد ابن ابی وقاصؓ پر سبقت حاصل کر لی ہوتی۔

لیکن اس قدر شناسی کے باوجود حضرت ابوبکرؓ کو خالدی حدت اور شدت کا احساس تھا۔ آپ ان مواقع پر جب خالدؓ کے اندر امیر لشکر کی حیثیت سے کسی مہم پر جانے سے زیادہ خوشگوار کوئی بات نہ ہوسکتی انہیں تاکید اور تحکم سے جکڑ دیا کرتے تھے۔ ابوبکرؓ نے خالدؓ کو ہدایت کی تھی کہ وہ عراق کی مہم چھوڑ کر شام کی طرف پلٹ جائیں اور وہاں مسلمان مجاہدین کی مدد کریں۔ اور ان پر امارت بھی انھیں کو حاصل رہے گی۔ شام میں خالدؓ کی کارگذاری بہت زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور اس کے اثرات بے حد دوررس نکلے۔ حضرت ابوبکرؓ کے اعتماد کی یہی وجہ تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ آپ نے حضرت عمرؓ کے اصرار کے باوجود خالدؓ کو معزول نہیں کیا۔

حضرت عمرؓ مسئلہ کو بالکل ہی دوسری نظر سے دیکھتے تھے۔ آپ کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ قائدین لشکر کو اطاعتِ امیر کرنی چاہیئے اور انھیں اعتدال کی حدوں سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے اور عام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے سپاہیوں کی بھی مقبولیت حاصل رہنی چاہیئے اور ان میں بدنام نہ ہونا چاہیئے۔ پھر قائدین لشکر کو حد درجہ منصف مزاج بھی ہونا چاہیئے۔ ظلم و زیادتی سے دور اور نفور رہنا چاہیئے اور دینی معاملات میں سپاہیوں کے لیے ایک نمونہ بننا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ کے لیے ایک جنگ میں فتح و کامرانی یا شکست و ہزیمت سے زیادہ اہم دین کا مسئلہ تھا۔ دین جنگ پر فائق تھا۔

حضرت عمرؓ نے جب یہ دیکھا کہ خالدؓ نے ایک ایسے شخص کو جس کے بارے میں قابل اعتماد اور ذوی العدل اصحاب نے یہ شہادت دی تھی کہ وہ مسلمان ہے، قتل کیا اور اس قتل پر بس نہ کرتے ہوئے مقتول کی بیوی سے بڑی عجلت کے ساتھ عقد بھی کیا۔ تو آپ کو یقین سا ہو گیا کہ اس قتل میں للہیت کم تھی، درشتی مزاج اور دنیا طلبی کو زیادہ دخل تھا۔

اس سے حضرت عمرؓ کو سخت تکدر رہا تھا اور آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو خالدؓ کے معزول کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب یہ بات نہ مانی تو آپ چپ ہو رہے۔ لیکن خالدؓ کے بارے میں آپ کی رائے تبدیل نہ ہوئی۔ پھر جب آپ نے یہ دیکھا کہ یمامہ میں آنحضرتؐ کے چیدہ چیدہ اصحاب (مہاجرین اور انصار) قتل ہو گئے اور ان جنگوں میں تقریباً گیارہ بارہ سو مسلمان ہلاک ہوئے۔ اور یہ دیکھا کہ اس بلاخیزی اور حشر سامانی پر بھی خالدؓ نے بنت مجاعہ، یعنی ام تمیم، زوجہ مالک سے شادی کے تھوڑے ہی دن بعد عقد رچایا۔ تو آپ بیحد ناراض ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ یہ سب دیکھنے کے بعد حضرت عمرؓ سخت غضبناک ہوئے۔ کم از کم حضرت عمرؓ نے خالد کے معاملہ میں ابوبکری رائے کو متاثر ضرور کر دیا تھا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس سلسلہ میں سوائے حضرت خالدؓ کی ایک فہمائش کے، جس کا ذکر ہو چکا ہے، اور کچھ نہ کیا۔

کہنے کا مقصد کچھ یہ نہیں کہ خالدؓ کے باب میں شیخینؓ کے موقف پر جو اختلاف تھا اس پر شرح و بسط ضروری ہے۔ میرے نزدیک اپنے اپنے مقام پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے اجتہاد کیا۔ اور دونوں کا اس اجتہاد سے مقصد رضائے الہٰی کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ پایا کہ خالدؓ ایک جنگی شخصیت کے مالک ہیں۔ سب سے لائق اور سب پر فائق، اور اثنائے جنگ انھیں معزول کر دینے سے مسلمان گھاٹے میں رہیں گے۔ شاید ان کی ہمتیں پست ہو جائیں گی اور دشمن کے مقابلہ میں وہ کمزور پڑ جائیں گے۔

حضرت عمرؓ کے سامنے اعلیٰ آئیڈیل تھا، وہ معیار مطلق کے قائل تھے اور اس سلسلہ میں کسی بھی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ ہوئی کہ قوت بازوئے خالدؓ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن جب انہوں نے جنگ میں حد اعتدال سے تجاوز کیا تو انھیں روکا بھی گیا اور ایک ذاتی معاملہ میں ان کی فہمائش بھی ہوئی۔ مالک کی بیوی ام تمیم اور واقعہ

یمامہ کے بعد مجاعہ کی بیٹی سے عقد کرنے پر بھی خالدؓ کو تنبیہہ کی گئی ایک اور موقع پر بھی خالدؓ کی تنبیہہ ہوئی۔ ہوا یہ تھا کہ عراق کی فتح کے بعد خالدؓ نے محض چند خواص کو اطلاع دیتے ہوئے لیکن عام سپاہیوں سے چھپاتے ہوئے حج کا ارادہ کیا۔ اور اہل لشکر پر یہ ظاہر کیا کہ وہ ممکنہ عواقب اور آئندہ پیش آجانے والے واقعات کے پیش نظر دشمن کی تفتیش کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ خالدؓ نے مکہ کا قصد ایسے راستے سے کیا جو عام حجاج کا راستہ نہ تھا۔ حج کے بعد خالدؓ حیرہ کے مقام پر اپنے لشکر سے آملے۔ ابوبکرؓ کو خالدؓ کے حج کے بارے میں بالکل بعد میں علم ہوا۔ اب صدیق اکبرؓ نے خالدؓ کی فہمائش کی اور انھیں شام جانے کا حکم دیا۔ اس موقع پر شام میں اسلامی لشکر سخت اور خطرناک پوزیشن میں تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کے مراسلے کی عبارت سے، جیسا کہ اسے راویوں نے بیان کیا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفۂ اوّلؓ کو خالد کی دوسرے قائدین کے مقابلہ میں لیاقت اور مہارت اور حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت کا پورا پورا احساس تھا۔ لیکن اسی مراسلہ کی عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خالدؓ کو اپنے طرزِ عمل سے باز رہنے کی ہدایت کی گئی تھی اور انھیں اس بات سے روکا گیا تھا کہ وہ اپنے لشکر کو چھوڑ کر بالا بالا اور خفیہ طور پر حج کر کے آجائیں۔ کیونکہ قائد کی غیر موجودگی میں سپاہ اسلام کے لئے بڑے سے بڑا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اسی طرح خالدؓ کو خود پسندی اور تکبر سے روکا گیا تھا کیونکہ اس سے ان کے عظیم کارناموں پر پانی پھر سکتا تھا۔ انہیں یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ وہ ہر بات میں محض اللہ کی رضا ڈھونڈیں کیونکہ حقیقی پاداش اور انعام اسی کے دربار سے مل سکتا ہے۔ غالباً حضرت ابوبکرؓ کو خالدؓ کے اس عجب اور ان کی اس خود پسندی کا احساس یوں ہوا کہ وہ (خالدؓ) اپنے پر اس درجہ اعتماد کرنے لگے تھے کہ انھوں نے اسلامی لشکر کو اس عالم میں چھوڑ کے آنا گوارا کر لیا تھا اور دشمن کو اس درجہ حقیر گردانا تھا۔ حج کے لئے اس عجلت اور اس سرعت سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایام حج میں، لوگوں کے اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، خصوصاً بنی مخزوم کے لوگوں کو اپنی کارگذاریوں سے واقف کرنا چاہتے تھے۔

عراق کے کارنامے پر خالدؓ بجا طور پر فخر کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ نہ صرف یہ کہ خالدؓ نے عراق عرب کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ انھوں نے عراق کی کمک پر پہنچنے والے ایرانیوں کو بھی

مغلوب کر لیا تھا اور عراق کو اسلام کے تصرف میں از سر نو لے آئے تھے۔ خالدؓ اور ان کے ساتھی علاقہ بھر کو ان کے دیس میں لوٹتا رہے تھے۔ ایرانیوں اور عراقیوں کی ٹولیوں کو خالدؓ فی الفور شکست دے دیتے تھے۔ عراق میں جنگ کے تسلسل، ایرانیوں کی شدید کوشش کہ عراق ان کے ہاتھوں سے نکلنے نہ پائے، اس معاملہ میں ان کی ثبات قدمی، یہ تمام چیزیں تھیں جن سے خالدؓ کو زبردست اشتعال پیدا ہوتا تھا۔ اس حد تک کہ خالدؓ نے ایک بار قسم کھالی تھی کہ اگر وہ اس جنگ میں کامیاب ہو گئے تو دشمنوں کے خون کی نہر بہا دیں گے۔ دشمن کو ہرا چکنے کے بعد خالدؓ نے منادی کر دی کہ قیدیوں کا پیچھا کیا جائے اور صرف ان کو مارا جائے جو اطاعت قبول نہ کریں۔ مسلمانوں نے قیدیوں کا اس حد تک پیچھا کیا کہ ان کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی اب خالدؓ کو اپنی قسم یاد آئی۔ نہر کا پانی رکوا کے انھوں نے قیدیوں کو مار مار کے ان کی گردنیں نہر میں ڈالنی شروع کر دیں۔ راویوں کے قول کے مطابق یہ عمل ایک دن اور ایک رات جاری رہا۔ جس پر ایک صحابی قعقاع بن عمروؓ نے کہا تھا کہ خون یوں بہتا نظر نہیں آتا اور زمین بھی خون کو خشک نہیں کر سکتی۔ اس لیے اپنی قسم پوری کرنے کے لیے پانی بہنے دو۔ اب جب خالدؓ نے پانی بہنے کا حکم دیا تو پانی کے ساتھ خون بھی شامل ہو کے بہا۔ اسی لیے اس مخصوص نہر کو خونی نہر سے تعبیر کیا جانے لگا۔

راویوں نے یہ روایات بیان کر کے مبالغہ آرائی کی انتہا کر دی ہے۔ اتنا یقینی ہے کہ خالدؓ نے قتلِ دشمنانِ اسلام میں تشدد برتا تھا۔ اتنا کہ اسے دیکھ کے قعقاع اور ان کے ساتھیوں سے نہ رہا گیا۔ خالدؓ کی سخت گیری اور دہشت مزاجی کی یہ ایک تصویر ہے جس پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ یہ بات ہے کہ خالدؓ عراق عرب کو دوبارہ اسلام کے قبضہ میں لانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اہل فارس دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ ان کی تو یہ خواہش تھی کہ انھیں حضرت ابوبکرؓ اس بات کی اجازت دیں کہ وہ ایرانیوں کے گھر میں گھس کے ان پر ٹوٹ پڑیں۔ لیکن انھیں اس امر کی اجازت نہ دی گئی۔ ادھر خالدؓ کے لیے دشوار تھا کہ وہ مشغلہ جنگ کے بغیر عراق میں ڈیرے ڈالے پڑے رہیں۔ چنانچہ عراق میں اپنے اس ایک سالہ قیام کو جس میں وہ لڑائی سے محروم رہے خالدؓ عورتوں کا سال کہا کرتے تھے! شام جانے کے احکامات پا کر خالدؓ کو بڑی گرانی محسوس ہوئی۔ اس سے ایک بڑا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ موقع یہ تھا کہ ایران سے جنگ جاری رکھی جائے یہاں تک کہ

ان کے پائے تخت مدائن پر تصرف پا لیا جائے۔ مگر خالدؓ کے لئے سوائے اطاعت امیر کے کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا۔ اب خالدؓ کو چاروناچار اپنے آدھے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کے لئے شام روانہ ہونا پڑا۔ شام کی جانب ان کی پیش قدمی اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ان کا اس طرف بڑھ جانا، انتہائی عجیب واقعہ تاریخ ہے۔

ابوبکری دور تھا ہی تھوڑی سی مدت کا۔ لیکن جتنا بھی تھا۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پے بہ پے ایسے حوادث رونما ہوئے کہ جذبات مشتعل ہو ہو گئے، خوابیدہ لوگ بیدار ہو ہو گئے۔ پرسکون طبیعتوں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور وہ لوگ بھی اپنی روش بدلنے پر آمادہ ہو گئے جو اب تک نرمی اور مروت کو اوڑھے جانتے تھے۔ اب تک حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے خاص الخاص مقربین یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ طوعاً یا کرہاً کیسے ہی سہی اہل عرب اسلام بہر حال قبول کر چکے ہیں۔ اور کم از کم جزیرہ نمائے عرب میں جہاں تک تعلق ہے تشویش کی کوئی بات باقی نہیں صرف ان عربوں کو جو فارس اور روم میں پھیلے ہوئے ہیں اور پراگندہ ہیں انہیں آزاد کرانے کی ضرورت ہے۔ یہ امر بھی اس لئے ضروری سمجھا گیا تھا کہ عرب کی سرحدیں محفوظ ہو جائیں اور عربوں پر کسی بیرونی طاقت کا دباؤ نہ رہ سکے۔ ان لوگوں کے پیش نظر یہ بات تھی کہ آنحضرتؐ نے بہر صورت روم کی سرحدوں سے ملنے والی عرب سرحدوں کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ موتہ میں لشکر روانہ کیا تھا۔ غزوہ تبوک میں بنفس نفیس قیادت فرمائی تھی۔ اسامہؓ کے لشکر کو مرتب کئے جانے اور اسے شمال کی سمت بھیجنے کی شدید تاکید فرمائی تھی۔

عرب یہ سمجھ چکے تھے کہ آنحضرتؐ کے ان اقدامات کا اصل مقصود یہ تھا کہ آخرکار قسطنطنیہ کی عیسائی سلطنت کے تصرف اور تغلب سے منتشر اور پراگندہ عربوں کو نکال لیا جائے۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ آنحضرتؐ اگر رفیق اعلیٰ سے نہ جا ملے ہوتے تو عراق میں پھیلے ہوئے عربوں کو بھی ایرانی شاہنشاہوں کے چنگل سے نکال لیتے۔

جہاں تک ابوبکرؓ کا تعلق تھا وہ ہمیشہ اس روش کو اختیار کرتے تھے جو ان کے خیال میں آنحضرتؐ کے اس وقت بقید حیات ہونے کی شکل میں خود آپ کی ہوتی۔ ابوبکرؓ کے سامنے اس وقت مسئلہ تھا جزیرہ نما کے حدود کے باہر پراگندہ اور منتشر عربوں کو آزاد کرانے کا۔ لیکن

قبل اس کے کہ صدیق اکبرؓ اپنے عظیم الشان سرکار کے خاکے میں رنگ بھر سکیں انھیں ایک دوسرا ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ وہ یہ تھا کہ مدعیان نبوت ، نبوت کے بے اساس دعووں کے ساتھ آنحضرتؐ کی وفات سے پہلے ہی پہلے نکل پڑے تھے۔ اور ان کے پیچھے ایک گروہ کا گروہ چل پڑا تھا۔ تمام عرب جاہلیت کی طرف پلٹ آیا تھا۔ زکوٰۃ جیسے امیروں سے اس لئے لیا جاتا تھا کہ وہ فقیروں اور غریبوں میں بانٹ دیجائے۔ اب ایک ایسے خراج اور ایسے ٹیکس کی شکل میں لوگوں کو دکھائی دینے لگی تھی جیسے گویا مدینہ میں بیٹھا ہوا کوئی حاکم لوگوں سے مانگ رہا تھا۔ وصول کر رہا تھا۔ نبی کریمؐ کی زندگی میں تو خیر لوگوں نے جبراً یا قہراً زکوٰۃ کے بارے میں اللہ کا حکم مان لیا تھا اس لئے کہ انہیں اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ نبوت میں اتنی طاقت ہے اور اتنی قوت ہے کہ اس سے ٹکر نہیں لی جا سکتی۔ لیکن جوں ہی رسالت کا آفتاب غروب ہو گیا اور اختیار کی زمام ایک ایسی شخصیت کے ہاتھ میں آئی جسے عرب ایک عام عرب سمجھتے تھے تو لوگوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور اس ہیجان اور اضطراب کے بعد ہی لوگ ان حقائق سے انکار کر بیٹھے جسے وہ تسلیم کر چکے تھے۔ اب ان کی نظر میں یہ زکواۃ قبیلہ قریش کے لئے ایک محصول نظر آنے لگی۔ ظاہر ہے اس خیال کے آتے ہی عصبیت اور عصیان شعاری ظہور پانے لگے۔ لوگوں نے سوچا آخر وہ ایک قبیلہ کے باجگذار کیوں بن بیٹھیں۔ اور محض ایک ایسے شخص کی اطاعت کیوں قبول کر لیں جو آخر ہے تو محض ایک خاص قبیلہ کا قریش کا لعینی :

اگر وہ (یہ لوگ) اب تک نبی اعظمؐ کو زکوٰۃ کی رقم حوالے کرتے تھے تو نبی اعظمؐ کی اور بات تھی۔ اس پہ وحی نازل ہوتی تھی۔ چنانچہ نئی صورت حال سے نمٹنے کے لئے ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ قریش اور ابوبکرؓ سے جنہیں وہ محض رئیس قبیلہ قریش کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے زکوٰۃ کو مستثنیٰ کرواتے ہوئے اسلام کے ارکان پہ صلح کر لیں۔ یہ زکوٰۃ سے اس لئے جان چھڑانا چاہتے تھے کہ وہ جاہلیت میں اس کے عادی نہ تھے۔ اب جب ابوبکرؓ نے ان (ڈھیل) شرائط کو قبول کرنے سے انکار کیا تو بادیہ نشینوں نے ان کی بیعت ہی توڑ دی۔ انھیں بہت سہل گردانا۔ ان کے گروہ کی قلت اور اپنی کثرت اور زیادتی تعداد پر غرہ کیا۔ حد یہ کہ کہنے والے نے کہا :-

رسول اکرمؐ جب تک ہم پر سایہ فگن رہے ہم اطاعت شعار رہے لیکن یہ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ رسول اعظمؐ کے مرتبہ اور اقتدار کی وراثت حاصل کر کے ہم سے طالب

اطاعت ہوں!

بادہ نشین عربوں نے ابوبکرؓ کو اس سے زیادہ اور نہ سمجھا تھا کہ انھیں قریش کی سرداری حاصل ہو گئی تھی اب یہ لوگ وہ تھے جنہوں نے بادشاہوں اور تاجداروں کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ شام کے غسانی اور عراق کے مناذرہ (منذر کی جمع) نے کبھی عربوں پر تسلط نہ جمایا تھا اور نہ ان پر کسی قسم کے محاصل عائد کئے تھے۔ پھر اس قریشی سردار مراد ابوبکرؓ کو دفعتہً کیا ہو گیا تھا کہ عربوں پر اپنی ملوکیت اور بالادستی جتلا رہا تھا۔ ان سے محاصل وصول کر رہا تھا۔

ان لوگوں نے ابوبکرؓ کو بالکل سہل سمجھ لیا تھا۔ نوبت تمسخر تک پہنچ چکی تھی۔ بکر کا مطلب نوخیز اونٹ ہے، چنانچہ ابوبکرؓ کے لفظی تلازم کا تمسخر ہوتا تھا اور بکر کے مترادف فصیل سے صدیق اکبر کی کنیت بنائی جاتی تھی۔ اس موقع پر سنجیدہ اور باشعور اشخاص جو اپنے مسلک سے نہیں ہٹے تھے ان جہلاً کو نیک و بد سمجھاتے تھے اور کہتے تھے۔

آج تم یہ سب کچھ کر رہے ہو، کل دیکھو گے کہ تمہیں انہیں ابوبکرؓ (لغوی معنی: چھوٹے اونٹ کا باپ، کو ابوالفحل الاکبر (سب سے بڑے اونٹ کا باپ) کہنا پڑے گا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ تم سے باکرامت اور باوقار اور سنگین اور رفیع الشان ہے۔

ان سب باتوں سے حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے مشیر سخت مکدر اور غضبناک ہوئے۔

بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ عمان میں رسالت پناہؐ کی سونپی ہوئی ایک مہم سر کر کے وہاں سے واپس ہو رہے تھے تو راستہ میں ان کی مڈبھیڑ قرۃ بن حبیرہ سے جو بنی عامر کا ایک سردار تھا، ہو گئی۔ سردار بنی عامر نے موصوف کو اپنے ہاں ٹھہرایا لیکن چلتے وقت ان سے کہا۔ " سنتے ہو، عرب تم لوگوں کو اب یہ ٹیکس نہیں دینے کے " بات بڑھ گئی اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس شخص کو دھمکی دی۔ مدینہ پہنچنے پر عمرو بن العاصؓ نے آنحضرتؐ کے محترم اور معظم رفقاً کو راستے کے ان مشاہدات سے آگاہ کیا اور یہ لوگ یہ سن کر کہ عامتہ الناس سلام سے ہٹ رہے ہیں، لرز گئے۔ باتیں ہونے لگیں وہیں حضرت عمر بن الخطابؓ عمرو بن العاصؓ سے ملنے کی غرض سے آئے۔ انہیں دیکھ کے سب خاموش ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں البتہ مجھے گمان یہ ہوا کہ تم لوگوں کو عرب عوام کے ارتداد اور

ان کی عہد شکنی کا جس کی اطلاع عمرو بن العاصؓ نے تمہیں دی ہے احساس ہو گیا ہے۔ تم یہ سن کر لرز اٹھے ہو اور اب بیٹھے ہو پسے مشورہ، سب نے کہا: ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: بخدا، مجھے تو اس کا زیادہ خطرہ ہے کہ کہیں تم لوگ اس موقع پر سستی نہ دکھا بیٹھو۔

اب جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اس بات سے یہ حقیقت بالکل ہی واضح ہو جاتی ہے کہ مرتد لوگوں سے جنگ کرنے کے معاملہ میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے ہرگز اختلاف رائے نہ فرمایا تھا۔ گو اکثر راوی یہی لکھتے آئے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ عرب کس حد تک اسلام سے دفعتہً پلٹ گئے تھے۔ ان کے اندر یہ جذبہ تک بیدار ہو چکا تھا کہ وہ جاہلی زندگی کو از سرِ نو اپنا لیں۔ وہ بالکل گمراہ ہو جانے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ اس موقع پر ابوبکرؓ کا سرعت کے ساتھ کا اقدام کام آیا جس سے قوم فلاح کی جانب بجبر پلٹا دی گئی۔

اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ اس صورت حالات سے صالح قسم کے مسلمان پریشان خاطر اور تشویش زدہ ہو گئے تھے اور اس نے ابوبکرؓ جیسے شخص کو جو تندی اور سختی کے بجائے ملائمت کو ترجیح دینے میں مشہور تھے، مجبور کیا کہ وہ اپنی روش چھوڑ دیں اور اپنی روایات سے ہٹ کر راستہ اختیار کریں۔ مرتدوں نے جس طرح عام مسلمانوں کو سہل گردانا تھا حضرت ابوبکرؓ کو بھی سہل جانا تھا۔ اس کے ردعمل کے طور پر، بالکل قدرتی بات تھی کہ حضرت ابوبکرؓ نرم خوئی کے باوجود اس حد تک سخت گیر ہو جائیں یعنی ابریشم سے فولاد بن جائیں۔

بنی سلیم کا ایک شخص جسے فُجاءہ کہتے ہیں اور جس کا نام ایاس بن عبد یالیل ہوتا ہے آکے یہ کہتا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور مرتدوں سے جنگ کرنی چاہتا ہے اور یہ شخص ساز و سامان اور ہتھیاروں کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسے ضروری چیزیں (سامان جنگ) فراہم کر دی جاتی ہیں۔ ابھی یہ (غدار اور خائن اور بد طینت) شخص مدینہ کے باہر بھی نہیں آتا کہ اس کی نیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے جیسے کچھ لوگ جمع کر لیے اور بے دھڑک لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ کافر اور مسلم کی قید اڑاتے ہوئے، اور یوں ملک میں ابتری اور انتشار کا باعث بن بیٹھا۔

حضرت ابوبکرؓ کو اس کا علم ہوا۔ آپ نے اپنے عمال اور کارندوں کو حکم دیا کہ کچھ بھی ہو فجاءہ کو ہر حالت میں پکڑ کے لائیں۔ اور اگر اسے قتل نہ کیا جا سکے تو قید میں ڈال کے لایا جائے ایک کارندہ حکومت نے زبردست مشکلات کے بعد فجاءۃ کو پکڑ لیا۔ اب ابوبکرؓ نے حکم دیا کہ مدینہ میں مصلیٰ کے مقام پر، یعنی وہاں جہاں آنحضرتؐ اور مسلمان عیدین اور جنازہ کی نمازوں کے لئے نکلتے تھے، آگ سلگائی جائے اور اس میں فجاءۃ کو ڈال دیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے اس غدار کو یہ عبرتناک سزا دی گئی کہ اسے آگ میں جلا دیا گیا واقعہ یہ ہے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ اس شخص کی غداری پر سخت غضبناک نہ ہوئے ہوتے اور ارتداد کے فتنے کو اس جیسے شخص کی خیانتوں سے تقویت پاتے نہ دیکھتے اور اس انتہائی شدید اور سخت عبرتناک سزا) پر مجبور نہ ہو گئے ہوتے تو شاید وہ اللہ اور اس کے عظیم رسول کے اس دشمن کی سزا میں دوسرا راستہ اختیار کرتے۔

سورہ مائدہ کی ۳۳ ویں آیت کے پیش نظر جس کا مطلب یہ ہے :-

"جو لوگ خدا اور اس کے رسول سے لڑائی کریں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں، یا ان کے ایک طرف کے ہاتھ اور ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا ملک سے نکال دیئے جائیں۔ یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا بھاری عذاب تیار ہے۔"

معتبر راوی بیان کرتے ہیں کہ بعد کو حضرت ابوبکرؓ کو فجاءۃ کے لئے جلائے جانے کا حکم دینے پر ندامت ہوئی اور اپنے مرض الموت میں انہوں نے اپنے عیادت کرنے والوں سے اس کا اظہار بھی فرمایا۔

اس ندامت کی ایک بڑی واضح سی دلیل یہ ہے کہ بعد میں جب آپ کے سامنے وہ قیدی لائے جاتے تھے جنہوں نے مثلاً لوگوں کو ارتداد پر اکسایا تھا اور مسلمانوں سے لڑنے کے لئے قبائل کی قیادت اور رہنمائی اختیار کی تھی۔ تو آپ انہیں سختی سے ڈانٹتے تھے ان کو فہمائش فرماتے تھے اور پھر ان سے توبہ قبول کرنے کے بعد انھیں چھوڑ دیتے تھے۔ اس طرز عمل اور روش سے بہت سا خون بہنے سے رہ گیا اور اس قوم کو معاف کر دیا گیا

جس نے بعد میں اسلام کے لئے فتوحات حاصل کرنے میں زبردست صلاحیتیں دکھائیں۔ طلیحہ سلام کی طرف دوبارہ آیا اور اس کے بعد تھوڑی مدت کے لئے شام میں جا کے رہ پڑا۔ پھر عمرہ کا ارادہ کیا اور مکہ جاتے ہوئے مدینہ سے گزرا بھی۔ مسلمانوں نے اسے پہچان لیا اور حضرت ابوبکرؓ کو اس کی اطلاع دی کہ مدینہ سے قریب ہی طلیحہ مکہ کی طرف گامزن ہے اس پر رحیم القلب خلیفہ اجل (ابوبکرؓ) نے فرمایا تھا۔

"اب میں اسے کیا سزا دے سکتا ہوں اور اس کے ساتھ کیا معاملہ کر سکتا ہوں جبکہ اللہ نے اسے سلام کی جانب پلٹا دیا ہے"

ابتدائے خلافت صدیقی میں جو لوگ مرتد ہو گئے تھے۔ ان میں کم از کم طلیحہ سے بڑھ کر، خلافت فاروقی کے دوران، ایرانیوں کے مقابلہ میں کسی نے داد شجاعت نہیں دی۔ کچھ بھی کہا جائے اور امر واقعہ کچھ ہی ہو، یہ طے ہے کہ ابوبکرؓ میں جو نرمی اور سختی کا امتزاج تھا۔ کہ نرمی کے موقع پر نرمی برتی جائے اور سختی کے موقع پر سختی سے کام لیا جائے، اسی کا نتیجہ تھا کہ ارتداد کا، آپ کے دور میں خاتمہ ہو گیا۔ اور اسلام سے ایک بار نکل جانے کے بعد، عرب از سر نو اسلام کے دائرہ میں آ گئے اور یہ سب کچھ خلافت کے پہلے ہی سال میں انجام پا گیا۔ اس کے بعد ہی ابوبکرؓ کے لئے یہ بات ممکن ہو سکی کہ شام میں اور عراق میں منتشر عربوں کو آزاد کرانے کے کام کا آغاز کر سکیں۔

باب ۹

عراق و شام کی تسخیر

حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ عراق کی فتح ممکن ہوتی گئی ورنہ میرا خیال کچھ ایسا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا ارادہ اس کشور کشائی کا نہ تھا۔ دراصل ابوبکرؓ کی نقطہ نگاہ سے جو چیز زیادہ اہم تھی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شروع کئے ہوئے کام کی تکمیل تھی۔ یہ کام شام کی فتح مکمل کرنے اور ادھر ادھر پھیلے ہوئے عربوں کو رومی اقتدار سے نجات بخشنے سے متعلق تھا۔ ممکن ہے شام کے مسئلہ سے فارغ ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ از خود عراق کی جانب متوجہ ہو جاتے۔ مگر حالات کا اقتضا کچھ اور ہی ہو رہا تھا جیسا کہ آپ کو علم ہے حضرت ابوبکرؓ کو امور سلطنت سنبھالتے ہی یعنی خلافت کے پہلے ہی سال میں ارتداد کے فتنہ سے نبرد آزما ہونا پڑا اور اس سلسلہ میں شمشیر بھی اٹھانی پڑی۔ اس سال آپ نے شام کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ دراصل اس وقت کا اہم مسئلہ تھا، جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور شامی فوج کشی کے پیش نظر حفظ ما تقدم کرنا۔

بحرین میں، ربیعہ کے مرتدوں کی سرکوبی اور اس کی تسخیر میں ابوبکرؓ کا بھیجا ہوا لشکر کامیاب ہوا۔ عین اس زمانہ میں ایک شخص جس کا پہلے بکر بن وائل سے اور پھر بنی شیبان سے تعلق تھا۔ مردے از غیب کی مانند منظر عام پر آیا۔ اس عالی ہمت شخص نے اپنے علاقہ میں اس گروہ کو جو مرتد نہیں ہوا تھا اور اسلام پر قائم رہا تھا قیادت کی تھی۔ اور اس کے بعد اسی شخص نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے خلیج فارس کے ساحل پر مرتدین کا پیچھا بھی کیا تھا۔ اتفاق سے اسے اپنے ارادہ میں کامیابی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس کامیابی سے فکری اور روحانی طور پر تقویت پاتے ہوئے مزعیم آگے بڑھ جاتا ہے اور عراق کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے۔ اب عراق عرب قبائل اسلام کے ظہور سے پہلے ہی پھیل

گئے تھے۔ قدرتی طور پر اس عالی حوصلہ شخص کے اندر عراق کے اندر داخل ہو جانے کی تحریک بیدار ہوتی ہے اور اسے یہ آرزو تڑپانے لگتی ہے کہ پورے عراق کو سلامی اقتدار کے ماتحت کر دیا جائے۔ مگر معاملہ ایسا آسان نہ تھا۔ ایک ایسی زبردست اور خطرناک مہم جنگ کے لیے جس میں سخت معرکہ آرائی کا امکان تھا اور ساتھ ہی مسلمانوں کے لیے طرح طرح کے خطرات بھی تھے۔ خلیفہ اوّلؓ کی منظوری لازمی تھی۔ چنانچہ یہ شخص جس کا نام مثنیٰ ابن حارثہ الشیبانی تھا، مدینہ جا کے حضرت ابو بکرؓ سے ملاقات کرتا ہے۔ اس ملاقات میں مثنیٰ اپنی تمام کارگذاریوں کی رپورٹ رئیس مملکت کے حضور پیش کرتے ہیں۔ مرتد مسلمانوں سے اپنی جنگ اہل فارس کے مکروفریب اور ان کی دوسری دسیسہ کاریوں کے بارے میں تفصیلات عرض کرتے ہیں اور آخر کار حضرت ابو بکرؓ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں ان کی قوم کی امارت عطا فرمائیں اور ساتھ ہی عراق میں داخل ہونے اور اہل عراق کے مجتمع ہو جانے کی صورت میں ان سے جنگ کی اجازت مرحمت کریں۔ یہ بات یقینی سی ہے کہ مثنیٰ نے حضرت ابو بکر کے سامنے مسائل کو اس انداز میں پیش کیا کہ آپ کو عراق کی فتح آسان نظر آنے لگی، یعنی آپ کی نگاہوں میں یہ ایسی مشکل بات نہ رہ گئی۔ مثنیٰؓ نے یہ بھی کہا کہ ان کے قبیلہ یعنی بنی بکر کے بے شمار لوگ عراق میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ وہ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے عند الضرورۃ ان کی مدد سے دریغ نہیں کریں گے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس معاملہ پر بے حد غور و خوض فرمایا۔ اپنے مشیروں سے رائے لی اور مثنیٰؓ کو اجازت دے دی۔ چنانچہ مثنیٰؓ آگے بڑھے اور عراق کو عبور کر لیا۔ ابھی وہ عراق میں داخلی طور پر متصرف نہ ہو پائے تھے کہ انہیں احساس ہوا کہ ایران کی طاقت (جس کا اس زمانہ میں عراق پر جزوی تصرف تھا) بے پناہ ہے مثنیٰؓ کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ اہل ایران عراق کے معاملہ میں ہرگز ہرگز تن بہ تقدیر ہونے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ اور نہ وہ اس بات کی اجازت دیں گے کہ ان کے تحت تصرف علاقے بادہ نشین عربوں کے لیے کھل جائیں تاکہ وہ اس علاقہ پر کوشش کریں اور پھر کچھ عرصہ وہاں قیام کر کے تتر بتر ہو جائیں اور اس طرح جنگ کر کے ایک ایسے علاقے کو ایران کے تصرف سے نکال لیں جس پر ایک زمانہ سے ان کا قبضہ چلا آیا ہے، یہ اسباب تھے کہ مثنیٰؓ کی آمد پر اہل فارس اکٹھے ہو گئے اور ان کے مقابلہ کے لئے سینہ سپر!

خلیفۂ رسول اللہؐ کے علم میں یہ سب کچھ آیا۔ اس کے باوصف آپ نے بجائے اس کے کہ مثنیٰؓ کو واپس بلاتے ان کی مدد کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اس سلسلہ میں خالد بن ولیدؓ کا جو یمامہ کی مہم سے فارغ ہو چکے تھے انتخاب فرمایا۔ آپ نے انہیں (خالدؓ کو) عراق پہنچ کر اسلامی لشکر کی قیادت اور کمان سنبھالنے کا حکم دیا۔ اب مثنیٰؓ کو خالدؓ کے ماتحت ہو کے کام کرنا تھا۔

ادھر حضرت خالدؓ کے ساتھ یہ مصیبت تھی کہ انہوں نے یمامہ کے مشکلات اور خطرات اور وہاں کے آفات سے نبرد آزما ہونے والے لشکر کے اکثر افراد کو اپنے اپنے گھر واپس ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ چنانچہ خالدؓ کے تھکے ہارے لشکر میں اب مشکل سے کوئی دو ہزار سپاہی باقی رہ گئے تھے۔ اسلامی فرماندہ (خالدؓ) نے مرکز سے مدد چاہی تھی جو قعقاع بن عمر کی سرکردگی میں روانہ کر دی گئی تھی۔ خالدؓ کو یہ حکم تھا کہ سپاہی کی حیثیت سے صرف ان لوگوں کی بھرتی کریں جو ہر عالم میں اسلام پر قائم رہے تھے اور مرتدین کے گروہ شکست خوردہ میں سے کسی کو قبول نہ کریں اور کسی کو مجبور بھی نہ کریں کہ وہ ان کے ساتھ ہو لے۔ عین اسی وقت حضرت ابوبکرؓ نے عیاض بن غنم کو دومۃ الجندل روانہ کیا۔ انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ مذکورہ علاقے میں ارتداد کے فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اور اس کے بعد حیرہ کے سلسلے سے عراق میں داخل ہوں، اب اگر وہ خالدؓ سے پہلے پہلے عراق پہنچ جائیں تو وہ امیر لشکر اور خالدؓ ان کے زیر دست ہوں گے لیکن اگر اس کے برعکس اگر خالدؓ پہلے عراق پہنچ گئے تو انھیں خالدؓ کی سرکردگی میں کام کرنا ہوگا۔

خالدؓ کہ اسلام کی تلوار تھے اور مسلمانوں کے ترکش کا وہ تیر جس سے کبھی نشانہ خطا نہ ہوا عراق تک پیش قدمی کرتے رہے، کرتے رہے، یہاں تک کہ عراق پہنچ گئے۔ اور پوری جانفشانی اور جاں سپاری سے جنگ لڑی بلکہ یہیں حد ہی تو کر دی۔ نتیجہ یہ تھا کہ خالدؓ ایرانیوں اور ان کے ماتحت عربوں پر فتحیاب ہو چکے تھے! اس کے بعد خالدؓ اچانک حیرہ کے مقام پر پہنچ گئے اور اہل حیرہ کو صلح پر مجبور کر دیا۔ چند مہینوں میں خالدؓ نے عراق کی فتح کے کام کو مکمل کر لیا۔ اور ایرانیوں پر غالب آ گئے اور انہیں عراق سے مار بھگایا۔ اِدھر عیاضؓ کا یہ حال ہوا کہ

وہ دومتہ الجندل ہی میں رہے اور ان کی بات بالکل پیش نہ کی جا سکی۔ ہاں جب خالد نے ان کی مدد کی تو بات کچھ بنی۔ یوں خلیفتہ الرسولؐ کی مرضی کے مطابق عراق کا کام مکمل ہو گیا اور جیسا کہ میں نے پہلے کہیں اشارہ کیا ہے۔ اسی مہم کے دوران خالدؓ کو بڑے اہم تجربات اور کامرانیاں حاصل ہوئیں۔

یوں، ارتداد سے نمٹ چکنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے تابناک دور میں عراق کی فتح بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ لیکن چونکہ خالدؓ نے شام کی مہم میں مسلمانوں کی مدد کے لئے ایک دستہ بھیجدیا تھا۔ اس لئے عراق اپنے اس اطاعت گذارانہ رویہ پہ قائم نہ رہا اور وہاں بغاوت و سرکشی کے آثار رونما ہو گئے۔ حالات نے اچانک ایسا رُخ اختیار کر لیا تھا کہ ایرانیوں کے عراق پر دوبارہ تسلط پا جانے کے امکانات روشن ہو رہے تھے۔ اہل عراق کی اکثریت نے اپنا عہد توڑ دیا تھا۔ اب مثنیٰؓ (فتح عراق کے محرک) اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ خالدؓ ان کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں اور ان کے ساتھ لشکر کا نصف حصہ خلیفہ کے حکم پر شام کی مہم پر روانہ ہو چکا ہے! اب مثنیٰؓ کے لئے ممکن بھی نہ تھا کہ باقی ماندہ مسلمانوں کی مدد کے بھروسہ پہ فارس اور ان کے عرب نژاد ہیرؤں سے مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ مثنیٰؓ مجبوراً مدینہ لوٹ آئے مدینہ پہنچنے پر مثنیٰؓ نے خلیفتہ الرسولؐ کو بیمار پایا اور ایسا بیمار کہ جو پھر تندرست نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود ابوبکرؓ نے مثنیٰؓ سے ملاقات کی اور ان کی بات سنی اور حضرت عمرؓ کو وصیت فرمائی کہ ان کی مدد کریں (خلیفہ ہونے کے بعد) اور عراق کو کسی حال میں نہ چھوڑیں۔ یوں مسلمان اس جنگ میں پھنس گئے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ابتدا میں یہ بڑی آسان دکھائی دی تھی لیکن بعد میں اس کی دشواریاں نمودار ہوئیں اس جنگ میں خالد بن ولیدؓ تمام آزمائشوں پر پورے اترے۔ مناسب یہ ہوتا کہ خالدؓ بنفس نفیس اسلام کا جھنڈا لئے ایران پہنچ جاتے اور اس وقت دم لیتے جب شاہنشاہان ایران کی قوت بالکل ہی زائل ہو جاتی۔

لیکن اس معاملہ کے اُس وقت ایسا نہ ہونے کا سبب خود ابوبکرؓ ہی نقطۂ نگاہ تھا حضرت ابوبکرؓ کے سامنے یہ بات تھی کہ عراق سے فارغ ہونے سے پہلے پہلے شام سے نمٹ

لیں ۔ تاکہ رسول اللہ صلعم کے ارادے ، پایۂ تکمیل کو پہنچ سکیں اور رومیوں سے آویزش کا جو سلسلہ شروع ہو گیا تھا اس سے نجات حاصل ہو سکے۔

اس کے بعد ہی ، قبل اس کے کہ حضرت ابوبکرؓ شام میں اپنے لشکروں کی حاصل کی ہوئی فتوحات دیکھ سکیں آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے ۔ اب یہ حضرت عمرؓ کا کام تھا کہ ایک طرف عراق کو دوبارہ اسلام کے اقتدار کے تحت لائیں اور دوسری جانب شام کی فتح کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں ۔

باب ۱۰

خالد بن ولید کے کارنامے اور شام کی فتح

جس چیز نے عراق کی فتح مکمل ہونے سے پہلے پہلے حضرت ابو بکرؓ کو سوریہ یا شام کی جنگ کی طرف راغب کر دیا تھا وہ آپ کا یہ عزم تھا کہ شام اور عرب کے مشترکہ حدود کے قریب کے علاقہ کی عرب سرزمین کی حفاظت کی جائے۔ خالد بن سعید بن العاص کو اسی مقصد سے روانہ بھی کیا گیا۔ انھیں یہ حکم تھا کہ بیتماء کے مقام پر مسلمانوں کے لئے ایک حفاظتی دیوار بن کے مقیم ہو جائیں۔ چنانچہ خالدؓ اور ان کے ساتھی منزل مقصود (بیتماء) پر پہنچ گئے۔ ان کے مقابلہ کے لیے شام کے عرب قبائل اور رومی لشکر جمع ہونے شروع ہو گئے لیکن خالدؓ اور ان کے ساتھی دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کو شکست دیدی۔ اب خالد بن سعید کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ جس طرح اس کے نامور ہمنام خالد بن ولیدؓ کو عراق میں کامیابی اور فتح حاصل ہوئی تھی ویسے ہی انہیں شام میں حاصل ہو۔ اسی جذبہ کے ماتحت خالد شام کے اندر داخل ہوتے گئے۔ عربوں یعنی شامی عربوں اور رومیوں نے انہیں ایسا کرنے دیا یعنی شام کے اندرونی علاقوں میں داخل ہو جانے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خالد حدود عرب سے بے حد دور جا پڑے۔ بس پھر کیا تھا، دشمن پلٹ آیا۔ خالد کو گھیر لیا اور ان کے بیٹے سعید کو قتل کر دیا۔ خالد مجبور ہو گئے کہ اپنے ساتھیوں سمیت کسی صورت، موقع سے فرار کر جائیں۔ فرار اس شدومد سے ہوا کہ خالد اور ان کے ساتھی مدینہ کے قریب آکے رُکے۔ جب ابو بکرؓ کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے خالد کو حکم دیا کہ وہ اپنی جگہ سے آگے مت بڑھیں، وہیں رُکے رہیں اور مدینہ تک مت آئیں۔

حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو پہلے ہی خالد کو شام کی مہم پر روانہ کرنے سے باز رکھنا چاہا تھا۔ ان حضرات نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ خالد ایک خودپسند، جلدباز اور ناعاقبت اندیش شخص ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ ہاں جب خالد کو شکست ہوگئی تو حضرت ابوبکرؓ کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے خیراندیشی کی تھی اور خالد بن سعید کو یہ دونوں حضرات بہتر سمجھتے تھے۔

حقیقت کچھ بھی ہو بعد میں حضرت ابوبکرؓ اس بات پر مجبور ہوئے تھے کہ اس شکست کا اثر زائل کردیں۔ چنانچہ آپ نے ایک لشکر تیار کیا جس کے کئی دستے تھے، اور ہر دستہ کی امارت اور قیادت ایک شخص کے سپرد تھی۔ ہر امیر کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ شام کے ایک حصہ کو فتح کرکے اس کی گورنری سنبھال لے۔

امرائیہ تھے۔ عمرو بن العاصؓ کو حکم تھا کہ فلسطین کو فتح کرکے اس کی حکومت سنبھالیں۔

یزید بن ابی سفیانؓ کو حکم تھا کہ دمشق فتح کریں۔

ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو حکم تھا کہ حمص کو فتح کرلیں۔

ہر شخص کو حکم تھا کہ نامزد علاقہ کو پہلے فتح کرے پھر اس کی حکومت سنبھال لے۔

اس سے پیشتر عکرمہ بن ابی جہل نے خالد بن سعید کے لئے فوجی کمک روانہ کی تھی۔ خالد کے فرار ہو جانے کے بعد عکرمہ بن ابی جہل لشکر کو شامی دبدبہ اور رومیوں کے نرغے سے نکال کے دور ہٹ گئے اور شام اور جزیرہ عرب کے حدود پر آکے جم گئے۔

رومی یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب خالد فرار ہو چکے ہیں، اسلامی فوج سرحدوں کی طرف ہٹ چکی ہے مزید خطرہ نہیں رہا لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ابو عبیدہؓ جابیہ (دمشق کے قریب) یزید بن ابی سفیان بلقا، یعنی (دمشق کے ایک دیہات) کے نزدیک اپنی فوجیں لے کے آچکے ہیں اور ہر طرف سے بڑھ بڑھ کر سرحدوں کو عبور کر رہے ہیں تو وہ مسلمانوں سے مقابلہ کے لئے زیادہ مستعد اور چوکنے ہوگئے۔ رومیوں نے ہر اسلامی امیر کے مقابلہ کے لئے ایک زیادہ با زور اور پُر جمعیت لشکر روانہ کیا اب اسلامی قائدین لشکر نے جو دیکھا تو انھیں محسوس ہوا کہ وہ الگ الگ رہ کے رومیوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اب جب ان لوگوں نے آپس میں مشورہ

کیا یعنی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تو عمرو بن العاصؓ کی بات مان لی گئی۔ عمرو بن العاصؓ نے مشورہ دیا تھا کہ سارے اسلامی جیوش ایک میدان میں جمع ہو جائیں ان لوگوں کی تعداد تیس ہزار سے زائد نہ تھی۔ رومیوں کی تعداد جو مقابلہ کے لیے آئی تھی بہت زیادہ تھی بعض اندازوں کے مطابق ڈیڑھ لاکھ چالیس ہزار تھی۔

رومیوں نے جب دیکھا کہ مسلمان ایک میدان میں جمع ہو رہے ہیں تو وہ بھی ایک ہی مقام پر اکٹھے ہو گئے اور مسلمانوں کے بالکل سامنے آکے ٹھہر گئے۔

میں ان روایتوں کو بیان تو کر رہا ہوں لیکن میں انہیں مبالغہ سے خالی نہیں پاتا۔ ہمارے لیے بہت مشکل ہے کہ ہم امراءِ جیوشِ اسلامی کے الگ الگ موقفوں کے بارے میں بیان کردہ اعداد و مقامات کے بارے میں مطمئن ہو جائیں۔ ایک بات ان تمام روایات میں البتہ یقینی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان یرموک کے ایک ساحل پر اکٹھے ہوئے۔ اور رومی دوسرے ساحل پر، اس کے بعد مسلمانوں نے یرموک کو عبور کر لیا اور رومیوں کے بالکل مقابل آگئے۔ راویوں کے قول کے مطابق تین ماہ کی مدت تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے رہے اور ایک دوسرے پر تیر پھینکتے رہے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا کسی لشکر کو بھی دوسرے لشکر میں قتل عام کی جرأت نہ ہو رہی تھی صورت حال کا علم حضرت ابوبکرؓ کو ہوا۔ آپ نے حضرت خالد بن ولید کو حکم دیا کہ عراق میں مقیم اسلامی فوج کے نصف حصہ کو لے کر شام کی جانب پیشقدمی کریں۔

راویوں کا خیال ہے کہ صدیق اکبرؓ نے اس موقع پر یہ فرمایا تھا کہ بخدا میں خالدؓ بن ولید کو بھیجکر رومیوں کے شیطانی وسوسے انہیں بھلا دوں گا۔ یہ طے ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو حضرت خالدؓ کی زبردست صلاحیت پیشقدمی کا احساس تھا۔ آپ کو یہ بھی یقین تھا کہ جب تک اسلامی لشکروں کے ساتھ خالدؓ جانباز نہ آملیں گے وہ مزید کچھ نہ کر سکیں گے۔ لیکن بہرصورت فتح و کامرانی کے لیے مخلصِ نیت اللہ اور رسول کی مرضی کا احساس اور دشمن سے جہاد سچائی اور راست بازی کا اظہار ضروری تھے۔ صدیق اکبرؓ کو یقین کامل تھا کہ اگر مسلمان اسی انداز میں لڑے جس انداز میں وہ رسالت مآبؐ کے عہد میں لڑتے تھے تو وہ یقیناً کامیاب ہوں گے۔

اللہ نے اپنے برحق نبیؐ اور اہلِ ایمان سے ارشاد فرمایا ہے۔

" اب اللہ نے تمہارا بوجھ کم کر دیا ہے۔ اسے اس کا علم ہے کہ تم میں (مادی وسائل) کمی ہے تاہم اگر تم میں سَو آدمی صبر و ثبات اور عزم و ہمت والے موجود ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو وہ دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آ جائیں گے۔ اللہ کی نصرتیں ہمیشہ اُن کے ساتھ ہوتی ہیں جن میں صبر و عزم ہوتا ہے۔" جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لئے اس صورت میں کہ ان کی نیتیں خالص ہیں اور وہ جنگ کی مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہیں، دشمن کی کثرتِ تعداد قطعاً کوئی باعثِ پریشانی امر نہیں۔

طالوت اور جالوت کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے۔ یہ سورہ بقرہ میں ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

" وہ لوگ جن کو یہ خیال تھا کہ انہیں جمال الٰہی نصیب ہوگا اور وہ اللہ سے ملاقات کریں گے کہہ اٹھے کہ اللہ کی مدد صبر و ثبات والوں کے ساتھ ہے اور کتنے ہی کم تعداد والے گروہ زیادہ تعداد والے گروہوں کا مقابلہ میں کامیاب اور فائز المرام ہو چکے ہیں۔"

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد کم اور ان کے اس وقت کے مقابل رومیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ فتح و شکست کا مدار کثرت و قلت پر نہیں صبر و ثبات بلکہ عزم و یقین پر ہے۔ غرض یہ کہ خالدؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہنچ چکے تھے۔ اس میں خالدؓ کو عظیم مصائب سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ شام پہنچنے میں خالدؓ کو ایک ہولناک اور ہلاکت خیز دشت سے گذرنا پڑا تھا۔ جو مطلقاً بے آب و گیاہ تھا۔ اس صحرائے مہیب سے بہ سلامتی گذرنے کے لئے خالدؓ نے یہ کیا تھا کہ اونٹوں کو سیراب در سیراب کر دیا تھا۔ پھر ان کے منہ اور کان وغیرہ خوب کسوا دیئے تھے۔ اب جس وقت صحرا میں گھوڑے یا دوسری سواریاں پیاس سے حد درجہ مضطرب اور قریب المرگ ہونے لگتے تھے۔ ان جفاکش اور خارکش اونٹوں کو ذبح کر دیا جاتا تھا۔ اور ان کے شکموں کو چاک کر کے پانی نکال لیا جاتا تھا اور پیاسے جانوروں کو سیراب کر دیا جاتا تھا۔ گوشت آدمی کھا جاتے تھے۔ جس وقت خالدؓ مسلمانوں کے لشکروں سے جا ملے تو ان کی آمد اپنے جلو میں ایک نیا ولولہ نیا عزم لے کر آئی۔ آتے ہی خالدؓ نے لشکروں کو ایک

فرمان دہی اور قیادت کے نیچے، ایک جھنڈے تلے، جمع ہو جانے کا مشورہ دیا۔ البتہ طے یہ پایا کہ ہر روز ایک ایک امیر پورے لشکر کی قیادت کرے گا حضرت خالدؓ نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ پہلے دن ان ہی کو امیر لشکر کل بنایا جائے میں اس بات کو یوں سمجھتا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ نے پورے لشکر کی کمان خالدؓ کے سپرد کرنے کے بعد ہی ان کو بھیجا تھا۔ تو گویا لشکروں کی یہ نئی تنظیم اور ان کی یہ نئی وحدت ابوبکری احکام کے بعد ظہور پذیر ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ہر امیر کا اپنا حق بھی محفوظ رکھا گیا تھا۔ جس وقت خالدؓ شام پہنچے اور تمام لشکر ان کے جھنڈے تلے جمع ہوئے تو وہ قائد عام ہو گئے۔ اب انہوں نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک تمام فوجی دستے جمع نہ ہو گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اپنی سخت اور سنگین مہم سر کی کہ اس سے پہلے عرب کی تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ اسلامی لشکر نے بہت بھاری بھاری اور دبیز اور بھرا ؤ قسم کے گھوڑوں کے جسم سے ملتی جلتی شکلیں تیار کیں اور انہیں کھینچ کھینچ کے دشمن کی فوج کو مارا غرض ہزار آفتیں اور مصیبتیں تھیں لیکن اس کے بعد مسلمان فتح یاب ہو چکے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شام کے اصل فاتح خالد بن ولیدؓ ہیں

مگر افسوس۔ ابوبکر صدیقؓ کے لئے اتنی بھی فرصت زندگی باقی نہ رہ گئی تھی کہ وہ اس نصرت و فتح پر شادمانی کا اظہار کر سکتے۔ وہ بیمار پڑے پھر اسی میں جان بحق تسلیم ہوئے۔ اب حضرت عمرؓ کے دور کی ابتدا ہو چکی تھی۔ آپ نے لشکر کو حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کی خبر اور خالدؓ کے بجائے ابو عبیدہؓ کی قیادت لشکر کا حکم دونوں ایک ساتھ بھجوائے۔ خالدؓ کو لشکر کی قیادت سے معزول کر دیا گیا تھا۔

راویوں کا خیال ہے کہ خلیفہ دومؓ کا قاصد رات کو پہنچا تھا اور رات ہی کو اس نے ابو عبیدہؓ کو ان کی نئی حیثیت کی اطلاع دے دی تھی۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے اس خبر کو پوشیدہ رکھا اور فوراً خالدؓ کو نہیں بتایا۔ اس خیال سے کہ مبادا لشکر کے اندر برہمی پیدا ہو جائے، خالدؓ کو بھی اس واقعہ معزولی کا علم اس وقت ہوا جب مسلمان جیت چکے تھے اور دمشق کی راہ کھل چکی تھی۔

باب ۱۱

صدّیقِ اکبرؓ کی دیانت

خلافتِ صدیقی کی مدّت دو سال اور چند ماہ رہی۔ راویوں میں مہینوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ اسلامی خلفا میں کوئی ایک شخص اتنی قلیل مدّت میں اتنا کچھ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جس وقت حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوتا ہے تو آنحضرت کے دورِ مبارک کی طرح جزیرہ نمائے عرب از سرِ نو اسلام کے دائرہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اپنے پورے دور میں اس جلیل القدر پیشوا نے صبر اور سچائی اور عزم اور ضبط کا زبردست ثبوت دیا تھا۔ ابوبکری لشکروں نے بوجہ احسن ارتداد کے فتنے کو ختم کیا۔ مرنے سے پہلے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے انھیں مسلمانوں کو ایران کی شہنشاہیت سے ٹکرا دیا اور نتیجہ کے طور پر مسلمان عراق عرب پر قابض ہو گئے اور اگر حضرت ابوبکرؓ صرف چند ماہ اور جیئے ہوتے تو وہ اس اطمینان کے ساتھ۔ اس تسکین کے ساتھ، عازم فردوس بریں ہوتے کہ ان کے لائق اور جری سپاہیوں نے رومیوں کو پیچھے دھکیل کر قیصر کے لشکر کو سرنگوں کر دیا۔ ادھر شام کے سارے راستے مسلمانوں کے لئے کھل چکے تھے جہاں وہ اب آزادانہ چل پھر رہے تھے اور زمین شام کو مسلمانوں کے لئے رومیوں سے لے رہے تھے۔ ان سے چھین رہے تھے۔

اس فتح کی شادمانی اور اس کے تتمہ کے طور پر مزید مسائل اور خطرات کے نبرد آزما ہونا۔ یہ سب کچھ ابوبکرؓ کے لئے میسر نہ ہو سکا۔ یہ سب مقدر تھا ان کے جانشین خلیفہ کے لئے۔ عمر بن الخطاب کے لئے! اب تک حضرت ابوبکرؓ کی جنگی سیاست پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ابتدا میں تو ان کا دورِ خلافت جزیرہ عرب میں جنگ کے مطالبات کا دور ثابت ہوا تھا

اور اس کے بعد ہی شام اور عراق میں، ابھی تک انھیں اپنی داخلی سیاست یعنی عربوں کے اسلام کی طرف پلٹ آنے کے بعد، ان کے بارے میں طرز عمل کے تعین کی فرصت نہ مل سکی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کی تمام سیاست ان کی افتتاحی تقریر کے پہلے جملہ میں مرکوز تھی "میں آنحضرتؐ کی کامل تقلید کروں گا، جدت اور اجتہاد یا نئے تجربات سے گریز کروں گا" جنگ میں تدبیر حرب میں، قرابین اور احکامات کے اجرا میں ہر معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ نے اپنے اوپر آنحضرتؐ کی مطلق اتباع لازمی کر لی تھی۔

جہاں تک مدینہ کا تعلق تھا اور اس شہر کے معاملات کا حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ کی مدد سے انہیں خود ہی اپنی نگرانی میں لیتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ مدینہ کے تمام امور میں مطلق طور پر قوت قضائیہ تھے۔ یعنی مقدمات وہی فیصل کرتے تھے لیکن عجیب بات ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے کوئی مقدمہ ہی پیش ہی نہیں ہوا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ کچھ حضرت ابوبکرؓ ہی محض آنحضرتؐ کی راہ پر گامزن نہ تھے تمام اہل مدینہ اسلام کے راستہ پر گامزن تھے ان کی روش میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ پھر آپس کے جھگڑوں کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا حضرت ابوبکرؓ شہر کے باہر ایک پھونس کے مکان میں قیام کرتے تھے۔ خلافت کے بعد وہ اس مکان میں چھ مہینے اور رہے معمول یہ تھا کہ روز صبح وہ امور مملکت وحکومت کی نگرانی کے لئے مدینہ آجاتے تھے۔ ان کے لئے نمازوں کا جماعتی انتظام فرماتے تھے اور پھر شام کو واپس ہو جایا کرتے تھے۔ اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے کے لئے۔

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اس خاص قبیلہ انصار میں جہاں آپ سنخ کے مقام پر ایک مکان میں رہتے تھے، اونٹنیوں اور بھیڑ بکریوں کا دودھ دوہا کرتے تھے۔ خلافت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد ایک دن آپ آپ کیا سنتے ہیں کہ ایک لڑکی یہ کہہ رہی ہے، ارے اب تم ہمارے جانوروں کا دودھ کیوں نہیں دوہتے؟ آپ نے فرمایا۔ بخدا میں اب بھی اس شغل کو جاری رکھوں گا۔ مجھے پوری پوری امید ہے کہ خلافت کے باوجود میرے طرز عمل میں ادنیٰ سی بھی تبدیلی نہ واقع ہو گی یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا اور کچھ عرصہ بعد حضرت ابوبکرؓ مدینہ کے اس مکان

میں آ گئے جو آنحضرتؐ نے آپ کو عنایت فرمایا تھا۔ اسی مکان میں آپ تادمِ مرگ مقیم رہے۔ خلافت کے باوجود آپ نے اپنا کاروبار دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ جیسا کہ آنحضرتؐ کے دور میں آپ کا مشغلہ تھا لیکن امت کے عام مسائل اور سب سے بڑھ کر عربوں سے جنگ کے مسائل مانع آ گئے۔ چنانچہ مسلمانوں نے آپ کے لئے اور آپ کے اہل و عیال کے لئے ایک رقم مقرر کر دی۔

بعض راوی کہتے ہیں کہ آپ کے لئے شروع میں دو ہزار درہم سالانہ مقرر ہوئے تھے جو بعد میں آپ کے کہنے پر اڑھائی ہزار درہم ہو گئے تھے۔ بعض دوسرے راوی کہتے ہیں کہ شروع میں اڑھائی کی تجویز تھی جو بعد میں تین ہزار درہم سالانہ ہو گئے تھے۔

جس وقت آپ کو اپنی موت کا آنا یقینی سا معلوم ہوا آپ نے ساری رقم بیت المال میں واپس کر دیں۔ اس کے لئے آپ نے اپنی مملوکہ زمین حکومت کو دیدی۔ تمام راویوں کا بیان ہے کہ حکومت کی جانب سے صدیق اکبرؓ نے ایک غلام، یا ملازم لڑکا ایک دودھ دار اونٹنی اور ایک پانچ درہم قیمت کی قبا (جسے آپ اپنے اوپر ڈال لیتے تھے) لے لئے تھے۔ بس۔ جوں ہی آپ کو یقین ہو چلا کہ آپ اپنی بیماری سے جانبر نہ ہو سکیں گے آپ نے یہ تمام اشیاء بھی اپنے خلیفہ مابعد کو لوٹا دیں۔ جس وقت حضرت عمرؓ کو یہ اشیاء لوٹائی گئیں تو انھوں نے روتے ہوئے فرمایا تھا کہ ابو بکرؓ نے اپنے جانشینوں کے لئے بڑا ہی کٹھن معیار پیش کر دیا ہے۔ داخلی سیاست میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی روشیں تقریباً ایک سی تھیں۔ دو امور میں البتہ فکر و نظر کا اختلاف تھا۔

پہلی بات یہ تھی۔ ارتداد کے فتنہ کو دبانے کے سلسلہ میں جو جنگیں ہوئی تھیں یا عراق میں جو فوج کشی ہوئی تھی۔ اس سے حاصل شدہ مالِ غنیمت کے معاملہ میں قائدین لشکر سورۃ الانفال کی آیت ۴۱ کے احکامات کو سامنے رکھتے تھے۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے۔

"اور جان رکھو کہ جو چیز تم کفار سے لوٹ کر لاؤ اس میں سے پانچواں حصہ خدا کا اور اس کے رسول کا اور اہل قرابت کا اور یتیموں کا اور مسافروں کا ہے۔ اگر تم خدا پر اور اس نصرت پر ایمان رکھتے ہو جو حق و باطل میں فرق کرنے کے دن یعنی جنگِ بدر

میں جس دن دونوں فوجوں میں مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ اپنے بندے محمدؐ پر نازل فرمائی اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔"

چنانچہ مالِ غنیمت کے پانچ حصوں میں چار حصے اہلِ لشکر میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ کبھی کبھی غیر معمولی کارنامے انجام دینے والوں کو پانچویں حصہ میں سے بھی کچھ دیا جاتا تھا۔ بقیہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آجاتا تھا آپ اس کو تمام مسلمانوں پر، مردوں، عورتوں، آزادوں اور غلاموں سب پر مساوی تقسیم فرمادیتے تھے۔

جس وقت حضرت ابوبکرؓ سے ان بزرگوں کے بارے میں، جنہوں نے اسلام لانے میں دوسروں پر سبقت حاصل کی تھی اور آنحضرتؐ کی قیادت میں لڑے تھے، گفتگو کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ انہیں تو اللہ اجر دے گا۔ دنیا تو مل ہی جاتی ہے لیکن حضرت عمرؓ نے عطیات اور وظائف کا نظام قائم کر کے اس روش سے انحراف کیا تھا۔

ایک اور بات بھی تھی۔ عراق اور شام میں حضرت ابوبکرؓ نے صرف ان مسلمانوں کو لڑنے کے لئے بھیجا تھا جو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اسلام پر قائم رہے تھے اور مرتد نہ ہوئے تھے جو لوگ مرتد ہو چکنے کے بعد اسلام لے آئے تھے انہیں کچھ تو سزا کے طور پر اور کچھ خدشات کے پیش نظر، حضرت ابوبکرؓ اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اسلام کی فتوحات میں شریک ہوں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے اس حکم کو بعد میں قائم نہیں رہنے دیا۔

حضرت ابوبکرؓ ایک مسلمان کی صفات سے متصف تھے اور کسی بات میں ان کو کوئی خاص امتیاز نہ تھا۔ چنانچہ جب کچھ لوگوں نے آپ کو "خلیفۃ اللہ" کہہ کے پکارا تو آپ نے تصحیح اور تصریح کر دی۔

"میں خلیفۃ اللہ نہیں ہوں۔ فقط اللہ کے رسول کا خلیفہ (نائب) ہوں"

حضرت ابوبکرؓ کا دور اس طرح کٹ گیا کہ آپ بھی ملت کی عمومی اطاعت شعاری سے مطمئن رہے اور ملت بھی آپ کی قیادت سے راضی رہی۔ کبھی کسی مسلمان نے آپ کے احکام کی خلاف ورزی نہ کی تھی مسلمان آپ سے اور آپ مسلمانوں سے راضی رہے۔

ایک اور چیز جس پر محدثین اور علماء کا اتفاق ہے یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے، تھوڑے

تردد کے بعد، قرآن کے جمع کرنے کا مشورہ حضرت عمرؓ سے قبول فرمایا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے تردد اس لئے کیا تھا کہ آنحضرتؐ کے دور میں قرآن جمع نہ ہوا تھا اور آپ کو (حضرت ابوبکرؓ کو) آنحضرتؐ کی مکمل اتباع اور تقلید مقصود تھی۔

مسیلمہ سے جنگ کے دوران بارہ سو اصحاب رسول شہید کر دیئے گئے تھے۔ ان مقتولین میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جن کے سینوں میں قرآن مکمل یا نامکمل طور پر محفوظ تھا۔ جب قرآن یاد رکھنے اور اس کی تلاوت کرنے اور حفظ کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت یوں قتل کر دی گئی تو حضرت عمرؓ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ ممکن ہے دوسرے جنگی مواقع پر حفاظ سب کے سب یا ان کی بہت بڑی تعداد ختم ہو جائے اور ان کے مارے جانے کے ساتھ ساتھ قرآن کا اکثر حصہ ان کے ساتھ چلا جائے تلف ہو جائے۔ اب حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ قرآن کی آیات کی شیرازہ بندی شروع کر دیں تاکہ اس کے کسی حصہ کو محض کسی خاص اہل قرآت کے شہید ہو جانے سے مٹ جانے کا خطرہ نہ لاحق ہو جائے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس میں پس و پیش بھی ہوا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے اس باب میں اتنا اصرار کیا کہ خلیفۃ الرسولؐ کو قائل ہونا ہی پڑا۔ روایت محدثین و علمائے قرآن کے مطابق مشورہ عمرؓ قبول کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے زید بن ثابتؓ کو جو ایک ذی عقل اور تندرست نوجوان تھے اور مدینہ میں آنحضرتؐ کے کاتب وحی تھے، بلا کے قرآنی آیات ایک جگہ اکٹھی کرنے کا حکم دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی طرح حضرت زیدؓ نے اس میں اس نقطہ نگاہ سے کہ یہ آنحضرتؐ کا فعل نہ تھا، تردد کیا لیکن اب شیخین نے زید بن ثابتؓ کو اس امر پہ آمادہ کر لیا اور اس میں مضمر، اسلام اور مسلمین کے فوائد ان کے سامنے پیش کئے۔ اب زیدؓ اس عظیم اور گراں ذمہ داری کو قبول کر چکے تھے، چنانچہ اب زیدؓ نے قرآنی آیات کو، جو سینوں میں (سینہ ہائے مردم عرفاں میں) منتشر تھیں جمع کرنا شروع کر دیا تھا کسی بھی آیت کی عبارت اور اس کے متن کو زیدؓ صرف اس شکل میں قبول کرتے تھے، جب کم از کم دو مختلف اصحاب نبیؐ اس متن اور اس نص کو بعینہٖ اور یکساں بیان کر دیں۔ زیدؓ نے پتھروں کی سلوں اور اونٹ کی پشتوں اور کھجور کی کھالوں سے قرآن کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ قرآن انھیں چیزوں پر لکھا جاتا رہا تھا۔ زیدؓ اس کام کو عہد ابوبکرؓ یا شاید عہد عمرؓ میں مکمل کر سکے۔ گویا یوں وہ پہلا مصحف یا صحیفہ تیار ہوا جس کی رو سے قرآن لکھا گیا۔

یہ مصحف (یعنی قرآنی آیات کا پہلا مکمل مجموعہ) ابوبکرؓ کی عہد میں مکمل ہو گیا، تو یہ ان کے پاس محفوظ رہا۔ اس کے بعد یہ حضرت عمرؓ کے پاس آگیا یعنی ان کی امانت میں آگیا۔ حضرت عمرؓ کے قتل ہو جانے پر یہ مصحف ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس آگیا۔ اب حضرت عثمانؓ جب خلافت کے بار کو اٹھائے ہوئے سامنے آئے اور آپ نے چاہا کہ مختلف صوبوں میں مصحفوں کے نسخے روانہ کر دیئے جائیں تو آپ نے اس مصحف کا مطالبہ حضرت حفصہؓ سے کیا۔ آپ نے (حفصہؓ نے) اس مصحف کو خلیفہ ثالث کے حوالہ کر دیا۔ اسی مصحف پر بعد میں تمام لوگوں نے جنہوں نے قرآن کی کتابت کی، اعتماد کیا۔ گویا اس مصحف کی حیثیت سند کی سی ہو گئی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مصحف جسے زید بن ثابتؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے جمع کیا تھا۔ ابھی تک منظر عام پر نہ آیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ شیخین کے پاس محفوظ تھا یا تنہا حضرت عمرؓ کے پاس اور ان کے بعد حضرت حفصہؓ کے پاس۔ اس مصحف کی اشاعت اس وقت ہوئی جب عثمانؓ کے حکم سے اس کے نسخے نقل کئے جانے لگے۔

خود زید بن ثابتؓ نے ان لوگوں میں شریک تھے جنہوں نے ان مصحفوں کے نسخے نقل کئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابوبکرؓ کی عہد میں جمع اور تالیف قرآن کا مقصد یہ تھا کہ قرأت کا اختلاف باقی نہ رہے۔ یہ کہنا غلط ہے۔ کیونکہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کے دور میں اس مصحف کو عام استفادہ کے لئے پیش ہی کب کیا گیا تھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ اس جمع آوری سے مقصد یہ تھا کہ قرآن، اپنے حافظوں اور کاتبوں کے ساتھ ساتھ، ضائع نہ ہو جائے۔ البتہ وہ مصحف جسے عام استفادہ کے لئے مختلف صوبوں میں اور اضلاع میں بھیجا گیا وہ وہی تھا جسے عثمانؓ نے بھجوایا تھا اسے مصحف امام بھی کہتے ہیں۔

باب ۱۲

حضرت ابوبکرؓ کے آخری ایام

ہجرت کے تیرھویں سال، جمادی الآخر کے آخری ہفتہ میں حضرت ابوبکرؓ بیمار ہو جاتے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ آپ نے ایک دن جب بہت ٹھنڈ تھی نہا لیا تھا اور آپ کو حرارت سی ہو گئی تھی۔ حرارت نے بخار کی شکل اختیار کی۔ مرض بڑھتا ہی گیا اور دفعتہً اس نے ایسی شکل اختیار کر لی کہ حضرت ابوبکرؓ کو احساس ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ موت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ آپ کو مشورہ دیا گیا کہ کسی طبیب کو بلا بھیجیں لیکن ابن سعد کی روایت کے مطابق آپ نے مشورۂ دوا دینے والے چارہ گروں کو یہ حکیمانہ جواب دیا کہ اس نے (یعنی ظاہری معنوں میں دنیاوی طبیب نے لیکن دراصل طبیب حقیقی، خدا نے) آپ کو دیکھ لیا ہے! اور اب وہ اسی طبیب کی مرضی کے مطابق عمل کریں گے۔ تو گویا حضرت ابوبکرؓ نے یہ پسند نہیں کیا کہ آپ کو کوئی گوشت اور پوست کا بنا ہوا طبیب دیکھنے آئے۔ آپ نے بیماری کا معاملہ کلیتہً اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ آخر یہ وہی حضرت ابوبکرؓ تو ہیں جو عافیت کے دور میں اپنی ہر بات خدا کو سونپ دیتے تھے۔ یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت ابوبکر کا انتقال زہر خورانی کے سبب ہوا۔ اس روایت کی رو سے گویا کسی یہودی نے آپ کے پاس زہریلا ہوا کھانا بھجوایا تھا اور مشہور عرب طبیب الحارث بن کلدہ بھی اس کھانے میں شریک ہوا تھا لیکن جوں ہی طبیب کو احساس ہوا کہ کھانا زہر آلود ہے، اس نے حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا کہ وہ اس کھانے سے ہاتھ کھینچ لیں۔ پھر یہ کہا کہ یہ زہر ایک برس

کے اندر اپنا رنگ دکھلائے گا اور وہ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں ایک سال کے بعد ایک ہی دن جام مرگ نوش کریں گے۔

یہ روایت ناقابل اعتبار ہے۔ اگر اس میں صحت ہوتی تو حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے بعد حضرت عمرؓ یقیناً زہر آلود کھانا بھجوانے والے شخص کو سزائے لازمی دیتے جس نے ایک ذرا سی تدبیر سے دو آدمیوں کی جانیں لے لی تھیں۔ اور اس شخص کا جرم اس بات کے پیش نظر کہ مقتولوں میں سے ایک شخص خود خلیفۃ الرسول اللہ تھا اور زیادہ سنگین ہو جاتا تھا۔ ظاہر ہے اگر ایسی بات ہوئی ہوتی تو حضرت عمرؓ تو کسی قیمت پر اس معاملہ کو نہ چھوڑتے۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ بیماری کے دوران، حضرت عائشہؓ نے اپنے والد ماجد (حضرت ابوبکرؓ) کی تیمارداری کے فرائض انجام دیئے تھے۔ اور قدیم عربی شاعر کا ایک شعر پڑھا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ:

"جس وقت کسی شخص کے بُرے دن آتے ہیں تو اس وقت نہ اس کی دولت کام آتی ہے نہ ثروت"

یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا، ام المومنین ایسا مت کہیئے بلکہ غالب اور جلیل اور بزرگ خدا کا قول یاد رکھیئے

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ، ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ

یعنی: (آخر) موت کی شدت (اپنی تمام مردانگیوں کے ساتھ) آ ہی گئی۔ اور یہ وہی شدت الم اور ایذائے زہرہ گداز ہے جس سے تو بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔

اس بیماری کے دوران، حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ سے مطالبہ کیا کہ وہ آپ کے دیئے ہوئے تمام سازوسامان، آپ کو واپس کر دیں تاکہ جب آپ کا ترکہ ورثہ میں تقسیم ہو تو کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے ارشاد فرمایا تھا کہ حضرت عائشہ کے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ چونکہ حضرت عائشہؓ اس وقت تک صرف اپنے دو بھائیوں عبدالرحمٰنؓ اور محمد بن ابی بکرؓ اور ایک بہن حضرت اسماءؓ ذات النطاقین ہی سے واقف

تھیں حضرت اسماءؓ وہ جری اور شیر دل خاتون ہیں جو بھیانک اور وحشت زا راتوں میں اپنے والد اور آقائے دوجہاںؐ کے لئے غار ثور تک کھانا پہنچایا کرتی تھیں اور یہ سب اس نازک موقع پر جب تمام اہلِ مکہ آنحضرتؐ کی جان گرامی کے درپے تھے۔ ایک موقع پر حضرت اسماء نے ناشتہ کا سامان اپنی کمر کی پیٹی کی دو دھجیاں بنا کے باندھ لیا تھا۔ اسی مناسبت سے آنحضرتؐ نے آپ کو ذات النطاقین کا لقب دیا تھا۔ نطاق یعنی طوق کمر یا کمر بند۔ بعد میں یہی حضرت اسماءؓ آنحضرتؐ کے اہل بیت اور قرابت داروں میں بھی ہو گئیں کیونکہ رسالتمآبؐ نے آپ کی چھوٹی سوتیلی بہن ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مدینہ میں عقد فرمایا۔ غرض حضرت عائشہؓ اپنی کسی دوسری بہن سے واقف نہ تھیں۔ اسی لئے آپ نے اپنی دوسری بہن کے بارے میں دریافت فرمایا تھا حضرت ابوبکرؓ نے جنہیں اس باب میں یہ القاء سا ہو گیا تھا کہ ان کی اسماء بنت عمیس سے ہونے والی اولاد اناث میں سے ہوگی، فرمایا تھا کہ یہ بہن اس وقت اسماء بنت عمیس کے بطن میں ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اس وقت اسماء بنت عمیس حاملہ تھیں اور حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد ان کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس لڑکی کا نام ام کلثوم بنت ابوبکرؓ ہوا اسی بیماری میں حضرت عائشہؓ کے والد ماجد نے انھیں یہ وصیت فرمائی کہ مرنے کے بعد انھیں ان دو طیب و طاہر کپڑوں میں غسل دیا جائے جنہیں پہن کر وہ نماز ادا فرماتے تھے اور جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر کے سامنے یہ بات پیش کی کہ انھیں نئے کپڑے کا کفن دیا جائے تو اس جلیل المرتبت اور عالی وقار مرد قلندر نے جس نے ابھی ابھی عرب میں فتنوں کی کلائی مروڑی تھی اور شام و عراق کے شیروں پر اس غیور و باخدا مسلمان قوم کو چھوڑا تھا جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا ۔

"نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا"

جواب دیا کہ بہتر تو یہ ہے کہ نئے کپڑے زندوں کے کام آئیں۔ مردوں کو نئے کپڑے دیئے بھی گئے تو کیا، آخر کو تو یہ حشرات الارض کی غذا بنیں گے! وصیت پوری ہوئی خلیفۃ الرسولؐ کو انہیں پرانے کپڑوں میں لپیٹ دیا گیا۔ بعض راویوں نے البتہ یہ لکھا ہے کہ ان کپڑوں میں ایک نئے کپڑے کا اضافہ بھی کر دیا گیا تھا۔

حضرت عائشہؓ کے بیان کے مطابق ان کے گرامی قدر والد کی طیّب روح مغرب و عشاء کے درمیانی وقت میں پرواز کناں ہوئی (پیر) دوشنبہ کا دن تھا۔ تیرھویں سن ہجری کا جمادی الآخر کا مہینہ تھا اور اس کی بائیسویں تاریخ تھی۔ سب راوی اس بات پر متفق ہیں کہ وفات کے وقت اس عاشق و خلیفۃ الرسولؐ کا وہی ترسیٹھ سال کا سن تھا۔ اتفاقاً اسی سن میں آفتاب رسالت بھی غروب ہوا تھا۔ صحیح روایات کی رو سے حضرت ابوبکرؓ کی تدفین رات کو عمل میں آئی۔ آپ حضرت عائشہؓ کے مکان میں آنحضرتؐ کی قبر اطہر کی بغل میں محو خواب ابد ہوئے حضرت عمرؓ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

باب ۱۲

حضرت ابوبکرؓ کا آخری کارنامہ

سب سے بڑی خدمت جو آنحضرتؐ کے بعد کسی ایک شخص نے اسلام اور مسلمانوں کی انجام دی، وہ وہی تھی جو حضرت ابوبکرؓ نے اپنی اس بیماری کے دوران انجام دی جو آخرکار ان کے لئے پیغامِ مرگ ثابت ہوئی، اور یہ عظیم خدمت آپ کا حضرت عمرؓ جیسی شخصیت کو اپنے بعد خلافت اور امارت کے لئے نامزد کر جانا تھا!

خلافت کے لئے اس نامزدگی کے باب میں مختلف روائتیں بیان ہوئی ہیں بعض راوی اس خیال کے حامی ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس (فیصلہ کن اور تاریخی) نامزدگی سے پہلے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے، جس میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ، عثمان بن عفانؓ، سعید بن زید بن نفیلؓ ممتاز تھے ہمشورہ بھی کیا تھا۔ اور سب نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ یعنی سب نے اسے پسند کیا تھا کہ آپ کے بعد حضرت عمرؓ امام ہوں۔ بعض راوی یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنا فرمان حضرت عثمانؓ کو املا کرا دیا تھا لیکن املا لکھواتے وقت جب آپ اس مقام پر پہنچے "میں نے تم لوگوں کے خلیفۃ المسلمین کے عہدے کے لئے"..... تو آپ پر غشی طاری ہو گئی، حضرت عثمانؓ کو خیال پیدا ہوا کہ یہ غشی اب حضرت ابوبکرؓ کو بیدار نہ ہونے دے گی اور آپ ابدی نیند سو جائیں گے اس لئے آپ نے اپنی طرف سے فرمان میں عمر بن الخطابؓ کے الفاظ، بڑھا لئے، ادھر جب حضرت ابوبکرؓ کو قدرے افاقہ ہوا اور غشی کی وہ کیفیت زائل ہوئی تو آپ بولے "ہاں ذرا پڑھنا تو سہی کیا لکھا تم نے" حضرت عثمانؓ نے فرمان پڑھ کر سنا دیا اور جب حضرت ابوبکرؓ نے

عمر بن الخطاب کا نام پڑھا جاتے سنا تو آپ نے فرط مسرت سے اللہ اکبر کہا اور حضرت عثمان کو دعائے خیر عنایت فرمائی اور فرمایا: "تم شاید یہ سمجھتے تھے کہ ابوبکر دوبارہ نہ بول سکیں گے۔ بہرحال روایت مذکورہ کی رو سے حضرت ابوبکرؓ نے فرمان کا بقیہ حصہ بھی املا کرا دیا۔ ابن سعد نے اپنے شیوخ سے روایت کرتے ہوئے فرمان کا متن حسب ذیل بتایا ہے۔

عنایت فرما اور کرم گستر پروردگار کے نام نامی سے شروع کرتے ہوئے۔

اب جبکہ میں، ابوبکر ولد ابو قحافہ، اس منزل سے گذر رہا ہوں اور ان لمحات سے نبرد آزما ہوں، جن میں کافر بھی ان باتوں پر یقین کرنے لگتے ہیں جن سے انہوں نے انکار کیا تھا، اور عصیاں شعار عمل پر بھی حقائق آشکار ہو جاتے ہیں اور حقائق جھٹلانے والے تک آمادۂ تصدیق ہو جاتے ہیں، یعنی انھیں بھی سب کچھ نظر آنے لگتا ہے اور اب جبکہ میں دنیا سے جس سے اب میرا تعلق ختم ہو رہا ہے۔ آخری اور آخرت کی زندگی میں داخل ہوتے ہوئے اس سے پہلا عہد کر رہا ہوں (کیونکہ اس کے بعد دنیاوی امور میں میں مطلق مداخلت نہ کر سکوں گا اور میری آخرت کی زندگی شروع ہو جائے گی) میں اپنے بعد تمہارے لئے خطاب کے بیٹے عمر کو خلافت کے منصب کے لئے نامزد کرتا ہوں۔ تمہارا فرض ہے عمر کی بات سنو اور ان کے احکامات کو بجا لاؤ۔ عمر کا نام پیش کرتے وقت سامنے اللہ، رسول اللہؐ، اسلام، اُمت اور خود اپنی اُخروی بھلائی کا خیال ہے جہاں تک میرا مشاہدہ اور تجربہ اور قیاس ہے عمرؓ عدالت گستری کریں گے۔ لیکن (خدانخواستہ) اگر وہ خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد بدل گئے تو میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ عصیاں شعار اور خطاکار اپنے کئے کی سزا بھی پاتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرے سامنے ملت کا مفاد ہے، البتہ میں غیب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ جو لوگ بھی زیادتی اور ستم رانی سے کام لیں گے انھیں انجام کار اس کا بدلہ مل ہی جائے گا۔ میں تمہارے لئے اللہ کی مہربانیوں اور پرامن زندگی کا خواہاں ہوں۔"

راویوں نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ اس فرمان کو لے کے جس پر مہر خلافت لگی

ہوئی تھی مسجد نبوی تشریف لائے جہاں پہلے سے ایک مجمع فرمان کا منتظر بیٹھا تھا۔ ان لوگوں سے عثمانؓ نے کہا، خلیفۃ الرسولؐ (مراد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ) نے آپ لوگوں سے اور اکابر صحابہ سے استصواب کر دیا ہے کہ آیا آپ لوگ اس کو اپنا خلیفہ اور امام مفترض الطاعۃ تسلیم کر لیں گے جس کی اس فرمان میں سفارش ہے لوگوں نے اثبات میں جواب دیا۔ راوی لکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں فوراً قیاس آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، لیکن روایت کی رو سے حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا "ہم پہلے ہی سمجھ گئے، اس فرمان میں عمرؓ کا نام لکھ کر آیا" چند راویوں نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ یہ جاننے کے بعد کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو خلافت کے منصب کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ بعض مہاجر صحابہؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی توجہ حضرت عمرؓ کی سخت گیری کی طرف منعطف کرائی، لیکن اس کے جواب میں حضرت ابو بکرؓ نے پورے وثوق سے فرمایا کہ اس انتخاب میں ان کے پیش نظر اسلام کی فلاح تھی اور وہ (حضرت عمرؓ) کو اس منصب کے لئے سب سے زیادہ موزوں شخصیت سمجھتے ہیں۔

مجھے ان سب روایات پر بالکل اعتبار نہیں، دراصل جس طرح حضرت ابو بکرؓ کی خلافت سے متعلق بے شمار روائتیں بیان ہوئی ہیں، اسی طرح حضرت عمرؓ کی خلافت کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہوتی ہیں اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ میرے نزدیک صرف ایک چیز یقینی ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے مرض الموت میں حضرت عمرؓ کو خلیفہ ضرور نامزد کیا۔ اس سے پہلے میں نے کہیں لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کی اس نامزدگی سے مسلمان ہرگز اس بات کے پابند نہیں ہو گئے تھے کہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ تسلیم ہی کر لیں؛ دراصل اسلام میں خلافت کا مسئلہ اس درجہ اہم ہے کہ خواہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا ہو۔ خواہ وہ ابو بکرؓ ہی کیوں نہ ہو وہ اپنی جگہ پر اس سلسلہ میں کوئی آخری فیصلہ نہیں کر سکتا یہ مسئلہ امت اور امت کے ذہین فکر کے حل کرنے کا ہوتا ہے اور اس دور میں ظاہر ہے مہاجرینؓ اور انصارؓ ہی ملت کے اہل فکر اور اہل بصیرت تھے حضرت عمرؓ کی نامزدگی ایک قسم کی سفارش تھی جو حضرت ابو بکرؓ نے امت کی بھلائی کے پیش نظر کی تھی اب امت اس بات میں قطعاً مختار تھی کہ چاہے تو اس مشورہ کو قبول کرے اور

چاہے تو اسے رد کر دے اور اگر اس دور میں حضرت ابوبکرؓ کی یہ سفارش قبول کر لی گئی تھی تو اس کا سبب یہ تھا کہ قوم کو آپ کی ذات پر اعتماد تھا، وہ آپ سے محبت کرتی تھی اور اسے اطمینان کامل تھا کہ آپ کی یہ سفارش خالص ملت اور دین کے مفاد میں ہے۔ اور اسے قبول کر کے مسلمان فلاح پائیں گے۔

حضرت ابوبکرؓ کی یہ سفارش پوری امت نے قبول کی تھی۔ اور امت کے اس اجماع سے ایک شخص نے بھی انحراف نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود حضرت عمرؓ کا انتخاب حضرت ابوبکرؓ کی سب سے بڑی اسلامی خدمت تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے وقت صورت یہ تھی کہ مسلمان، بقول حضرت ابوبکرؓ اس وقت شام اور عراق کے شیروں سے گھتے ہوئے تھے پھر ابھی فتنہ ارتداد کی قہر سامانی پہ مدت ہی کتنی گذری تھی۔

مسلمانوں کو اس وقت مضبوط قیادت کی شدید ترین حاجت تھی۔ ایک ایسے قوی الارادہ اور باعزم انسان کی جو معاملات کو ان کی مطلوبہ انتہا تک پہنچا سکے، عدل و انصاف ہر حال میں قائم کرے۔ صرف اللہ، رسول اور اُمت کے نقطہ نگاہ سے امور کو انجام دے۔ اس قابل ہو کہ ابوبکرؓ کی چھوڑی ہوئی مشکلات کو اور اہم مسائل کو حل کر کے رکھ دے۔ ارتداد کے قلع قمع کے بعد عربوں میں از سر نو رشد و ہدایت کی روح بیدار کرے، ابوبکری عہد کی فتوحات کو مکمل کرے، دولتِ نو کی تاسیس ان بنیادوں پر کرے جو اُمت کے مزاج سے سازگار ہو۔ پھر مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کی نئی ذمہ داری بھی قبول کرے، اللہ کی کتاب ہدایت اور رسول گرامیؐ کے طریق کا نفاذ کرے، اسلامی معاشرہ میں داخل ہونے والی نئی اُمت کے لئے کبھی شدت اور کبھی نرمی اختیار کرے، عدل، مساوات اور انصاف کو نافذ کرے اور اس میں نہ ادنیٰ سی کمزوری دکھائے اور نہ زیادتی اور ظلم کو روا رکھے۔

بعد میں آپ خود ہی محسوس کر لیں گے کہ اس بارگراں کو اٹھانے کی صلاحیت اور اہلیت حضرت عمرؓ سے زیادہ کسی اور شخص میں نہ تھی۔

حضرت فاروقِ اعظم

جلد دوم

مصنفہ
ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجمہ
شاہ حسن عطاء
ایم۔ اے (علیگ)

فہرست مضامین جلد دوم

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

باب ا

حضرت عمرؓ کا قبولِ اسلام

بعثت نبوی کے سال میں حضرت عمرؓ ایک ایسے (تقریباً پچیس سالہ) روئیں تن، قوی الجثہ اور دلاور جوان قریشی تھے۔ جس کا تعلق بنی عدی کے خاندان سے تھا اور جسے بس ایک متوسط الحال قریشی جواں کی سہولتیں تو میسر آئی تھیں۔ ناز و نعم سے سابقہ نہ ہوا تھا۔ یہ غیر معمولی نوجوان کسی ثروت مند شخص کا بیٹا نہ تھا بلکہ اسے ایک ایسے شخص کی (خطاب بن نفیل) کی فرزندی حاصل تھی جو برائے نام بھی دولت مند نہ تھا۔ البتہ قلب کی قساوت اور دل کی سختی سے مالا مال تھا۔ انہیں خطاب نے ایک بار اپنے بھائی کے بیٹے زید بن عمرو کو سخت آزمائش میں مبتلا کیا۔ اور اس میں حد ہی کر دی۔ ان زید نے قریش کے عام نظام حیات اور نظام فکر سے منہ موڑ لیا تھا۔ بتوں کو ٹھکرا دیا تھا اور جو لوگ ان بتوں کو اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ بناتے تھے ان کا آپ سے سخت اختلاف رائے ہو گیا تھا۔ انہوں نے جیسا کہ راویوں نے بیان کیا ہے۔ دین ابراہیمی قبول کر لیا تھا۔ اس دین کے بنیادی ارکان یہ تھے کہ اللہ کو ایک مانا جائے اور اس کی عظمت و اقتدار میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ یوں ہی قریش کی بے شمار روایات سے بھی اس دین کے ماننے والے انکار کرتے تھے۔ زید کو ان کے چچا خطاب نے اس دین (دین ابراہیمی) کے قبول کرنے پر بڑی ایذائیں دیں۔ لیکن کیا زید ان اذیتوں سے گھبرا کے اپنے دین سے منحرف ہو گئے؟ ہرگز نہیں۔ اب خطاب نے یہ کیا کہ سرداران قریش کی مدد سے انہیں مکہ ہی سے نکلوا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عمرؓ کو اپنی جوانی کے ابتدائی دور میں اپنے قسی القلب اور حد درجہ شعلہ مزاج خالد

کی سختیوں کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایک بار جب آپ مکہ سے قریب ایک جگہ سے، جس کا نام ضجنان تھا، گذر رہے تھے، آپ نے فرمایا تھا۔ وہ دن بھی کبھی تھے کہ میں اس جگہ اپنے والد خطاب کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ اور اس کام کے انجام دینے میں مجھ پر کیا کیا سختیاں نہ ہوتی تھیں اور ایک آج کا دن بھی ہے کہ روئے زمین پر اللہ کے علاوہ کوئی مجھ سے زیادہ صاحب اقتدار نہیں ہے۔ ہاں آج خدا کے سوا کوئی میرے اوپر نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عربی کا ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا یہ جو کچھ تمہیں دکھائی دے رہا ہے اس میں سے کچھ بھی قائم نہیں رہنے کا۔ البتہ اللہ کو بقا اور دوام حاصل ہے۔ مال اور اولاد سب فنا ہو جائیں گے۔

ایک بات جو یقینی سی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو مزاج کی درشتی اور طبیعت کی سختی اور تشدد، ورثہ میں ملے تھے۔ اور اگر کہیں اللہ نے حضرت عمرؓ کو اسلام کی دولت نہ بخش دی ہوتی تو ان کی زندگی میں بھی وہی خطاب کا انداز ہوتا۔ وہی سختی، وہی درشتی وہی ادنیٰ ادنیٰ سی بات پر تشدد۔ اس سے اس بات کی گرہ بالکل کھل جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ (حق اور سچائی کے نافذ کرنے کے سلسلہ میں) مسلمانوں پر اس درجہ کیوں تشدد اور سختی کرتے تھے اور اسی طرح کبھی کبھی آپ غیر معمولی ملائمت اور اعلیٰ درجہ کی نرمی کا بھی کیوں ثبوت دیتے تھے۔ (آپ کی اس آتش خطابی کو اسلام نے قابو میں کر لیا تھا۔)

راویوں نے آپ کے اسلام لانے کے واقعہ کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس سے کم از کم آپ کی شدت طبع کی ایک مؤثر تصویر ضرور کھنچ جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں راویوں کے سمند تخیل کی خوش خرامیاں ملاحظہ ہوں :۔

ایک دن حضرت عمرؓ (قبل از اسلام کے دور میں) اپنے سینے سے تلوار لٹکائے ہوئے غیظ و غضب سے مملو، انتقام کے جذبات سے پر، نکل کھڑے ہوئے۔

بنی زہرہ کے کسی آدمی نے پوچھا۔ کدھر چلے عمر، جواب ملا محمدؐ کے قتل کے ارادے سے نکلا ہوں!!

پوچھنے والے نے پھر کہا، محمدؐ کو قتل کر دو گے تو کیا بنی ہاشم اور بنی زہرہ تمہیں چھوڑ دیں گے

اب (اس مضحکہ خیز روایت کی رو سے جس کا قبول کرنا از روئے منطق قطعاً مستبعد ہے، گویا

حضرت عمرؓ نے کہا: "ایسا جان پڑتا ہے کہ تم نے اپنا پرانا مسلک چھوڑ دیا ہے؟" اس آدمی نے کہا "لیکن میں اس سے زیادہ حیرت کی بات بتا دوں تو! ـــــ تمہارے بہنوئی اور تمہاری بہن بھی تو اپنے اپنے پچھلے دین کو چھوڑ چکے ہیں۔ اپنے آباؤ اجداد کے دین کو۔" اب عمرؓ کا چہرہ متغیر ہو چکا تھا۔ اور وہ انتہائی غیظ کے عالم میں اپنی بہن کے گھر پہنچتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہی آپ کو احساس ہوا کہ "جیسے گھر میں کچھ پڑھا جا رہا ہے۔" اس وقت حضرت عمرؓ کی ہمشیرہ اور بہنوئی کے پاس ایک مسلمان "خباب بن الارت" بھی موجود تھے۔ خباب نے عمرؓ کی آہٹ پا کے اپنے کو چھپا لیا۔

یہ کیا بکواس تھی جو میں سن رہا تھا؟ تند خو بھائی گرجا، ہم لوگ کبھی کبھی اس قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں اور کیا، بہن نے جواب دیا۔ "نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ اپنے دین سے ہٹ گئے ہو" حضرت عمرؓ بولے۔ یہاں پر حضرت عمرؓ کے بہنوئی بول اٹھے۔ اور اگر جسے تم حق سمجھ رہے ہو وہی ناحق ٹھہرے تو، اب حضرت عمرؓ قابو سے باہر ہو چکے تھے اور اب انہوں نے اپنے بہنوئی پر جھپٹ کے انہیں مارنا شروع کر دیا ـــــ بہن نے چاہا کہ بھائی اور شوہر کے بیچ میں حائل ہو جائے۔ لیکن بھائی نے بہن کو بھی مارنا شروع کر دیا۔ بہن کا چہرہ لہولہان ہو چکا تھا۔ اس پر بہن نے اپنے عقائد کا اعلان کر دیا اور کہا ـــــ "ہم لوگ اب صرف اللہ کو معبود سمجھتے ہیں اور محمدؐ کو اس کا برحق رسول اور پیغمبرؐ ـــــ حضرت عمرؓ کی نظر بہن کے خون آلود چہرہ پر پڑ گئی۔ ان کا دل پسیجا اور انہوں نے اس صحیفہ کا دکھا ہوا کاغذ کا ٹکڑا مطالبہ کیا، جس سے کچھ پڑھا جاتے ہوئے۔ آپ نے سنا تھا۔ (سوال یہ ہے کہ گھر کے باہر حضرت عمرؓ نے کچھ پڑھے جانے کی آواز ضرور سنی تھی لیکن صحیفے کے بارے میں انھیں کیسے علم ہو گیا تھا۔ پھر اس وقت صحیفے یا کاغذ کا سوال بھی تو نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مترجم) اب راویوں نے مزید گل کھلائے ہیں۔ ان کے بزعم، خواہر عمرؓ نے "صحیفہ" دینے سے انکار کرتے ہوئے گویا یہ کہا تم نجس ہو اور قرآن کو صرف طیب و طاہر لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ انھیں اس بات کی ہدایت کی کہ پہلے وہ پاک ہو لیں تو پھر صحیفے کو چھوئیں۔ حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا (عجیب بات ہے، نجاست کا الزام اور وہ بھی بہن سے سننے کے بعد حضرت عمرؓ مزید مشتعل نہ ہوئے اور وہی عمرؓ جو ابھی ابھی بہن اور بہنوئی کو ہلاک کئے دے رہے تھے، کہیں حمام پہنچ گئے کہ کپڑے تبدیل کر آئیں!!!)

اب جب چند لمحات پیشتر کے خونخوار اور تند خو حضرت عمرؓ غسل اور وضو کے بعد پلٹے تو انھیں سورہ

طٰہٰ کی چودہویں آیت سنائی گئی ــــــ جس کا مطلب ہے :

"بیشک میں ہی خدا ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میری عبادت کیا کرو اور میری یاد کے لئے نماز پڑھا کرو ــــــ" یہ آیات قلب عمرؓ کی گہرائیوں تک پہنچ چکی تھیں۔ چنانچہ فوراً فرمایا :

"مجھے محمدؐ تک لے چلو" یہ بات خباب نے (جو گھر میں کہیں دب کے بیٹھے تھے) سن لی اور جگہ سے نکل کے آ گئے۔ اور کہا "عمرؓ! میں تمہیں یہ مژدہ سناتا ہوں کہ "شاید رسول اللہ کی دُعا قبول ہو چکی ہے۔" رسول اللہ کی دُعا یہ رہی ہے کہ "اے اللہ اسلام کو عمر بن الخطاب یا عمرو ابن ہشام سے تقویت بخش دے، جو بھی ان دونوں میں تیرے لئے محبوب ہو"

راوی لکھتے ہیں :- حضرت عمرؓ ارقم کے مکان پر جہاں آنحضرت اپنے جاں نثاروں کے ساتھ تشریف فرما ہوتے رہتے تھے، وارد ہوئے۔ مکان کے دروازے پر ہی سے کچھ لوگ موجود تھے حضرت عمرؓ کو دیکھ کر سب کے سب کانپ سے اٹھے۔ انھیں میں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب بھی تھے۔

اس موقع پر حضرت حمزہؓ نے لوگوں سے کہا "یہ صحیح ہے کہ عمرؓ آ رہے ہیں لیکن وہ اگر آ بھی رہے ہیں تو بھی کیا، اب اگر اللہ کو بھلائی منظور ہے تو کیا کہنا، ورنہ ہم لوگ مل کر انہیں قتل تو کر ہی سکتے ہیں" راوی بیان کرتے ہیں (حضرت عمرؓ کی آمد کے بارے میں سن کر) آنحضرتؐ باہر نکل آئے۔ اور آپ نے سختی کے ساتھ حضرت عمرؓ کے دامن کو کھینچنا شروع کیا اور فرمانا شروع کیا" ــــــ عمر کیا تم اپنی موجودہ روش سے باز نہ آؤ گے۔ کیا تمہیں ولید بن مغیرہ کا انجام ذلت منظور ہے۔ اے اللہ اب جبکہ خطاب کا فرزند عمرؓ یہاں آ چکا ہے۔ اس کے ذریعہ اسلام کو تقویت بخش"

"عمرؓ نے فوراً کہا ــــــ میں اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔"

میں جب ان روایات کو بیان کرتا ہوں تو انھیں قابل اعتبار نہیں سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ ہے کہ ان روایات سے مجھے اور اس کتاب کے قاریوں کو اس کا ضرور اندازہ ہو جائے گا کہ قدماء اور اصحاب رسول اللہ کے ذہنوں میں قبل از اسلام والے عمرؓ کی تند خوئی کس درجہ کی تھی۔

ایک بات جو بالکل یقینی ہے یہ ہے کہ حضرت عمرؓ (اسلام لانے سے پہلے پہلے مسلمانوں کے حق میں بہت سخت اور شعلہ مزاج تھے لیکن آپ نے اس دور میں قرآن کی آیتیں سنی ہوں

اور ان سے اتنا اثر لے لیا ہو کہ مشرف بہ اسلام ہو گئے ہوں"۔

مسلمانوں کے معاملے میں حضرت عمرؓ کی یہ تند خوئی بالکل سمجھ میں آ جانے والی چیز ہے۔ آخر خطاب کی سخت گیری، زید بن عمرو کے معاملہ میں ان کا تشدد اور غیض و غضب ہمارے سامنے آ ہی چکے ہیں (اس کا اثر حضرت عمرؓ پر پڑنا لازمی سا تھا) اس کے علاوہ ایک اور بات تھی۔ اس دور میں مسلمانوں سے سب سے زیادہ جس شخص کو بغض و عناد تھا وہ عمرو بن ہشام (عرف عام میں ابوجہل) تھا۔ یہ شخص حضرت عمرؓ کا خالہ زاد بھائی یا ماموں تھا۔ حضرت عمرؓ کی والدہ حنتمہ بن ہشام یا تو ابوجہل کی بہن تھیں یا اگر وہ بنت ہاشم تھیں تو ابوجہل کی چچیری بہن تھیں۔

تو گویا حضرت عمرؓ نے اگر ایک طرف ورثہ میں آتش خطابی پائی تھی تو دوسری طرف ان کی ننھیال میں ابوجہل سا شخص تھا۔ جس نے بے بس و لاچار مسلمانوں کو حد درجہ ایذائیں پہنچائی تھیں۔ یہ امر قطعاً قابل قبول ہے اور اس کا پورا پورا جواز بھی موجود ہے کہ آنحضرتؐ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہو کہ اسلام کو عمرؓ کی طاقتور اور قوی شخصیت مل جائے۔ چنانچہ اللہ نے اپنے رسول برحق کی یہ خواہش پوری بھی کر دی اور لیجئے حضرت عمرؓ اسلام کی دولت بیدار سے کامران ہو گئے اسلام کا فلسفۂ تسلیم قبول کرنے کے بعد حضرت عمرؓ کی شدت کا رُخ ہی بدل گیا۔ اب وہی شدت اور شعلہ مزاجی (جو اب تک مسلمانوں کے لئے موجب صدمہ ناو تھی) توحید کے دشمنوں کے لئے مصیبت بن چکی تھی۔ اب اپنے عقائد کے اعلان اور اظہار میں حضرت عمرؓ سے بڑھ کر انتہا پسند کوئی بھی تو نہ تھا۔ آپ نے قریش کو ذرا خاطر میں نہ لاتے ہوئے اولین فرصت میں انھیں اپنے قبول اسلام سے آگاہ کر دیا اور پھر جب ظالموں نے آپ پر مظالم ڈھانے شروع کئے تو کچھ مسکینوں یا عاجزوں کے انداز میں نہیں، غیور اور بلاکش اور جبری اور قوی لوگوں کی مانند، آپ نے ان ستمہائے قریش کو برداشت کیا۔ اور ان سے پوری پوری ٹکر لی۔

اسلام کی حقیقت سے واقف ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ سب سے پہلے اپنے ماموں ابوجہل ہی کے پاس گئے۔ ابوجہل نے ابن خطاب کو دیکھا تو پہلے تو مسرت کا اظہار کیا لیکن جب حضرت عمرؓ نے "وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں" کے مصداق، تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے۔ اچانک ابوجہل کو بتایا کہ وہ "اب صرف اللہ کو معبود ماننے لگے ہیں اور محمدؐ کو رسول اللہ"

تو ابوجہل نے غم، بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مکان کے دروازے بند کر لیے!

اب حضرت عمرؓ اپنے آپ میں نہ تھے۔ "نشۂ توحید سے سراپا مست" آپ نے ایک ایسے شخص سے جو قریش میں سب سے پہلے ان کی باتیں پھیلا دیا کرتا تھا، یہ بات کہہ دی۔ مقصد یہ تھا کہ وہ شخص خود ہی جلد از جلد اس کا اعلان کر دے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ قریش کی مجلسوں میں اب ہر جگہ ابن خطاب کے اسلام کے چرچے تھے۔ اس دن قریش کے اس شخص نے جہاں کہیں بھی کچھ لوگوں کو بیٹھے دیکھ پایا اسلام عمرؓ کا ذکر ضرور کر دیا۔ اب جوں ہی حضرت عمرؓ مسجد کی طرف یعنی کعبہ کی جانب بڑھتے ہیں۔ قریش ان پر سب کے سب مل کر پل پڑتے ہیں۔ زد و کوب کرتے ہیں۔ اذیت دیتے ہیں، لیکن کیا حضرت عمرؓ سر تسلیم خم کر کے عاجزی یا گریہ و زاری یا آہ و بکا سے کام لیتے ہیں؟

ہرگز نہیں، آپ بھی کمال شجاعت اور مردانگی سے اس جماعتی یورش کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مگر اکیلے مقابلہ کہاں تک کرتے مارنے والا گروہ کا گروہ تھا ادھر آپ تن تنہا۔ آخر میں لوگ آپ کو پچھاڑ لیتے ہیں۔ اس موقعہ پر عاص بن وائل نام کا ایک شخص آگے بڑھ کر قریش کو سمجھاتا ہے کہ حضرت عمرؓ بن عدی کے قبیلے کی آنکھ کا تارا ہیں اور اگر انہیں کچھ ہو گیا تو قریش پر مصیبت آ جائے گی، یہ سن کر یہ ظالم اپنی اپنی راہ چل پڑے لیکن حضرت عمرؓ کو یہ لوگ بالکل بے حال کر چکے۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ یہ حضرت عمرؓ ہی کی جرأت آموز ذات تھی کہ آپ نے مکہ میں اپنے نئے عقائد (یعنی اسلام کا) اعلان کیا اور ان لوگوں کو بھی جو ابھی تک چھپ چھپ کے عبادت وغیرہ کرتے تھے یہ حوصلہ دلایا کہ وہ بغیر کسی جھجک کے اسلام کا اظہار کر دیں۔

اس وقت تک مسلمانوں کا اسلام محض ایک راز تھا۔ راز، اور ان میں اپنے نئے جاندار اور صحیح عقائد کے ساتھ قریش کے ستمگروں کے روبرو آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اب اسلام اور شرک و کفر کی آویزش باضابطہ شروع ہو چکی تھی۔ حضرت عمرؓ کی زبردست اور فعال بے پناہ شخصیت نے یہ کمال دکھایا کہ اب نہ تو قریش کو آپ کو آزار پہنچانے کی جرأت ہوتی تھی نہ دوسرے مسلمانوں کو، اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ آنحضرتؐ اور آپ کے عالی مرتبت اصحاب، کعبہ میں قریش کی ٹولی کے روبرو، اپنی روح انگیز مجلس نشینیاں فرماتے تھے اور کھلے بندوں اپنی نمازیں گزارتے تھے! یہ سب عمرؓ کے اسلام کے بعد ہوا۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں تو ہمیں ابن مسعودؓ کے اس قول میں کوئی حصہ ناقابل قبول نہیں معلوم ہوتا۔

ان کا قول یہ ہے :-

حضرت عمرؓ کا اسلام لانا بجائے خود ایک فتح و نصرت تھا۔ آپ کا مدینہ جانا اسلام کے لئے زبردست اعانت ثابت ہوا، آپ کا دورِ خلافت امت کے لئے رحمت تھا، ابن مسعودؓ کا یہ مختصر سا مقولہ وہ دقیق ترین وصف ہے جو حضرت عمرؓ کے آغازِ اسلام سے اختتام دورِ عمریؓ تک کے دور کو واضح کر دیتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد مسلمانوں نے برملا اور قریش کے سامنے نمازیں ادا کیں اور نئے نظام کا اعلان کیا، یہ ایک عظیم فتح تھی۔ آپ کی ہجرت واقعی اسلام کے لئے بہت بڑی مدد تھی، مدینہ میں آپ نے اپنے آپ کو رسول اللہ اور مسلمانوں کا سب سے بڑا خیرخواہ اور خیراندیش ثابت کیا تھا۔ جہاں تک آپ کے دورِ حکومت کا تعلق ہے، یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کو ایک ایسی شریفانہ اور پُرامن اور بامقصد زندگی سے سابقہ ہوا کہ مغرب کی متمدن اقوام آج بھی اس معیار پر پوری نہیں اتر رہی ہیں اور یہ عدیم کامیابی باوجود غیر معمولی کاوشوں کے ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ دور، جیسا کہ ابن مسعودؓ نے فرمایا :- "دورِ رحمت و سعادت تھا"

باب ۲

حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں سختی اور نرمی کا امتزاج

ابن سعد کا قول ہے "اسلام لاتے وقت حضرت عمرؓ کا سن چھبیس سال کا تھا"

راوی اس بات پر اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بعثت نبوی کے سال ششم میں پیش آیا تھا۔ اسلام لانے کے بعد سات برس تک حضرت عمرؓ کا قیام مکہ میں رہا۔ اس عرصہ میں آپ اپنے اور دوسرے مسلمانوں کے دین کی مدافعت کرتے رہے اور قریش سے نبرد آزما رہا کیے۔ اس سلسلہ میں آپ پر جو مصائب نازل ہوئے، انہیں آپ نے انتہائی خندہ پیشانی اور عزم و ہمت کے ساتھ گوارا کیا۔ ایک بات جو بڑی اہم ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی شخصیت بیک وقت سخت گیری اور رقت و نرمی کا مظہر تھی۔ اپنے بہنوئی سے ان کے مسلمان ہو جانے کا واقعہ معلوم کر لینے کے بعد حضرت عمرؓ نے سختی اور درشتی کا جو برتاؤ کیا تھا، اسی طرح اپنی بہن سے آپ کی اس وقت کی سخت گیری، جب انہوں نے اپنے شوہر کے لئے سینہ سپر ہو جانا چاہا تھا لیکن ساتھ ہی اپنی بہن کے چہرہ سے خون بہتے دیکھ کے دفعتاً آپ کا نرم ہو جانا یہ چیزیں اس آمیزش و آبریشم کا پتہ دیتی ہیں کہ آپ ایک ہی وقت میں سخت بھی تھے اور نرم بھی تھے۔

راوی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا دل ان لوگوں کے لئے بہت کڑھتا تھا۔ جو حبشہ ہجرت کر کے چلے جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اسلام لانے کے بعد حضرت عمرؓ کا یہی انداز رہا تھا حد درجہ سخت گیری فرماتے تھے اور پھر انتہا درجہ کی نرمی کا ثبوت دیتے تھے۔ شاید اسلام نے عمری مزاج میں مزید صفائی اور پاکی پیدا کر دی تھی۔ اب ان کی تند خوئی ان کے قابو میں تھی ان کا غیظ اسلام کے تابع ہو چکا تھا اب ان کی نرم خوئی اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ کمزور اور ستم رسیدہ اشخاص کی

یاری اور غم خواری میں پیش پیش رہنے لگے تھے۔ اسلام کو فی الواقع عمری مزاج میں یہ تبدیلی پیدا بھی کر دینی چاہیے تھی۔

سلسلام اعتدال کی طرف بلاتا ہے اور زیادتی اور بداعتدالی سے منع کرتا ہے۔ اسلامی نظام میں محض انتہائی ناگزیر حالات میں ایک شخص کو دوسرے شخص پر غلبہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اسلام نرمی طبع کی تلقین کرتا ہے۔ پھر حضرت عمرؓ میں یہ صفات کیسے نہ پیدا ہوتے۔ آخر آپ نے آنحضرتؐ کی صحبت سے فیض پایا تھا اور یہ دیکھا تھا کہ سرور جہاں نے نہ انسانوں کا حق پامال کیا، نہ خدا کا حق اور ہمیشہ اپنی راحت و مسرت کو راہ حق میں قربان کیا۔

یہ سب جانتے ہیں کہ آنحضرت ہمیشہ اعتدال اور سہولت کی راہ کو پسند فرماتے تھے۔
ظاہر ہے کہ آپ کی اس روش نے حضرت عمرؓ کے طرز فکر کو بھی متاثر کیا تھا۔ اس کے علاوہ قرآنی آیات اور احکامات جو آپ کے پیش نظر تھے ان سے بھی آپ کا متاثر ہونا یقینی تھا۔
ہمیں اس کا علم نہیں کہ جاہلیت میں حضرت عمرؓ کبھی روئے بھی ہوں۔ لیکن اسلام کے بعد جلد گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ دوسرے مومنین باصفا کے مثل اللہ کے ذکر پر آپ کا دل بھی خوف اور خشیت سے پُر ہو جاتا تھا

سورۃ الانفال کی دوسری آیت میں ہم پڑھتے ہیں۔
"مومن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دِل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے"
جب کبھی حضرت عمرؓ کے سامنے قرآن کی وہ آیات پڑھی جاتی تھیں جن میں عذاب سے ڈرایا دھمکایا گیا ہے۔ آپ پر رقت طاری ہو جاتی۔ آنحضرتؐ کی زندگی کی مادی نقطۂ نگاہ سے بے سروسامانی دیکھ کر آپ رو رو دیتے تھے۔ یہ بات خلافت سے پہلے اور خلافت کے بعد بھی آپ کے معاملہ میں مشہور سی ہو گئی تھی کہ خواہ آپ کا غیظ و غضب کتنا ہی شدید ہو، کسی سبب سے کیوں نہ ہو، ادھر قرآن کی کوئی آیت پڑھی گئی اور اُدھر جذبہ غضب کافور ہو گیا
خود دور جہالت میں آپ کا دل بعض بعض موقعوں پر کڑھنے لگ جاتا تھا اور بالکل نرم پڑ جاتا تھا۔ اسلام لانے کے بعد عمری قلب اور بھی نرم پڑ گیا۔ اب گریہ کبھی کبھی نالہ و بکا میں

تبدیل ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی خلافت کے دور میں حضرت عمرؓ ایک زبردست کو و وقار تھے اسی طرح آپ حد درجہ نرم بھی تھے۔ جن لوگوں نے آپ کے طرز حکومت پر تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ آپ کی سختی' ایذار رسانی اور قساوت سے' اور آپ کی نرمی' کمزوری سے خالی تھی حضرت عمرؓ بیک وقت سخت بھی تھے نرم بھی، سب آپ سے خائف تھے۔ سب آپ سے عنایت اور توجہ کے متمنی اور آرزو مند تھے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی ذات پر بھی حد درجہ سختی کرتے تھے۔ گویا دوسروں سے پہلے اپنے ہی سے محاسبہ کیا کرتے تھے۔ یہ بات شاید ہی کبھی سنی ہو گی کہ حضرت عمرؓ نے کبھی اپنی ذات کو بھی واجب الرحم گردانا ہو اور اسے مستحق آرام و راحت جانا ہو۔ آپ کو ضعیفوں اور محتاجوں سے فرصت ہی کب ملی تھی کہ آپ اپنی طرف متوجہ ہوتے۔ سختی اور نرمی کا یہی دلآویز امتزاج تھا جس نے حضرت عمرؓ کو وہ بے باکی بخشی تھی جو اصحاب رسولؐ تک میں مفقود تھی۔ جس وقت حضرت عمرؓ اپنی رائے کو صحیح سمجھ لیتے تھے کمال جرأت کے ساتھ اسے پیش کرتے تھے۔ اور رسالت مآبؐ تک سے اختلاف رائے کرنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ حدیبیہ کی صلح کے موقع پر آپ ہی نے آنحضرتؐ سے کہا تھا کہ "ہم اپنے دین کے معاملہ میں کسی نوع کی کمزوری کیوں دکھائیں" کبھی کبھی یہ بے باکی حضرت عمرؓ کو آمادہ کرتی تھی کہ آپ ان امور تک میں دخل دیں جن میں دوسرے اصحاب بالکل دخل نہ دیتے تھے۔

مثلاً آپ کی خواہش تھی کہ شراب کو حرام قرار دیا جائے۔ بعض محدثین کا خیال ہے کہ جاہلیت میں حضرت عمرؓ نے شراب پی تھی اور اس کے مضر اثرات کا آپ کو اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لئے آپ اس کی حرمت کے متمنی تھے۔ اس حرمت کے لئے حضرت عمرؓ مستقل اظہار رائے کرتے رہے اور آخر کار یہ نوبت آ ہی گئی کہ کم از کم شراب ایک حد تک حرام قرار پائی اور مسلمانوں کو یہ حکم ہو گیا "کہ نشہ کی حالت میں نماز کے لئے نہ آئیں" اس لئے کہ ایسی صورت میں انہیں کیا معلوم ہو سکے گا کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ اس سے حضرت عمرؓ کو زبردست مسرت ہوئی۔ لیکن آپ کچھ اور ہی چاہتے تھے۔ "شراب کی مکمل حرمت" چنانچہ آپ کے اندر اس بات کی شدید آرزو پیدا ہو گئی۔ آپ اسے علی الاعلان کہنے بھی لگے اور اس سلسلہ میں اللہ

تعالیٰ سے دعا بھی فرمانے لگے ۔ آخرکار آپ کو اس وقت تسکین ہوئی جب "سورہ المائدہ" کی ۹۰ اور ۹۱ ویں آیت نازل ہوئی جو درج ذیل ہے۔

"اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پا سے یہ سب ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں سوان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے، تم کو ان کاموں سے باز رہنا چاہیے ۔"

اس طرح حضرت عمرؓ حجاب کے مسئلہ کے بارے میں سوچ رہے تھے ۔ خصوصی طور پر ازدواج مطہرات کے بارے میں، حضرت عمرؓ نے اس معاملہ میں اپنی رائے کا آنحضرت سے اظہار کر بھی دیا ۔ آپ کو اس سلسلہ میں اتنا غلو ہو گیا کہ روایت کے مطابق ایک بار جب آپ نے ام المومنین حضرت سودہ کو، جو کسی کام سے گھر کے باہر تشریف لے گئی تھیں، ایک عام راستہ سے گزرتے دیکھا تو آپ نے حضرت سودہؓ کو پہچان لیا اور ان سے یہ درخواست کی کہ وہ اپنے وقار اور مرتبہ کے پیش نظر گھر سے باہر نہ نکلیں ۔

سورہ الاحزاب کی ۳۰ ۔ ۳۴ آیات میں بعینہٖ یہی احکامات ہیں:۔

"اے پیغمبر کی بیویو! تم میں سے جو کوئی صریح ناشائستہ حرکت کرے گی اس کو دونی سزا دی جائے گی ۔ اور یہ بات خدا کو آسان ہے اور جو تم میں سے خدا اور اس کے رسول کی فرمانبردار رہے گی اور عمل نیک کرے گی اس کو ہم دونا ثواب دیں گے اور اس کے لئے ہم نے عزت کی روزی تیار کر رکھی ہے ۔

اے پیغمبر کی بیویو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم پرہیزگار رہنا چاہتی ہو تو کسی اجنبی شخص سے نرم نرم باتیں نہ کیا کرو تاکہ وہ شخص جس کے دل میں کسی طرح کا مرض ہو کوئی امید نہ پیدا کرلے اور ان سے دستور کے مطابق بات کیا کرو اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح پہلے جاہلیت کے دنوں میں اظہار تجمل کرتی تھیں اسی طرح زینت نہ دکھاؤ اور نماز پڑھتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتی رہو ۔

اے پیغمبر کے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کا میل کچیل دور کردے اور تمہیں بالکل

پاک صاف کر دے اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو بے شک خدا باریک بیں اور باخبر ہے۔"

اس سورہ کی آیات ۵۳ - ۵۵ میں یہ ہے

" مومنو! پیغمبر کے گھروں میں نہ جایا کرو۔ مگر اس صورت میں کہ تم کو کھانے کے لئے اجازت دی جائے اور اس کے پکنے کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔ لیکن جب تمہاری دعوت کی جائے تو جاؤ اور جب کھانا کھا چکو تو چل دو۔ اور باتوں میں جی لگا کر نہ بیٹھے رہو۔

یہ بات پیغمبر کو ایذا دیتی تھی۔ اور وہ تم سے شرم کرتے تھے اور کہتے نہیں تھے لیکن خدا سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا اور جب پیغمبر کی بیویوں سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو۔ یہ تمہارے اور ان کے دونوں کے لئے بہت پاکیزگی کی بات ہے اور تم کو یہ شایان شان نہیں کہ پیغمبر خدا کو تکلیف دو۔ اور نہ یہ کہ ان کی بیویوں سے کبھی ان کے بعد نکاح کرو۔ بے شک یہ خدا کے نزدیک بڑے گناہ کا کام ہے اگر تم کسی چیز کو ظاہر کرو یا مخفی رکھو تو یاد رکھو کہ خدا ہر چیز سے باخبر ہے، عورتوں پر اپنے باپوں سے پردہ نہ کرنے میں کچھ گناہ نہیں اور نہ اپنے بیٹوں سے اور نہ اپنے بھائیوں سے اور نہ اپنے بھتیجوں سے اور نہ اپنے بھانجوں سے نہ اپنی قسم کی عورتوں سے اور نہ لونڈیوں سے اور ______

اے عورتو! خدا سے ڈرتی رہو بے شک خدا ہر چیز سے واقف ہے۔"

جس وقت خدائی حکم سے نبیؐ کے مکان کو محترم اور جلیل القدر قرار دیدیا گیا تو حضرت عمرؓ کو صد درجہ مسرت ہوئی۔ بات یہیں ختم نہ ہو گئی تھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کسی معاملہ میں حضرت عمرؓ کی بیوی نے ان سے جھگڑا کیا۔ جس پر آپ نے انہیں ڈانٹ دیا۔

بیوی نے کہا ____ مجھے تو ڈانٹ رہے ہو تمہیں یہ نہیں معلوم کہ خود پیغمبر کی بیویاں اپنے نامدار شوہر سے جھگڑتی ہیں اور بعض معاملات میں انہیں ناراض تک کر دیتی ہیں تمہاری بیٹی (مراد حضرت حفصہ) اور نبیؐ کی دوسری بیویاں رسول اللہ سے جھگڑ بیٹھتی ہیں اور آپ کو ناراض کر دیتی ہیں۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر جلد از جلد حضرت حفصہؓ کے پاس گئے اور یہ بات پوچھی حضرت حفصہؓ نے کہا " یہ صحیح ہے کہ ہم پیغمبرؐ سے کبھی کبھی جھگڑتے ہیں۔" اس پر

حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی کو سمجھایا اور نصیحت کی ۔ ماں کی طرف سے حضرت عمرؓ، حضرت ام سلمہ ؓ کے بھی رشتہ دار تھے ۔ چنانچہ ان سے (ام سلمہ ؓ) سے مل کر بھی آپ نے یہی سوال کیا ۔ ام سلمہ ؓ نے کہا " خدا کے لئے بس کرو ابن خطاب تم تقریباً ہر معاملہ میں دخیل ہو چکے ہو اب آنحضرت ؐ کے گھریلو معاملات تک میں دخل دینا چاہتے ہو ۔

یہ سن کر حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے اور وہاں سے اٹھ آئے ۔ ان تمام باتوں سے قبل غزوہ بدر کے اسیروں کے باب میں حضرت عمرؓ کی رائے عین قرآن کے مطابق واقع ہوئی تھی ۔ آپ کی یہ رائے تھی کہ اسیران بدر کو قتل کر دیا جائے ۔ اس کے برخلاف صدیق اکبرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان قیدیوں کو رہا کر کے فدیہ لے لیا جائے ۔ سورہ انفال میں اللہ تعالیٰ نے اس بات پر کہ اسیران بدر کو چھوڑ دیا گیا تھا نبیؐ اور مسلمانوں کو ملامت کی ۔ ان باتوں کے پیش نظر محدثین کے اس نقل کردہ قول پیغمبر میں کہ " حق عمرؓ کی زبان پر رہتا ہے " کوئی غرابت نہیں معلوم ہوتی ۔ اسی طرح یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کو فاروق (حق و باطل میں امتیاز کرنے والا) کیوں کہا گیا ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ لقب بقول حضرت عائشہؓ آنحضرتؐ کا عطا کیا ہوا تھا یا جیسا کہ بعض دوسرے محدثین نے بیان کیا ہے اہل کتاب (اس دور کے یہودی اور نصرانی وغیرہ) نے آپ کو یہ لقب دیا تھا ۔ جسے بعد میں مسلمانوں نے اختیار کر لیا تھا ۔

حضرت ابوبکرؓ کے دور میں بھی حضرت عمرؓ کی یہ بے باکی قائم رہی ۔ حضرت خالدؓ ابن ولید کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا حضرت ابوبکرؓ سے اختلاف معروف چیز ہے ۔ جس وقت خالدؓ نے مالک بن نویرہ کو قتل کیا تو حضرت عمرؓ نے یہ کہتے ہوئے کہ خالدؓ کی تلوار ستم انگیز ہے حضرت ابوبکرؓ سے ان کے معزول کئے جانے کی سفارش کی تھی ۔

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہوتے ہی خالدؓ کو معزول کر دیا ۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس بات سے بھی منع کیا تھا کہ خالدؓ بن سعید بن العاص کو شام کے حدود پر روانہ کریں ۔ اتفاق سے یہی رائے حضرت علیؓ کی بھی تھی ۔ غرض دونوں بزرگوں کی رائے یہ تھی کہ حضرت خالد بن سعید خود پسند اور جلد باز ہیں ۔ بعد کے حوادث نے اس رائے کی

صداقت پر مہر تائید ثبت کی۔ خالد بن سعید نے آگے بڑھنے میں جلد بازی کی اور نتیجہ کے طور پر انہیں راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔

حضرت عمرؓ کی یہی جرأت اور حق کے لئے سخت گیری تھی، ان کی رائے کا مختلف مواقع پر قرآن کے ارشاد سے یہی تطابق تھا، اور ان کا رسول اللہ اور امت کے لئے یہی جذبہ خیر سگالی تھا جس نے انہیں آنحضرتؐ کی نگاہوں میں اس درجہ پسندیدہ اور قابل ترجیح شخصیت بنا دیا تھا۔

آنحضرتؐ، حضرت عمرؓ سے وہ کچھ کہتے رہتے تھے، جس سے وہ از سرتاپا مسرت و شادمانی ہو جایا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے آنحضرتؐ سے عمرہ کی اجازت چاہی اور کہا میں عمرہ کے لئے پیدل جاؤں گا۔ آنحضرت نے انہیں اجازت دے دی۔ لیکن جب وہ چلنے لگے تو بلوا بھیجا اور کہا۔

" میرے بھائی اپنی نیک دعاؤں میں مجھے بھی شریک رکھنا!" حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے۔

" آنحضرتؐ مجھ سے ایک بات ایسی فرما چکے ہیں جس کے عوض میں یہ پوری دنیا اور اس کی تمام نعمتیں لینا پسند نہ کروں گا۔"

حضرت عمرؓ آنحضرتؐ کے لئے بے پناہ حد تک خیر اندیشی کے جذبات رکھتے تھے۔ آپ پر جان نچھاور کرنے، آپ کے لئے سینہ سپر ہونے اور ہر بلا اور ہر مصیبت کو آپ سے دور رکھنے کے لئے حضرت عمرؓ ہمیشہ بے چین اور عمل پر آمادہ رہتے تھے۔ یہ جاننے کے بعد کہ ازواج مطہرات اپنے نامدار اور معظم شوہر سے جھگڑتی ہیں آپ نے اس موضوع پر حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ سے بات کی تھی۔ نبی سے یہی انتہا درجہ کا شغف اور عشق، کبھی کبھی حضرت عمرؓ کو صد درجہ غیور اور شعلہ مزاج اور تندخو بنا دیتا تھا۔ آنحضرتؐ، حضرت عمرؓ کی اس حدت اور شدت کو ملائمت اور سلامتی طبع میں مبدل فرمانا چاہتے تھے۔ مثلاً غزوہ بنی مصطلق میں عبداللہ بن ابی بن سلول بار بار کہتا تھا کہ اگر ہم مدینہ پہنچ گئے تو پھر وہاں کے با اقتدار کمزوروں کو مار بھگائیں گے۔ شدہ شدہ یہ بات آنحضرتؐ

تک پہنچی اور حضرت عمرؓ نے چاہا کہ انہیں، اس گستاخ کو اس کی گستاخی کی پاداش میں سزا کے قتل دینے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن آنحضرت نے حضرت عمرؓ کو اس بات کی اجازت نہ دی اور یہ کہہ کر عمرؓ کی شدت کو بے قابو ہونے سے بچا لیا کہ ایسا کیا گیا تو لوگ کہیں گے کہ حضرت محمد الرسول اللہ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔

اسی عبداللہ بن ابی بن سلول کے مرنے کے بعد جب اس کے بیٹے نے آنحضرتؐ سے آکے یہ درخواست کی کہ اس کی نماز جنازہ پڑھ دیں تو آنحضرت نے اس درخواست کو قبول کر لیا لیکن حضرت عمرؓ نے اس باب میں آپ سے اختلاف کیا اور سورۃ براءۃ کی ذیل کی اس آیت کو پیش کر کے آپ کو ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

آیت ۸۰ سورۃ براءۃ "تم ان کے لئے بخشش مانگو یا نہ مانگو بات ایک ہے اگر ان کے لئے ستر دفعہ بھی بخشش مانگو گے تو بھی خدا ان کو نہیں بخشے گا۔"

آنحضرتؐ نے اس موقع پر یہ کہہ کر حضرت عمرؓ کی رائے نہ قبول کی تھی کہ بہر حال اللہ نے آپ کو اس سلسلہ میں اختیار دیا تھا کہ نماز جنازہ پڑھیں یا نہ پڑھیں۔ چنانچہ آپ نے آخر میں یہی طے کیا تھا کہ آپ عبداللہ بن ابی بن سلول کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔

مگر وحی کو، روایات محدثین کی رو سے، حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق تو ہونا ہی تھا۔ چنانچہ اسی سورۃ براءۃ میں یہ آیت نازل ہوئی (آیت ۸۴۔ سورۃ براءۃ)۔

" اور اے پیغمبر ان میں سے کوئی مر جائے تو کبھی اس کے جنازے پر نماز نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر جا کر کھڑے ہونا یہ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرتے رہے اور مرے بھی تو نافرمان ہی مرے۔"

غزوہ حنین کے موقع پر آنحضرت نے مال غنیمت تقسیم کیا۔ اور قریش وغیرہ کو دوسرں کی توقع سے بہت زیادہ دیا۔ اس پر ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا۔

"اے محمدؐ انصاف کرو، نبیؐ کے چہرہ پر غیظ و غضب کے آثار نمایاں ابھر گئے اور آپ نے فرمایا، تیرا برا ہو اگر میں انصاف نہ کروں گا تو پھر کون انصاف کرے گا۔"

اما ایک بار پھر حضرت عمرؓ نے اجازت چاہی کہ اس شخص کو، جس نے آنحضرتؐ کے ایک

عمل پر اعتراض کیا تھا، قتل کر دیں لیکن رسالت مآب ؐ نے کہ

رحمتہ للعالمین تھے یہ اجازت نہ دی

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت کے عہد میں حضرت عمرؓ کی زندگی اور ان کے مزاج میں شدت اور سخت گیری بے حد نمایاں تھی اور اسے بھی آنحضرت ؐ کبھی اظہار فرما کر اور کبھی تبسم فرما کے، کم کر دیتے تھے، روک دیتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں بھی آپ کی یہی روش قائم رہی۔ جس چیز کو حضرت عمرؓ حق جانتے تھے اس کی خاطر سخت سے سخت قدم اٹھانے کو تیار رہتے تھے اور جب کبھی آنحضرت ؐ، حضرت عمرؓ کو سخت گیری اور تشدد سے منع کرتے تو آپ باز آجاتے کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ آنحضرت جو بھی کہتے ہیں، جو بھی حکم صادر فرماتے ہیں وہ اللہ کے حکم کے براہ راست تابع ہوتا ہے یعنی از روئے وحی سماوی ہوتا ہے ۔۔۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کے احکامات آپ کے نزدیک تنقید سے بالاتر نہ تھے آپ چاہتے تھے کہ خلیفہ اول خالدؓ کو معزول کر دیں اور آپ نے اس پر اصرار کیا تھا لیکن صدیق اکبرؓ نے ان کی یہ بات نہ مانی تھی۔ چنانچہ آپ خاموش ہو گئے۔ لیکن جب خلافت کا بار خود سنبھالا تو اپنی رائے کے مطابق خالدؓ کو معزول کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی بعض باتوں سے شدید اختلاف کو حضرت عمرؓ اس لئے جائز سمجھتے تھے کہ آپ کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ کی رائے بہر حال ان کی ذاتی رائے ہوتی تھی۔ کوئی ان کے پاس وحی نہ آتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اجتہاد کرتے تھے۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ اور امت کے لئے خیر اندیشی کر کے ایک نتیجہ پر پہنچتے تھے۔ چنانچہ جب صورت یہ تھی تو حضرت عمرؓ بھی، اس اجتہاد کے اصول پر، ابوبکرؓ سے اختلاف کرتے رہتے تھے۔ آنحضرت ؐ کے احکامات سے روگردانی البتہ حضرت عمرؓ کے نزدیک گناہ تھا۔

باب ۳

حضرت عمرؓ کے مزاج میں تبدیلی

خلافت کا بھار سنبھالنے کے بعد اور جنگ اور صلح کے دور کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے بعد حضرت عمرؓ میں بعض ایسے صفات نمودار ہوئے جو اس سے پہلے منظر عام پر نہ آئے تھے۔ ابھی تک حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کی ایک تلوار تھے۔ جسے رسالت مآب ﷺ جب چاہتے تھے بے نیام فرماتے تھے اور جب چاہتے تھے نیام میں رکھ لیتے تھے۔ ایسے ہی خلیفہ اول ؓ کے دور میں بھی آپ ایک ایسی شمشیر خلافت تھے جسے بضرورت بے نیام کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ صرف اطاعت کر سکتے تھے۔ یا زیادہ سے زیادہ مختلف امور میں مشورہ دے سکتے تھے اس وقت ان کا یہ کام نہ تھا کہ اس سے زیادہ کچھ کریں۔ لیکن خلافت کا بار سنبھالتے ہی حضرت عمرؓ نے ایک ایسا احساس ذمہ داری پانے پر مسلط پایا جو حیطۂ تحریر میں آئی ہوئی عالمی تاریخ کا کوئی خلیفہ یا حاکم اپنے اندر پیدا نہ کر سکا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ ادنیٰ ادنیٰ سی بات میں اپنا محاسبہ فرماتے تھے۔ آپ کا ضمیر ہمہ وقت بیدار رہتا تھا دن اور رات کی کوئی گھڑی ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہ محاسبہ قائم نہ رہتا ہو۔ کبھی کبھی یہ دلسوزئ امت آپ کی آنکھوں سے نیند کو غائب کر دیتی تھی۔ لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ آپ اپنی ذات کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ کبھی کبھی تو آپ خود اپنی ذات کا مذاق اڑایا کرتے تھے! ایک دفعہ آپ کے مکان کے پاس سے کچھ لوگ گزر رہے تھے تو دیوار کی پشت سے آپ کو یہ کہتے سنا گیا!

"خطاب کا بیٹا امیرالمومنین بنا پھرتا ہے ابن خطاب ہوش کی دوا کر۔ اگر تو اللہ کی اطاعت نہ کرے گا تو تجھے عذاب دیا جائے گا"

ایک چیز جس سے آپ بے حد خائف تھے وہ یہ خیال تھا کہ کہیں خدا کے نزدیک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ آپ نے اپنے کو عام لوگوں سے ممتاز مانا ہے۔ اور اپنی ذات کو دوسروں کے مقابلہ میں قابل ترجیح گردانا ہے۔ چنانچہ یہی سبب تھا کہ حضرت عمرؓ اپنے آپ کو آنحضرتﷺ کے بڑے صحابہ یا متوسط لوگوں تک نہیں گنتے تھے بلکہ اپنا مقام وہ بنائے ہوئے تھے جو بے بضاعت اور حاجت مند لوگوں کا تھا۔ آپ نے اپنے اوپر یہ بات لازم کر رکھی تھی کہ آپ کا معیار زندگی بے بضاعت لوگوں کے معیار سے بڑھنے نہ پائے اور آپ بھی گرم و سرد زمانہ سے انہی ناداروں کے مانند نبرد آزما ہوں۔

آپ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایسا اسی صورت میں ممکن ہو سکے گا جب آپ کو پورے طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ ناداروں اور غریبوں کی راحت رسانی کا کیا طریقہ ہے اور یہ کہ کن چیزوں سے اس طبقہ کے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ کس چیز میں یہ مگن رہتے ہیں۔ اور کن باتوں سے اپنے کو ستم رسیدہ سمجھتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کوئی مفلس اور نادار آدمی نہ تھے۔ ان کی اپنی تجارت تھی اور خلافت کا بارگراں تجارتی مشاغل میں دخل انداز بھی نہ ہو سکتا تھا۔ یعنی اگر آپ چاہتے تو فارغ البالی سے زندگی گزار سکتے تھے اور اپنی بیویوں اور بیٹیوں کے لئے آرام دہ زندگی کا سامان مہیا کر سکتے تھے لیکن آپ نے اپنے لئے حد درجہ سخت اور کٹھن زندگی اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ مسکینوں اور قلاشوں کا کھانا کھاتے تھے اور اپنے متعلقین پر انتہائی کڑی نگرانی رکھتے تھے کبھی کبھی آپ ان سے یہ فرمایا کرتے:

"لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف ہیں اس لئے اگر تم میں سے کسی نے ذرا بھی قانون شکنی کی تو میں اسے دوگنی سزا دوں گا۔"

اپنے بیٹوں کو آپ تلقین فرمایا کرتے تھے کہ انہیں حتی الوسع آپ اپنا کفیل بن جانا چاہیے اور انہیں حتی الامکان آپ کو (مراد حضرت عمرؓ) اس بات پر مجبور نہ کرنا چاہیے کہ آپ ان کے مصارف برداشت کریں، عورتوں پر بے حد سختی فرماتے تھے یعنی ان معنیٰ میں ان پر سختی فرماتے تھے کہ انہیں کھردری اور غیر نرم زندگی گزارنے پر مجبور کرتے تھے۔ جسے عورتیں عموماً پسند نہیں کیا کرتیں

لباس اور غذا کے معاملہ میں ان عورتوں کو سختیوں کا عادی بناتے تھے۔ اور ان سے یہ توقع فرماتے تھے کہ وہ پوری زندگی جفاکشی میں گزار دیں۔ حضرت عمرؓ جس وقت اپنی بیویوں سے ملتے تو چہرہ پر تازگی کا نام نہ ہوتا۔ یہ بیان ایک خاتون کا ہے جنہیں آپ نے ایک بار شادی کا پیغام دیا اور انہوں نے اسی سخت گیری کے پیش نظر اسے نامنظور کر دیا۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ ایک روز حضرت عمرؓ اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ سے ملنے گئے۔ انہوں نے مدارات کرنی چاہی اور شوربے کی قسم کی ایک چیز لا کے رکھدی اور اس میں تھوڑا سا روغن بھی ڈال دیا۔ باپ نے یہ کہہ کر غذا سے ہاتھ کھینچ لیا کہ ایک ہی برتن میں دو دو مزے ہو گئے ہیں میں ہرگز نہیں کھاؤں گا۔

حضرت عمرؓ کی اپنی ذات سے یہ غیر معمولی سخت گیری عموماً لوگوں کو اور آپ کی حکومت کے ارکان کو آپ کے ساتھ کھانا کھانے سے مجتنب رکھتی تھی۔ لوگ عموماً اپنے گھروں میں لذیذ غذائیں کھاتے تھے اور دوسری نعمتوں سے لذت اندوز ہوتے تھے۔ اس لئے جب کبھی انہیں حضرت عمرؓ کے ساتھ کھانا کھانا ہوتا تو وہ اس میں تکلیف کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت عمرؓ کے ایک رفیق ان کے دسترخوان پر بہت ہی حقیر غذا دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور بول اٹھے: آپ تو بہت ہی روکھی پھیکی غذا کھاتے ہیں ـــ میں چاہتا ہوں کہ میرے لئے جو کھانا پکا ہے اسے منگوا لوں۔

حضرت عمرؓ نے کہا: یہ ایک بالکل بے معنیٰ سی بات ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اچھی غذائیں کون ہیں اور کون نہیں ہیں اور میں اگر چاہوں تو ان نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہوں۔ لیکن میرے پیش نظر قرآن کریم کا یہ قول ہے:-

" تم لوگ اپنی دنیاوی زندگیوں میں اس درجہ نعمتوں میں مگن ہو گئے کہ تمہاری نیکیاں زائل سی ہو گئیں۔"

حضرت عمرؓ جو اپنی ذات پر یہ ایثار کرتے تھے وہ اسی جذبہ کے ماتحت تھا کہ مبادا اللہ تعالیٰ کے یہاں انہیں جو نیکیاں اور اجر اور لازوال مسرتیں ملنے والی ہیں ان میں کمی واقع ہو جائے جس وقت آپ نے یہ طے کر لیا کہ تمام اشخاص کا ایک رجسٹر بنایا جائے اور قبیلہ وار لوگوں کے نام لکھوا دیئے جائیں۔ تو آپ کے اہل دفتر نے سب سے پہلے بنی ہاشم کا نام لکھا ـــ

یعنی آنحضرتؐ کے آدمیوں کا۔ پھر بنی تیم ——— یعنی حضرت ابوبکرؓ کے آدمیوں کا پھر بنی عدی یعنی حضرت عمرؓ کے آدمیوں کا نام لکھا۔ اب حضرت عمرؓ نے جب اس دیوان (رجسٹر یا دفتر) کا معائنہ فرمایا تو کہا کہ بخدا میں تو بہت خوش ہوتا کہ ترتیب یہی ہوتی لیکن عمرؓ اور ان کے قبیلے کے اشخاص کا نام وہاں ہونا چاہیے جہاں کا اللہ تعالیٰ نے انہیں مستحق بنایا ہے یعنی جو آنحضرتؐ سے جتنا قریب ہو اتنا ہی اسے اوّلیت اور تقدم ملنے چاہییں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ نے اہل دفتر کی قائم کی ہوئی ترتیب کو تسلیم نہیں کیا اور انہیں اس کے اعادے کا حکم دیا اور یہ فرمایا:۔

" قریش میں اسماء کی ترتیب از روئے قرابت نبوی ہونی چاہیے اور اس نقطہ نگاہ سے بنی عدی (آپ کے خاندان کے لوگ) جہاں بھی جگہ پائیں انہیں دیوان میں جگہ رہنی چاہیے"

ایک قول یہ بھی ہے کہ ترتیب اسماء میں نظرثانی کے بعد بنی عدی کے لوگ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور اس باب میں ان سے گفتگو کی اور کہا:۔

" حضرت ابوبکر رسول اللہ کے خلیفہ ہیں اور تم ابوبکرؓ کے خلیفہ ہو تو اگر دیوان کو جوں کا توں رہنے دو تو اس سے کیا حرج واقع ہو جائے گا" حضرت عمرؓ نے ان لوگوں سے کہا:۔

" بہت خوب! میرے خاندان والے یہ چاہتے ہیں کہ میرے منصب سے فائدہ اٹھائیں اور میری نیکیوں کو زائل ہو جانے دیں۔ بخدا میں اپنے قرابت داروں کو صرف اس نسبت سے دیوان میں جگہ دوں گا جس نسبت سے وہ آنحضرتؐ سے قریب ہیں"

حضرت عمرؓ کی یہ شدت پسندی اور اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ذات کے ساتھ یہ سخت گیری اور یہ ایثار پسندانہ سلوک محض اس لئے نہ تھے کہ آپ اپنی نیکیوں کو برباد نہیں ہونا دینا چاہتے تھے۔ اس کے پیچھے ایک اور جذبہ بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ آپ ہمیشہ اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہتے تھے کہ رسالت مآبؐ نے کس حد تک زندگی کی سختیاں اٹھائی تھیں۔ ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کی زندگی انتہائی سخت زندگی تھی ——— مادی اعتبار سے اس درجہ تنگ کہ کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تھی۔ لیکن رسالت مآبؐ کس خندہ پیشانی

سے اس کٹھن زندگی کو نباہتے تھے۔ جب میسر آجاتا تھا کھا لیتے تھے اور جب کھانے کو کچھ نہ ہوتا تھا تو روزہ رکھ لیتے تھے۔

اپنے دوران خلافت حضرت ابوبکرؓ کی زندگی بھی ہر قسم کے عیش و راحت سے دور تھی۔ ابوبکرؓ کی زندگی شدت اور تنگی کا ایک نمونہ تھی جس میں راحت اور آسائش کا دور دور نشان نہ تھا۔ فاروق اعظمؓ اس بات کو مستقل ذہن میں رکھتے تھے اور جس بات کو حد درجہ ناپسند فرماتے تھے وہ یہ تھی کہ آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ سے بہتر لباس پہنیں یا کھائیں۔ جن دنوں مدینے میں دولت کے انبار لگ رہے تھے اور حریم خلافت میں مال غنیمت لدلد کے آتا تھا تو حضرت عمرؓ کو رسالت مآبؐ اور خلیفۃ الرسولؓ کی ناداریاں اور سیم و زر سے مطلق محرومیاں یاد آتی تھیں۔ انہیں یاد کر کر کے آپ پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو روتے روتے آپ کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں آپ کی اس گریہ وزاری سے اہل مجلس بھی متاثر ہوتے تھے۔ آپ کی زندگی کی مطلق بے سروسامانی دیکھ کے بعض دوست بے تاب ہی تو ہوگئے اور اس باب میں ان لوگوں نے حضرت حفصہؓ سے درخواست کی کہ وہ اپنے فقر منش والد سے آسائش کی زندگی کی سفارش کریں یا کم از کم اس بات کی کہ وہ اس درجہ ریاضت اور جفاکشی کو ترک کردیں۔ چنانچہ حضرت حفصہؓ نے ایسا ہی کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس پیش کش کو بالکل قبول نہ کیا اور الٹے حضرت حفصہؓ کو آنحضرتؐ کی زندگی کی ناداریاں اور مصیبتیں یاد دلائیں اور اس حد تک ان باتوں کا ذکر کیا کہ خود حضرت حفصہؓ رو پڑیں۔

حضرت عمرؓ نے یہ جو نفس کشی اختیار کی تھی اس سے ہماری سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ انہوں نے اس سال جب جزیرہ نمائے عرب پر قحط کی مصیبت نازل ہوئی تھی اور لوگ مردار تک کھانے پر مجبور ہوگئے تھے یعنی چوہوں وغیرہ کو ان کے بلوں سے نکال نکال کے کھانے تک ـــ کیوں اپنی تاریخی ایثار پسندانہ اور جفاکشانہ روش اختیار کی تھی۔

یہ بلاخیز دور نو مہینے تک رہا اور ان مہینوں میں حضرت عمرؓ نے ایک ایسی روش اختیار کی جس کی عالمی تاریخ میں کوئی بھی مثال نہیں ملتی۔ قحط کی وبا اکثر و بیشتر مختلف ملکوں پر نازل ہوئی ہے اور لوگ اکثر بھوک سے برباد اور ہلاک ہوئے ہیں اور ان کے حکمرانوں نے

ان سے اس منحوس مصیبت کی سختی بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ہمیں تاریخ نے یہ نہیں بتایا کہ ان حکمرانوں میں کسی نے کبھی خود بھوک میں بھی عام انسانوں کا ساتھ دیا ہو۔ حضرت عمرؓ نے جس طرح حجاز اور نجد اور تہامہ کے لوگوں کا بھوک اور مصیبت میں ساتھ دیا ہے اور اس میں شرکت کی ہے اس کی ہمیں عالمی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

عام لوگوں کی طرح حضرت عمرؓ بھی عملی طور پر بھوکے رہتے تھے۔ اس مدت میں جو خشک سالی اور قحط کی قیامت خیز مدت تھی حضرت عمرؓ نے اپنے لئے راحت اور آرام حرام کر لئے تھے حد یہ ہوگئی کہ وہ ایک زمانے میں زیتون کے پھلوں پر گزارہ کرنے لگے کبھی اسے یوں ہی کھا جاتے اور کبھی پکوا کے۔ آپ نے اس کثرت سے زیتون استعمال کی کہ بالکل پہچانے نہ جاتے تھے۔ مدینہ میں اور مدینہ کے باہر جو بادیہ نشین لوگ تھے ان کے لئے آپ خود اپنی پلیٹھ پر لاد کر غذا کا سامان پہنچا آتے تھے۔ یہ کام آپ کسی دوسرے کو نہیں کرنے دیتے تھے۔ یہی نہیں آپ یہ اطمینان بھی پیدا کر لیا کرتے تھے کہ جن لوگوں کے لئے یہ غذا لے جائی جا رہی ہے ان تک یہ پہنچ بھی چکی ہے اور انہوں نے اسے کھا بھی لیا ہے۔ اطراف کے لوگ جب بہت تنگ آگئے تو اپنی جان بچانے کے لئے چاروں طرف سے کھانے کی تلاش میں مدینہ پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت عمرؓ نہیں چاہتے تھے کہ اہل مدینہ مزید پریشان ہوں اس لئے ان بادیہ نشینوں کو آپ نے مدینہ کے نواح میں جگہ دے دی تھی۔ آپ انتہائی کوشش اس بات کی فرماتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے لوگوں کو ضروری غذا اور لباس میسر آتے رہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آپ پر ان لوگوں کا جو قحط کی مصیبت پر صبر و شکر کئے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے تھے اور وہاں سے نکل کر نہ آئے تھے خیال منقطع نہ تھا۔ آپ نے مختلف صوبوں کے حاکموں کو لکھ دیا تھا کہ غذائی سامان بھیجیں۔

اس کے بعد آپ نے بہت سے آدمی اس بات پر مامور کر دیے تھے کہ ان غذائی سامانوں کو مرکز کی طرف سے وصول کر کے لوگوں کو کھلانے پلانے کا بندوبست کریں۔ یہی نہیں۔ انہیں اتنا دے دیں کہ وہ بعد کی ممکنہ مصیبتوں سے بھی نبرد آزما ہو سکیں۔

ان چند مہینوں میں کیا نزدیک کے لوگ اور کیا دور کے لوگ حضرت عمرؓ نے قلمرو کے تمام آدمیوں کا انتہا درجے کا خیال رکھا۔ نگہداشت کا حق ادا کیا اور ایسا کرنے میں اپنی ذات

پر اتنی تکلیفیں گوارا کیں کہ لوگوں کو آپؓ کی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس مدت میں حضرت عمرؓ نے ہر قسم کی آسائش ہر طرح کی راحت سب کچھ اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ محض عوام کے دردناک مسائل ہی نہ تھے جنہوں نے آپ کو خستہ حال اور کوفتہ کر رکھا تھا۔ آپ کے زندہ اور بیدار ضمیر میں نئے نئے افکار پیدا ہوتے تھے۔ آپ کو ڈر یہ تھا کہ کہیں آپ کی خلافت کے زمانے میں یا آپ کے ہاتھوں سے امت محمدی ہلاک نہ ہو جائے۔

حضرت عمرؓ عموماً تمام دنوں میں زیادہ رات گزر جانے پر نماز پڑھنا پسند فرماتے تھے۔ لیکن جب عرب خشک سالی کی مصیبت میں مبتلا ہوئے تو حضرت عمرؓ تہجد وغیرہ صرف اس صورت میں پڑھتے تھے جب انہیں قوم کے مسائل فرصت دیتے تھے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا حضرت عمرؓ نے اپنے لئے وہ آسائش بھی حرام کر رکھی تھیں جو متوسط درجہ کے لوگوں کو میسر تھیں۔ مثلاً گوشت وغیرہ اس وقت کھا لیا کرتے تھے جب نادار اور انتہائی غریب لوگوں کے لئے کوئی بھیڑ یا بکری ذبح ہوتی تھی۔ اسی طرح گھی سے بالکل پرہیز کرنے لگے تھے۔ اسے اپنے اوپر حرام سا کر لیا تھا۔ اور زیتون پر گزارہ کرنے لگے تھے۔ جب مستقل زیتون کے استعمال سے آپ کو تکلیف پہنچی تو آپ نے سوچا کہ اسے پکوا لیا کریں تاکہ اس کی حدت کم ہو جائے۔ لیکن اسے پکوا کے کھانے پر آپ نے اسے پھر اور بھی ناقابل برداشت پایا۔ جب آپ اسے کھاتے تو شکم مبارک میں جانے کے بعد اس سے مروڑ سا پیدا ہوتا اور قر قر کی آواز پیدا ہونے لگتی۔

حضرت عمرؓ اس پر اپنے شکم پر ہاتھ مارتے تھے اور اس سے مخاطب ہو کر کہتے تھے:

"کہ اے شکم کچھ بھی ہو تجھے یہی کھانا پڑے گا اور یہ چیز اس وقت تک جاری رہے گی جب تک لوگ اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ان مہینوں میں آپ کی یہ سخت گیری محض اپنی ذات پر نہ تھی بیوی بچوں پر بھی تھی۔"

آپ اپنے کنبہ والوں کو ملت کی اس عمومی تباہی کے موقع پر ہر قسم کی آسائش سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے آپ ان سے فرماتے تھے:۔

"ہم اس دور میں صرف اتنا کھائیں گے جتنا بیت المال سے عام سے عام مسلمانوں کے لئے مل سکتا ہے۔ اور جب بیت المال میں اس کی بھی سکت نہ رہ جائے گی تو ہم ہر ایک گھر پر ایک عدد دوسرے گھر کے افراد کے کھلانے پلانے کی ذمہ داری ڈال دیں گے تاکہ ان لوگوں کو جو کچھ میسر آئے اسے آپس میں بانٹ کھائیں۔ بنیادی طور پر یہ حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ عوام کی ضروریات کا بندوبست کرے۔ لیکن اگر حکومت ایسا نہ کر سکے گی تو پھر مختلف گھروں پر یہ ذمہ داری عائد کر دی جائے گی تاکہ اس رنج و مصیبت میں سب ہی برابر کے شریک رہیں۔ کم از کم تھوڑا تھوڑا کھا لینے سے لوگ مرنے سے تو بچ رہیں گے اور یہ قلیل مقدار میں کھانا اس بھوک سے بہر صورت بہتر ہوگا جو لوگوں کو مطلقاً ہلاک کر دے۔ حضرت عمرؓ اس بات کو کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ سوسائٹی کا ایک طبقہ آسودہ رہے اور ایک بھوک سے مر جائے۔ اس کے علاوہ اگرچہ حضرت عمرؓ کچھ لوگوں کو فاقہ کی موت سے نہ بچا سکے تھے۔ تاہم اندرونی علاقوں میں غذائی سامان بھیج کر آپ نے بڑی حد تک صورت حال پر قابو پا لیا تھا۔ بعض لوگ جو مدینہ کے نواح میں آ کے پڑ گئے تھے فاقہ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ حضرت عمرؓ ان شوریدہ بختوں کی نماز جنازہ پڑھاتے تھے اور ان کی قبروں پر بھی جایا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے ضمیر انور کی یہ بیداری امت کے لئے یہ دلسوزی آسائش مردم کا یہ جان لیوا خیال ایک پوری بھوکی قوم کو کھلانے کا یہ زبردست عزم ان تمام باتوں سے فاروق اعظمؓ کی ان چند مہینوں کی زندگی کا ایک تصور کیا جا سکتا ہے درحاصل حضرت عمرؓ ان دنوں میں اپنی ہر شام کو شام غم سمجھا کئے۔ اور ہر صبح کو صبح ہی کی طرح چاک گریباں رہا کئے۔ بیشمار موقعوں پر اس مدت میں آپ روئے بھی اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ امت کے سر پر اس آئی بلا کو ٹال دے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ جب خشک سالی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور امت محمدی کرب و اضطراب سے مطلقاً نڈھال ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے اور آپ کے ساتھ تمام لوگوں نے استسقاء کی نماز پڑھی جس میں اللہ تعالیٰ سے باران رحمت کا مطالبہ کیا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی بیان کیا کہ استسقاء

ادا کرتے ہوئے آپ نے آنحضرتؐ کے چچا حضرت عباسؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ان کے وسیلے سے پانی کی دعا مانگی تھی اور ادھر دعا ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ مطلع ابر آلود ہو گیا تھا۔

حضرت عباسؓ کے وسیلہ سے "طلب آب" کی روایت کا جعلی ہونا بالکل ظاہر ہے اس روایت کا مقصد بظاہر اس کے علاوہ کچھ اور نہیں معلوم ہوتا ہے کہ عباسی دور میں بعض محدثین دربار کی خوشامد کرنی چاہتے تھے۔

لیکن ایک بات بالکل یقینی ہے کہ حضرت عمرؓ نے نماز استسقاء اسی انداز میں ادا کی جس انداز میں رسالت مآبؐ ادا فرماتے تھے۔ اس نماز کے تھوڑے وقفہ کے بعد یا شاید زیادہ وقفہ کے بعد بارش ہوئی تھی۔ جس وقت بارش ہو گئی تو حضرت عمرؓ بے حد مسرور ہوئے اور آپ نے اس بات کی کوشش کی کہ دور دور سے آئے ہوئے بادیہ نشینوں کو ان کے وطن پہنچا دیا جائے تاکہ اس عظیم مصیبت سے پہلے لوگ جن جن مشغلوں میں منہمک تھے ان میں پھر سے لگ جائیں۔

باب ۴

حضرت عمرؓ کی امانت اور درویشی

حضرت عمرؓ اپنی ذات اور اپنے نفس پر حد درجہ ایثار روا رکھتے تھے اور بیت المال کے معاملہ میں آپ کی یہی سخت گیری دوسروں کے لئے بھی تھی اپنی ذات اور اپنے متعلقین کے لئے آپ جو کچھ بیت المال سے لیتے تھے (جسے بعد میں آپ نے اپنے ترکہ سے کچھ کر ادا کروا دیا) اس کا زبردست محاسبہ فرماتے تھے۔ آپ فرماتے تھے ۔

" امت کی یہ دولت اسی طرح میری نگرانی میں رہے گی جیسے یتیموں کا مال، جس کا ناجائز طور پر کھانا مطلقاً حرام ہے اس کے بعد آپ اکثر سورۃ نساء کے چند الفاظ دہراتے تھے جن کا مطلب یہ ہے ۔"

" جو شخص آسودہ حال ہو اس کو ایسے مال سے قطعی طور پر پرہیز رکھنا چاہیے اور جو بے مقدور ہو وہ مناسب طور پر یعنی بقدر خدمت کچھ لے لے "

سورۃ نساء ۱ آیت ۶

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا تھا کہ میں بیت المال کی دولت کو مال یتیم کی طرح مقدس اور ناقابل خرد برد گردانتا ہوں۔ جب مجھے شدید ضرورت پیش آئے گی میں اس میں سے لے کے کچھ کھا لوں گا لیکن اگر میرے پاس اتنا ہوگا کہ میں اپنا کام چلا سکوں گا تو میں ہرگز اس دولت کو نہ ہاتھ لگاؤں گا۔ کبھی کبھی حضرت عمرؓ اپنی مثال ایک ایسے شخص کی دیتے تھے جو چند لوگوں کے ساتھ سفر میں نکلا ہو اور اس کے پاس ان تمام لوگوں کا مال و

اسباب امانتاً رکھوا دیا گیا ہو۔ اب اس شخص کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ بغیر ساتھیوں کی مرضی کے اس امانت کے مال میں خورد برد کرے۔ اس سخت گیری اور درویش منشی کے باوجود حضرت عمرؓ نے اپنے دوستوں سے اس باب میں کہ بیت المال سے وہ کتنا لے سکتے ہیں، مشورہ کیا تھا۔ کچھ لوگوں نے تو یہ کہا کہ آپ اس قدر لے سکتے ہیں جتنا کہ آپ کے لئے اور آپ کے متعلقین کے لئے ضروری ہو اور ان کے مصارف کو پورا کر سکے، لیکن حضرت علیؓ نے یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ صرف دو وقت کے کھانے بھر کی رقم لے سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ ہی کا مشورہ قبول کیا۔ چنانچہ آپ بیت المال سے صرف اس حد تک لیتے تھے جس کی واقعی ضرورت ہوتی تھی۔ اپنے اہل و عیال کو آپ اوسط درجہ کے لوگوں کا کھانا کھلاتے تھے۔ اپنے پہننے کے لئے آپ بیت المال سے کچھ کپڑے بھی لیتے تھے۔ بس ایک جوڑا گرمی کے لئے اور ایک جاڑے کے لئے!

اس میں آپ اپنی ذات پر انتہا درجہ کا تشدد فرماتے تھے۔ کپڑے جب تک بالکل ہی پھٹ نہ جاتے تھے آپ دوسرے کپڑے نہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی کیا اکثر کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے۔ ٹانکے لگاتے تھے۔ کبھی کبھی تو آپ ببول کے کانٹوں سے اپنے پیراہن خلافت کی دریدگی میں رفو فرماتے تھے!

روایت ہے کہ ایک دن آپ کو جمعہ میں دیر ہوئی۔ لوگ بہت دیر تک منتظر رہے لیکن آپ نہ آئے لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہوا ہی چاہتا تھا کہ حضرت عمرؓ خطاب کرنے کے لئے منبر پر بیٹھ گئے اور دیر سے آنے کی معذرت چاہی۔ دیر سے آنے کا سبب یہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی قمیص دھوئی تھی جسے خشک کرنا چاہتے تھے وہ اب تک خشک نہ ہوئی تھی۔

حضرت عمرؓ کے پاس اتنی دولت یقیناً تھی کہ وہ آسودگی اور فراغت میں بسر کر سکتے تھے لیکن آپ کو یہ بات بالکل پسند نہ تھی کہ لوگوں کو یہ بدظنی تک پیدا ہو سکے کہ یہ آسودگی اور خوشحالی بیت المال کی رقم کی بنیاد پر ہے۔

حضرت عمرؓ کے اس زہد اور اس اتقا اور اس درویشی کا سبب یہ بھی تھا کہ آپ کو آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ کا طریق زندگی منظور تھا۔

آپ فرمایا کرتے تھے ۔

" میرے دو رفیق ہیں ان دونوں نے ایک خاص انداز میں زندگی کے دن کاٹے ہیں اور میری یہ خواہش ہے کہ ہو بہو ان کے طریقوں پر عمل کروں کیونکہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو بعد میں میری مثال سے دوسرے بھی آنحضرتؐ اور صدیق اکبرؓ کی روشوں سے انحراف کریں گے ۔ "

اس کے باوجود فاروق اعظمؓ بیت المال سے قرض لینے کو جائز سمجھتے تھے ۔ جسے وہ میسر آجانے پر واپس بھی کر دیا کرتے تھے ۔ جب ادائیگی میں دیر ہوتی تو بیت المال کا منصرم آ کے تقاضا بھی کر دیا کرتا تھا ۔ اور حضرت عمرؓ کوئی نہ کوئی صورت کر کے اس قرض کو ادا کر دیتے تھے ۔ کبھی کبھی یہ قرض اس رقم سے ادا ہوتا تھا جو آپ کو اس عطیہ کی شکل میں ملتی تھی جو حکومت ، قوم کے افراد میں بانٹتی تھی ۔

زخمی ہونے کے بعد جب آپ کو اپنی موت کا احساس ہونے لگا تو آپ نے ان تمام رقوم کا حساب لگایا جو آپ کے نزدیک بیت المال کا قرضہ تھیں ۔ یہ رقوم آٹھ ہزار درہم سے کچھ زائد تھیں ۔ حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے کو حکم دیا کہ وہ اس رقم کو بیت المال کو ادا کر دیں ۔ آپ نے ان سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو پہلے میری دولت کا پھر میری اولاد کی دولت کا اندازہ لگاؤ ۔ اگر ان کی دی ہوئی رقوم سے کام بن جائے تو خیر ورنہ قریش سے بحیثیت قبیلہ اس رقم کا مطالبہ کرنا ۔ لیکن بہر صورت اس پوری رقم کو مسلمانوں کے بیت المال میں پہنچ جانا چاہیئے ۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمرؓ کی وفات پر ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ یہ رقم ادا ہو گئی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت عثمانؓ یعنی نئے خلیفہ سے ، اس رقم کی ادائیگی کی رسید لے لی !

میرا خیال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے دراصل یہ قرض نہیں واپس کیا تھا بلکہ یہ اس تمام رقم کا مجموعہ تھا جو حضرت نے اپنی اور اپنی اولاد کی کفالت کے لئے بیت المال سے لیا تھا اس میں آپ کا بھتہ اور تنخواہ وغیرہ تمام چیزیں شامل تھیں ۔

اور ابوبکرؓ کی تقلید کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اسے بھی قرض ہی سمجھا تھا۔ گویا بحیثیت امیر المومنین کے آپ نے اپنا پورا دور خدمت اعزازی طور پر گزارا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ نے بیت المال کو اپنی زمین دے ڈالی تھی تاکہ اس زمین کی پیداوار سے ان کے بیت المال سے لئے ہوئے تمام کے تمام بھتے اور الاؤنس ادا ہو جائیں۔ میرے نزدیک یہی حضرت عمرؓ نے بھی کیا تھا۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ نے بیت المال سے قرض بالکل نہیں لیا اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ بیت المال کو اپنا قرض واپس کرتے وقت حضرت عمرؓ نے ان تمام رقوم کو بھی شامل کر لیا جو آپ کو جائز طور پر بحیثیت امیر المومنین کے موصول ہوئی تھیں۔ اس میں جاڑے گرمی کے ان دو جوڑے کپڑوں کی بھی قیمت شامل تھی جو آپ پہننے کے لئے بیت المال سے لیا کرتے تھے۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے :۔

" میں چاہتا ہوں کہ جس وقت میں خلافت کی ذمہ داری اپنے جانشین کو سونپوں تو میرا خلافت پر یا خلافت کا (یعنی منصب خلافت کا) مجھ پر کچھ باقی نہ رہے۔ اور میرا حساب مطلقاً پاک اور صاف ہو۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یعنی آپ جب اس منصب جلیلہ سے فارغ ہوئے تو آپ کی طرف مقام خلافت کا، حکومت کا، کوئی حساب نہ تھا اس کے برعکس آپ کی ذات سے خود منصب خلافت مستفید ہوا تھا۔ اُمّت پر آپ کے بے شمار اور زبردست احسانات کئے تھے۔ امیروں اور غریبوں، سب پر آپ کے احسانات تھے۔ آپ کی ذات سے عربوں کو ایک ایسا نظام سیاست میسر آیا جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ آپ ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا تھا۔ ایسا معیار، جس تک پہنچنے سے عالم انسانیت آج تک باوجود کوشش پیہم قاصر ہے۔

اگر حضرت عمرؓ کا پیش کردہ معیار بعد میں نہ رہ سکا اور مسلمان اسے برقرار رکھنے اور اس پر جمے رہنے سے قاصر رہے تو اس میں حضرت عمرؓ کا قطعاً کوئی قصور نہیں

سورۃ النجم کی آیت : ۳۶ - ۴۱ ملاحظہ ہو :-

" کیا جو باتیں موسیٰ کے صحیفوں میں ہیں ان کی اس کو خبر نہیں پہنچی اور ابراہیم کی جنہوں نے حق طاعت و رسالت کو پورا کیا اور یہ کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا "

اب جن لوگوں نے اس نظام کو پس پشت ڈالا ہے اور سنت عمرؓ سے گریزاں ہوئے ہیں ان پر تلافی مافات کا فرض عائد ہوتا ہے ۔ حضرت عمرؓ کو امت کی خدمت جلیلہ اور عدل اور امن اور مساوات کے سائے میں مسلمانوں کے لیے حصول عزت و سربلندی کے لئے اللہ کے دربار میں مکمل صلہ عنایت ہوگا ۔

اگلے ابواب میں حضرت عمرؓ کی زبردست کاوشوں اور کوششوں کی جو انہوں نے اپنے دور خلافت میں جو بقول ابن مسعودؓ سراپا رحمت تھا ' اسلام کی سربلندی کے لئے کیں ، تفصیل نظر آئے گی ۔

باب ۵

عراق میں تلخ تجربہ
اور
ابو عبید کی شہادت

خلافت کا بار سنبھالنے کے بعد حضرت عمرؓ کو فتوحات کی تکمیل کی مشکل پیش آئی۔ آپ کو اب یہ فیصلہ بھی کرنا تھا کہ عراق اور شام میں حضرت ابو بکرؓ نے جو فوجی دستے بھیج رکھے تھے ان کا موقف کیا ہو۔

حضرت ابو بکرؓ نے اپنی شام میں بھیجی ہوئی فوج کے لئے جس کے مقابلہ میں ایک بھاری تعداد میں رومی جمع ہو گئے تھے اور جن کو شکست دینا مسلمانوں کے لئے ممکن نہ تھا۔ ایک تدبیر سوچ لی تھی۔ تدبیر یہ تھی کہ آپ نے خالد بن ولیدؓ کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ عراق کے محاذ کو چھوڑ کے شام کی طرف روانہ ہو جائیں اور وہاں رومیوں کے مقابلہ میں اسلامی لشکر کی کمان ہاتھ میں لیں۔ شام میں تو بے شک اسلامی لشکر کو مدد مل گئی لیکن عراق میں جو اسلامی لشکر باقی رہ گیا تھا اسے اب سخت خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ خالدؓ کے عراق پر حملے اور مختلف موقعوں پر ان کی کامیابی اور عراق عرب پر ان کے عمومی غلبے کے بعد ایران نے غیر معمولی احتیاط اور عزم کا ثبوت دیا چنانچہ حضرت خالدؓ کے ان حیرت انگیز کارناموں کا اثر یہ ہوا کہ عربوں کو عراق سے نکال دینے کے لئے پورا ایران بیدار اور تیار ہو گیا۔ ایران کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس زمین پر جس پر ایک مدت سے ان کی بالادستی قائم تھی عربوں کے قدم جم سکیں۔ اب مثنیٰؓ نے جو عراق میں حضرت خالدؓ

کے فوجی نائب تھے یہ محسوس کیا کہ مسلمان ایک عظیم بحران سے دوچار ہیں۔ چنانچہ مثنیٰ نے فوج کی کمان کسی دوسرے شخص کے سپرد کر کے انتہائی عجلت کے ساتھ مدینہ کا رُخ اختیار کیا تاکہ صدیق اکبرؓ کو صورتِ حال سے واقف کریں۔ صدیقِ اکبرؓ مرض الموت میں گرفتار تھے اس لئے خود کچھ نہ کر سکتے تھے تاہم مثنیٰ نے حضرت ابوبکرؓ سے عراق میں مسلمانوں کی پوزیشن واضح کی اور انھیں یہ بھی بتایا کہ مسلمان کتنے سخت مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اس سے زیادہ کچھ اور نہ کر سکتے تھے کہ عراق کی صورتِ حال سے اپنے باہمت جانشین کو آگاہ کریں اور ان سے اس بات کی سفارش کریں کہ عراق کی مہم کو پوری پوری اہمیت دیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے خلافت کے پہلے ہی دن سے اس مہم کا آغاز کر دیا اور لوگوں سے عراق کی مہم پر روانہ ہونے کی اپیل کی۔ تین دن برابر حضرت عمرؓ نے قوم کو پکارا اور اکسایا اور آتش جہاد کو بھڑکایا مگر ان تینوں دنوں میں کوئی بھی تو آمادۂ جہاد نہ ہوا۔ چوتھے دن ابوعبید ابن مسعود ثقفی نے اپنے کو رضاکارانہ طور پر عراق کے جہاد کے لئے زبردست اصرار کیا۔ عمرؓ کی خطابت رنگ لائی اور ایک ہزار آدمی عراق کی مہم پر جانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے باوجود لوگوں کے اس اصرار کے کہ لشکر کی کمان کسی سن رسیدہ، برگزیدہ، گرم و سرد زمانہ چشیدہ، آزمودہ، صحابی کو عطا کی جائے۔ فرمانِ لشکر نوجوان مسعود کے سپرد کیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ابوبکری سیاست سے انحراف کرتے ہوئے ان لوگوں کو بھی جہاد میں شرکت کی اجازت دے دی جو ایک بار مرتد ہو چکے تھے اور جنہیں حضرت ابوبکرؓ نے جہاد سے سزا کے طور پر محروم کر دیا تھا۔ یہ ہونا تھا کہ لوگ شوقِ جہاد میں مرکز کی طرف ٹوٹ پڑے۔ چنانچہ یمنی لوگوں کو بھی لشکر میں شریک ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ اب ابوعبیدہ اسلامی لشکر کو لے کے عراق کی جانب روانہ ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں چلتے وقت احتیاط اور مآل اندیشی کا حکم دیا۔ ابوعبید عراق پہنچے اور مثنیٰ ان کے ایک نائب کی حیثیت سے ان کے ساتھ ساتھ گئے۔ جو مسلمان وہاں پہلے سے موجود تھے وہ بھی اب نئے قائد کی سرداری اور فرمان میں آ چکے تھے۔ ایران سے مقابلے کی تیاری شروع ہو گئی۔ ابوعبید میں خرابی یہ تھی کہ ان کی جرأت اور شجاعت سے

ان کی بردباری کو دبا رکھا تھا۔ ابو عبید کے آدمیوں نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ دریائے فرات کو عبور نہ کریں تاکہ اگر اسلامی لشکر جیت جائے تو خیر لیکن اگر شکست پا جائے تو اس صورت میں دریائے فرات ان کے اور دشمن کے درمیان حائل ہو سکے اور انھیں مسلمانوں کے گروہوں سے جا ملنے میں مدد دے لیکن ابو عبید کی شجاعت ان کے تدبر پر غالب آئی اور انھوں نے یہ پسند نہ کیا کہ مورخ، ایرانیوں کو مسلمانوں سے زیادہ بہادر تسلیم کرے۔ چنانچہ دریائے فرات کا پل کاٹ دیا کہ بعد میں کوئی مسلمان بھاگنے کا خیال دل میں نہ لا سکے، انہوں نے اپنے آدمیوں سمیت دریائے فرات کو عبور کر لیا۔ اس دور کی یہ بات ہے جب مسلمان فرار سے زیادہ مکروہ اور قابل نفرت کسی چیز کو نہ سمجھتے تھے میدان کارزار میں ہر موقع پر ان کے پیش نظر سورۂ انفال کی یہ آتشین اور شجاعت خیز آیتیں رہتی تھیں:۔

انفال آیت ۱۵-۱۶

"اے اہل ایمان! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ پھیرنا اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا کہ لڑائی کے لئے کنارے کنارے چلے یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے ان سے پیٹھ پھیرے گا تو سمجھو کہ وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔"

ان دنوں میں جب کبھی مسلمان شریک جہاد ہوا کرتے تھے ان کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ یا تو وہ فتح یاب اور کامران ہوں اور ان کو قیامت کے دن اللہ کے کرم سے نوازا جائے یا وہ شہادت کا جام نوش کریں جس کے صلہ میں انھیں فردوس بریں کا عطیہ ملے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

سورۃ توبہ آیت ۱۱۱

"خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں اور اس کے عوض میں ان کے لئے بہشت تیار کی ہے۔ یہ لوگ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں تو مارتے بھی ہیں اور مارے جاتے بھی ہیں۔ یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے

جس کا پورا کرنا اسے ضرور ہے اور خدا سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔ تو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو اور یہی بڑی کامیابی ہے۔"

مسلمان آگے بڑھے تو قرآن مجید کی ان دو ولولہ انگیز آیتوں سے مسلح تھے۔ قرآن مجید کی بقیہ آیات بھی اپنے عادلانہ اور جہاں پرورانہ فلسفہ کے ساتھ لشکر مسلم کے سپاہیوں کے لئے مشعلِ راہ تھیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے بے جگری سے جنگ کی اور ان کے قائد نے آگے بڑھنے اور داد شجاعت دینے میں سب کرمات کر دیا۔ مصیبت یہ تھی کہ ایک تو ایرانیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی دوسرے وہ میدان جنگ میں ایک ایسی چیز لے کے آئے تھے جو عربوں نے جنگ کے میدان میں اس کا سامنا نہ کیا تھا۔

کہنا یہ ہے کہ ایرانی فوج میں ہاتھی بھی تھے۔ عربوں کے گھوڑوں نے جب ہاتھیوں کو دیکھا تو بھاگنا شروع کیا۔ ان ہاتھیوں کے آگے آگے ایک بہت ہی عظیم الجثہ ہاتھی تھا۔ یہ ہاتھی ابو عبید پر جھپٹا۔ ابو عبید نے ہاتھی پر تیر چلایا لیکن ہاتھی نے جس وقت تیر افگنی کی جراحت محسوس کی تو غضب آلود ہو گیا اور ابو عبید کو زمین پر دے مارا اور روند ڈالا۔ اس دن بے شمار مسلمان داد شجاعت دے کر ہلاک ہوئے۔ انجام کار اسلامی لشکر میدان چھوڑنے پر مجبور ہوا لیکن دریا ان کے پیچھے تھا چنانچہ ایک ایک کرکے وہ دریا میں گرنے لگے اور ڈوب گئے اب مثنیٰ اور ان کے ساتھی آگے بڑھے اور فرات کے ساحل پر آئے اور پل باندھنے کی زبردست کوشش کی تاکہ باقی ماندہ مسلمان اس طرف آ جائیں۔ اب مسلمانوں میں سکت بالکل نہ رہ گئی تھی۔ بے شمار مسلمان زخمی ہو گئے تھے۔ بہت سے منتشر ہو گئے تھے اور کچھ لوگ مدینہ لوٹ آئے تھے۔

شکست کی خبر حضرت عمرؓ کو دی گئی۔ حضرت عمرؓ خبر سنکر روئے اور فرمایا:

" اللہ ابو عبیدہ پر رحم کرے۔ کاش وہ میدان چھوڑنے کے بعد اس طرف آسکتے تو میں خود ان کے ساتھ جا کے لڑتا۔ حضرت عمرؓ ہار کے آنے والوں کو یہ یقین دلایا کرتے تھے کہ ان کا انجام ان لوگوں کا سا نہ ہوگا جو میدان جنگ میں پیٹھ دکھاتے ہیں اور قرآن کی رو سے شدید سزا اور دوزخ کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

اس لئے کہ ان لوگوں نے میدانِ جنگ سے ایک خاص صورت حال کے پیشِ نظر اپنے کو نکالنے کی کوشش کی تھی اور ان کا قصد یہ تھا کہ مسلمانوں سے مل جانے کے بعد از سرِ نو دشمن پر حملہ کریں۔

پل کے واقعہ کے بعد حضرت عمرؓ پر شدید اثر ہوا اور انھوں نے ایران سے جنگ کی از سرِ نو تیاری شروع کر دی۔ چنانچہ آپ مدینہ سے باہر نکلے اور ایک عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے اس ارادے کا اظہار کیا کہ ایران کی مہم کی قیادت آپ خود فرمائیں گے اس سلسلہ میں آپ نے لوگوں سے مشورہ کیا۔ چند لوگوں کی رائے تو یہ ہوئی کہ حضرت عمرؓ اپنے ارادے کی تکمیل فرمائیں اور جہاد کے لئے تشریف لے جائیں اس لئے کہ آپ کے جانے سے مسلمانوں میں ایک نیا ولولۂ جہاد پیدا ہوگا۔ لیکن صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد اس رائے کے خلاف تھی۔ اکثریت کا مطالبہ تھا کہ حضرت عمرؓ مدینہ ہی میں رہیں تاکہ اسلام آپ پر بھروسہ کر سکے اور آپ اسلامی لشکروں کی مرکز سے ہر قسم کی مدد کر سکیں۔ مسلمان یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس نازک مرحلے پر حضرت عمرؓ کی ذات گرامی سے محروم ہو جانے کا خطرہ مول لیں۔ اس لئے کہ آپ کی قیادت کے بغیر شائد مسلمان آسانی سے پھر آمادۂ جہاد نہ ہوتے چنانچہ طے یہ پایا کہ آنحضرتؐ کے صحابیوں میں کوئی ممتاز، شجاع اور آزمودہ کار صحابی اس مہم پر روانہ کیا جائے لوگوں نے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کا نام لیا حضرت سعدؓ اس وقت مدینہ میں موجود نہ تھے انھیں بلا بھیجا گیا۔ حضرت عمرؓ نے انھیں مسلمانوں کے لشکر کا امیر بنایا اور انھیں اس بات کی ہدایت کی کہ وہ سر دست مسلمانوں کو لے کر حملہ وغیرہ نہ کریں اور عراق کے آباد اور عرب کے غیر آباد علاقہ کے درمیان اسلامی لشکر کو لے کر بیٹھ جائیں اور امداد کا انتظار کریں۔

حضرت سعدؓ راستے میں پڑنے والے قبائل سے سپاہیوں کو بھرتی کرتے ہوئے گزرے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی جہاں تک ممکن ہو سکا سعدؓ کی مدد کی۔ اس وقت صورت یہ تھی کہ پچھلے حوادث کے اثر سے مسلمان شام میں جہاد کرنے کو

عراق میں جہاد کرنے پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ عراق کو کسی حال میں چھوڑنے والے نہ تھے۔ بعض اوقات تو آپ نے مال و دولت کا وعدہ کر کے بھی لوگوں کو عراق کی مہم کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ سعدؓ نے فاروقی احکامات کے مطابق ایک بہت بڑے اسلامی لشکر کو لے کر عراق کے قریب لیکن سرزمین عرب سے قدرے نزدیک جگہ پر ڈیرے ڈال دیئے اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ حضرت عمرؓ انھیں کب پیش قدمی کی اجازت دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو یہ حکم بھی دے رکھا تھا کہ انہیں ہر روز لشکر کے تازہ ترین حالات سے مطلع کرتے رہیں اور جب تک حضرت عمرؓ سے اجازت نہ لی جائے۔ حضرت سعدؓ کسی نئی جگہ نہ قیام کریں تاکہ انھیں تمام واقعات اور فوجی نقل و حرکت کی خبر ملتی رہے۔

باب ۶

حضرت عمرؓ کے سیاسی
اور
انتظامی اجتہادات

شام کے معاملہ میں بھی حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی سیاست کو قائم رکھنا مناسب نہیں سمجھا خلافت کا بار سنبھالتے ہی حضرت عمرؓ نے شام میں بر سرِ پیکار اسلامی فوجوں کو حضرت ابوبکرؓ کی وفات اور حضرت خالدؓ کی معزولی کی اطلاع بھجوائی۔

شام میں صف آرا مجاہدوں کو بتایا گیا کہ حضرت عمرؓ اب نئے سربراہِ مملکت ہیں اور ان کے حکم سے لشکر کی کمان خالدؓ سے لے کر حضرت ابو عبیدہؓ کے سپرد کی جارہی ہے۔ ابو عبیدہؓ کو جو اب امیر الجیش تھے حکم ملا تھا کہ ان مجاہدوں کو جو حضرت خالدؓ کے ساتھ ساتھ عراق سے آئے تھے — از سرِ نو عراق کے ساحلی علاقوں پہ، یعنی جہاں جہاں سے یہ لوگ آئے تھے۔ بھیج دیا جائے۔ ان لوگوں کے لئے، فرمان یہ تھا کہ یہ، عتبہ بن ابی وقاصؓ کی قیادت میں، سعد بن ابی وقاصؓ اور ان کے ساتھیوں کی، ان کی مہم میں جو تاریخی اور سنگین تھی، مدد کریں۔

راویوں کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ کا وہ فرمان جس میں یہ تمام احکامات درج تھے ایک الیسی کا ات

کو لشکر میں پہنچا جب دوسرے دن صبح رومیوں سے مقابلہ کی صلاح ٹھہر گئی تھی۔ چنانچہ مصلحتاً حضرت ابو عبیدہؓ نے اس فرمان کو جس کی رو سے خالدؓ کی جگہ اب وہ امیر عساکر بن چکے تھے، اس نقطہ نگاہ سے مخفی رکھا کہ مبادا اس سے خالدؓ کے جوش جہاد میں، خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ اس تاریخی معرکہ میں امت کے لشکر کے سپہ سالار تھے۔ اور عام مسلمانوں کی تنظیم میں کمی واقع ہو جائے۔

دوسرے دن مسلمان رومیوں سے ٹکرا گئے۔ معرکہ سخت اور شدید اور کمال جرأت کا تھا۔ اس سے پہلے رومیوں سے جنگ کرتے ہوئے مسلمان اس قسم کے کسی معرکہ سے دوچار نہ ہوئے تھے۔ اس بے جگری اور کمال خلوص سے جنگ کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان اللہ کے حکم سے فتحیاب اور مظفر و کامران ہو چکے تھے اور رومی شکست یاب اور نا امید ہو چکے تھے۔ اب شام کی تمام مسدود راہیں کھل چکی تھیں اور مسلمان دمشق کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔

بعض راویوں کا خیال ہے کہ یرموک کا یہ فیصلہ کن اور تاریخ ساز معرکہ فتح دمشق کے بعد کا ہے۔ بہر حال ہمیں اس بحث میں زیادہ الجھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مختلف واقعات کی تاریخوں کے تعین اور ان کے معرض ظہور میں آنے کی ترتیب کے بارے میں اس درجہ اختلافات ہیں کہ کسی متیقن نتیجہ پر پہنچنا تقریباً محال ہے۔

اور یہ محض شام کی مہم ہی کے بارے میں صادق نہیں، ایرانی مہم بھی اسی اختلاف اور عدم تیقن کا شکار ہے۔

ایک بات یقینی ہے، مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ زبردست تھا۔ اور اس نے بہت طول پکڑا۔ جہاں تک حضرت خالدؓ کا تعلق اس دوران میں نہ وہ خود سوئے نہ کسی کو سونے دیا۔ وہ تمام متوقع حادث اور شہر کی جملہ تفصیلات سے متعلق ہمہ وقت چوکنا اور چوکس رہے۔ روایات کی رو سے ایک رات حضرت خالدؓ کو معلوم ہوا کہ سامنے کی شہر پناہ اپنے محافظوں سے خالی ہو چکی ہے۔ شہر پناہ کے محافظ دستہ سے خالی ہو جانے کے جو اسباب بیان ہوئے ہیں وہ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔

بہر حال حضرت خالدؓ بڑی تدبیروں سے دیوار پر چڑھ گئے پھر وہ اور ان کے

ساتھی شہر میں اتر گئے، اس کے بعد یہ لوگ شہر کے اس دروازے کی طرف پہنچے جہاں سے اسلامی لشکر زیادہ قریب تھا۔ اب دروازہ پر متعین دربانوں اور پاسبانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور تکبیر کے نعرہ ہائے جاں بخش و طرب انگیز بلند کرتے ہوئے۔ خالدؓ اور ان کے دلاور سپاہی شہر کے عین وسط میں پہنچ گئے۔

دوسری سمت سے حضرت ابو عبیدہؓ، صلح کرنے کے بعد شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ چنانچہ شہر کے عین وسط میں دونوں اسلامی لشکروں کا اجتماع ہوا۔ ایک لشکر تھا جو لڑتا ہوا آرہا تھا، دوسرا صلح کرنے کے بعد، آرہا تھا۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے خالدؓ کے لشکر کو بھی صلح کا حکم دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق کی یہ فتح صلح کے ذریعہ حاصل کی ہوئی فتح ثابت ہوئی۔

کہا یہ گیا ہے کہ جب تک دمشق فتح نہ ہولیا تھا حضرت ابو عبیدہؓ نے خالدؓ کو حضرت عمرؓ کا فرمان نہیں دکھایا تھا۔ اس کے بعد مسلمان زبردست مشکلات سے گزرے۔ جن پر قابو پانے کا نتیجہ یہ تھا کہ رومیوں کو متعدد مواقع پر منہ کی کھانی پڑی تھی فلسطین پورا فتح ہو چکا تھا اور اردن پر بھی تصرف حاصل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد حمص اور شام کے دوسرے شہروں کی باری تھی۔ قیصر روم اب تک انطاکیہ میں بیٹھا رومی لشکروں کی نگرانی کر رہا تھا اور انھیں مدد بھی پہنچا رہا تھا لیکن اب جب ان مختلف اسلامی فتوحات کا اسے علم ہوا تو اس نے سوریہ یعنی شام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

فلسطین کے مکمل طور پر فتح ہو جانے کے باوجود، مسلمان لشکر ابھی تک بیت المقدس پر قابض نہ ہو سکے تھے اور مدینہ مقدس کا محاصرہ کئے پڑے تھے۔ محاصرہ نے طول کھینچا اور جوں ہی مسلمانوں نے اپنے اندر مزید قوت کا احساس کیا انھوں نے شہر مقدس پر قابض ہونے کا قصد کیا۔ اب اہالی شہر نے صلح کی پیش کش کر دی اور ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ یہ صلح اسی صورت میں مکمل سمجھی جائے گی جب صلح نامہ پر خود امیر المومنین ہی آکے دستخط فرمائیں گے۔ یہ اطلاع حضرت عمرؓ کو بھی

دے دی گئی چنانچہ آپ شام آئے اور صلحنامہ کی تکمیل کے بعد فاتحانہ اور مظفر و منصور بیت المقدس میں داخل ہو گئے۔

حضرت عمرؓ کتنی بار شام تشریف لے گئے؟ کتنی بار اس دیار میں جلوہ فگن ہوئے ۔ راویوں میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک آپ کا کم از کم تین بار شام جانا یقینی ہے پہلی دفعہ تو آپ وہی بیت المقدس کی صلح کی غرض سے گئے تھے ۔ دوسرا موقعہ وہ آیا جب آپ نکلے تو شام ہی کے مقصد سے تھے لیکن سرغ کے مقام پر پہنچنے کے بعد آپ کو معلوم ہوا کہ شام میں طاعون پھوٹ پڑا ہے ۔ یہ وہی طاعون تھا جسے اسلامی مورخ طاعون عمواس کے نام سے جانتے ہیں حضرت عمرؓ شام کے قصد سے نکلے تھے لیکن شام طاعون کی زد میں تھا!

اب حضرت عمرؓ نے لوگوں سے مشورہ کیا کہ آگے بڑھیں یا نہ بڑھیں ۔ سب سے پہلے آپ نے مہاجرین سے پوچھا ۔ ان میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کہیں کسی نے کہا:

"آپ ایک مقصد کو لے کر نکلے ہیں اب لازم ہے کہ اس کی تکمیل کریں اور وہاں تک جائیں ۔ ایک دوسری رائے یہ تھی کہ حضرت عمرؓ کو خود اپنی جان گرامی اور اپنے رفقاء کی جان کو خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہیئے تھا" انصارؓ سے مشورہ لیا گیا تو انہوں نے بھی وہی کہا جو کہ مہاجرین نے کہا تھا ۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے اس بات پر اصرار کیا کہ حضرت عمرؓ خطرہ مول لیتے ہوئے منزل مقصود تک جائیں خواہ کچھ ہو ۔ اور قضا و قدر سے گریز نہ کریں ۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا:

"تعجب ہے کہ یہ تم کہہ رہے ہو اے ابو عبیدہؓ ۔ میں کیا قضا و قدر سے بھاگ رہا ہوں در اصل میں تو قضا و قدر کے ایک دائرہ کار سے دوسرے دائرہ کار تک جا رہا ہوں"

اس کے بعد آپ نے اس اہم مسئلہ میں مزید مشورہ لیا تو مہاجرین فتح کا بالاتفاق آرا ء یہ مشورہ ہوا کہ آپ مدینہ لوٹ جائیں ۔ اتفاق سے وہیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی آ گئے گو مشورہ کے وقت وہ نہ تھے ۔ چنانچہ اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے

کہا :۔

مجھے اس بارے میں علم ہے میں نے رسول اللہ سے سُنا ہے کہ جب کسی بستی میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑے تو نہ تو اس کے لوگ وہاں سے باہر جائیں اور نہ اس بستی سے باہر کے لوگ اس میں داخل ہوں " یہ سننے کے بعد حضرت عمرؓ اطمینان اور قلبی تشفی کے ساتھ مدینہ پہنچے۔

تیسری بار حضرت عمرؓ شام تب پہنچے جب وبا کا زور ختم ہو چکا تھا۔ اس وبا میں مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ اور آنحضرتؐ کے بعض منتخب صحابی ہلاک ہو گئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ بھی تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ تھے۔ وبا کے ختم ہو جانے کے بعد حضرت معاویہؓ کے سامنے جو جناب حضرت ابو عبیدہؓ کے بعد شام کے امیر تھے، ایک زبردست مشکل آپڑی مشکل یہ تھی کہ طاعون کی قربان گاہ پر جو بے شمار لوگ بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ ان کے چھوڑے ہوئے مال واسباب کو باقی ماندہ مسلمانوں میں کیسے تقسیم کیا جائے۔ آپؓ چاہتے تھے کہ اس مشکل کا حل نکالیں اور ورثوں کو ان کے مستحقین میں بانٹ دیں اس دفعہ شام سے آنے کے بعد حضرت عمرؓ اکثر یہ سوچا کرتے تھے کہ مملکت کے تمام علاقوں کا دورہ کر ڈالیں۔

حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ ہر ہر صوبہ میں کم از کم دو دو ماہ قیام کریں اور عملی طور پر والیوں اور حکمرانوں کو، اپنی مثال سے یہ سمجھائیں کہ صوبوں اور اضلاع میں کس قسم کی حکمت عملی کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

حضرت عمرؓ یہ چاہتے تھے کہ عوام کی مشکلات اور ان کے مخصوص حالات کا خود جائزہ لیں۔ ایک چیز جس سے حضرت عمرؓ بے حد ڈرتے تھے یہ تھی کہ کہیں حکام کے اخلاق نہ بگڑ جائیں۔ اس لئے آپ ہر امکانی کوشش کرتے تھے کہ انہیں ہر قسم کے ظلم و جور اور کوتاہیوں سے باز رکھیں۔ یہی سبب تھا کہ حضرت عمرؓ اپنے عمال پر بڑی کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ اور ان کے کاموں کا جائزہ لینے کے لئے لوگوں کو بھیجتے تھے۔

آپ اکثر فرماتے رہتے تھے :۔

" میں جتنا اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں عام لوگوں کی شکایتیں اپنی جگہ پر رفع ہونے

سے نہ رہ جائیں اور لوگ (حکام) ان کے تدارک کی طرف متوجہ نہ ہوں اور پھر لوگوں میں اتنی سکت ہی نہ رہ جائے کہ اپنی شکایات کو اور آگے بڑھائیں، اتنا کسی اور چیز سے نہیں ڈرتا۔"

چنانچہ آپ نے اپنے جس دورہ کا منصوبہ بنایا تھا اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ ممکنہ مقامی شکایات کا تدارک ہو جائے۔

حضرت عمرؓ ہر سال حج کے موقع پر گورنروں سے ملاقات فرماتے تھے اور ساتھ ہی زائرین حج سے بھی۔ تاکہ ایک طرف حکام سے رعیت کے بارے میں پوچھیں اور دوسری طرف رعیت سے کام کے بارے میں! حضرت عمرؓ ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ بنفس نفیس رعیت کی آسودگی حال کے بارے میں اطمینان پیدا کر لیں۔ زمانہ نے اس دورہ کی فرصت حضرت عمرؓ کو نہ دی گو آپ نے دل سے چاہا تھا کہ یہ دورہ مکمل کریں۔ حوادث روزگار اور مسائل جنگ ایران تو موجود تھے ہی۔ موت نے ناوقت آ کے حضرت عمرؓ سے یہ موقع بالکل ہی چھین لیا۔

باب ۸

بے مثال احتساب

ایران کی جنگ انتہائی مشکل جنگ تھی اور تھا ہی روز بروز طول بھی پکڑ رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس جنگ میں حضرت عمرؓ جو کچھ چاہتے تھے انھیں حاصل ہو چکا تھا۔ در اصل آپ کا مقصد جنگ نہ تھا آپ یہ چاہتے تھے کہ جزیرۂ عرب اور شام اور عراق میں سب جگہ عرب بدیسی اقتدار سے محفوظ ہو جائیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو انھیں اسلام کے دائرہ میں رکھا جائے مگر جب ایک بار جنگ چھڑ جائے تو پھر وہ پھیلتی ہی رہتی ہے اور کبھی کبھی تو ایک جیتنے والے انجام کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ اس بات میں کامیاب ہو گئے تھے کہ شام میں رومی سرحدوں پر جو جنگ ہو رہی تھی اسے بند کر دیں، آپ نے مسلمانوں کو بھی اس بات سے روک دیا تھا کہ بڑی بڑی ٹکڑیوں میں رومی حدود پر فوج کشی کریں۔ اسی اثنا میں حضرت عمرو بن العاصؓ مستقل طور پر حضرت عمرؓ سے اجازت مانگ رہے تھے کہ انھیں مصر فتح کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ جب مصر کی فتح مکمل کر لی گئی اور مسلمان اس قابل ہو گئے کہ مصر کی سرحدوں کو پار کر لیں اور مصر کے پچھم میں طرابلس اور برقہ میں جہاد کریں تو حضرت عمرؓ نے جنگ بندی کا حکم صادر فرمایا — ادھر حضرت معاویہؓ کی زبردست خواہش تھی کہ بحری جنگ لڑیں اور قبرص یا سائپرس فتح کر لیں لیکن حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں سخت اقدامات کی دھمکی دی اور امیر معاویہؓ کو

مزید پیش قدمی سے روک دیا۔

حضرت سعدؓ اب تک وہیں پڑاؤ ڈالے رہے صحرائی علاقہ سے قریب اور عراق کے اور متمدن علاقہ سے بھی نزدیک، جہاں کا حضرت عمرؓ نے انھیں پابند بنا دیا تھا۔ ابھی سعدؓ، حکم عمرؓ کے منتظر یوں ہی ڈیرے ڈالے ہوئے تھے کہ ایرانیوں کے ایک بڑے زبردست گروہ نے ان پر حملہ کر دیا، یا کم از کم ان کے سامنے آ گئے۔ اب اس جم غفیر سے جنگ کے سوا چارہ نہ تھا۔ چنانچہ اب قادسیہ کا معرکہ پیش آیا جس نے بہت طول کھینچا۔ اس معرکہ میں مسلمان شدید آزمائشوں سے گزرے لیکن بے شمار مصائب کے بعد اللہ نے مسلمانوں کو فتح و نصرت سے نواز دیا۔ اس جنگ میں مسلمانوں نے دشمن کے بے شمار آدمی ہلاک کئے لیکن دشمن نے بھی اس موقع پر جنگ بہت سخت کی۔ اس معرکہ میں اس کامیابی نے مسلمانوں کے حوصلے بڑھا دیئے اور انہوں نے یہ چاہا کہ ایرانیوں کا پیچھا کیا جائے اور ان سے ان کے گھر کی دہلیز پر جنگ کی جائے۔ یہ بات جیسے حضرت عمرؓ اور ان کے مدینہ کے مشیروں اور خود سعد بن ابی وقاصؓ کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی کہ مسلمانوں کے لئے ایران کو مکمل طور پر شکست دینا اس وقت تک ممکن نہ ہو سکے گا جب تک کہ وہ ایران میں داخل ہو کے، یعنی ان کے گھر کے اندر ان سے جنگ نہ کریں گے اور ایران کا پائے تخت مدائن نہ ان سے چھین لیں گے مسلمانوں کا خیال یہ تھا کہ جس وقت وہ ایران کے پائے تخت میں داخل ہو جائیں گے اور وہاں سے کسریٰ کو جس کا نام اس زمانہ میں یزدجرد تھا، نکال دیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عرب کم از کم ایرانیوں کی جانب سے مطمئن ہو جائیں گے۔

اور پھر ایرانی، عراق سے بالکل ہی مایوس ہو جائیں گے۔ چنانچہ سعدؓ اپنے لشکر کو لے کے مدائن پہنچے اور اس قدیم پائے تخت میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور شاہنشاہ ایران شہر سے فرار ہو گیا۔ مسلمان اس بات پہ قادر ہو چکے تھے کہ ایوان کسریٰ میں نماز ادا کریں!

مدائن کی فتح کے بعد سے حضرت عمرؓ برابر یہ چاہا کئے کہ جنگ اس حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ ایک بار تو آپ یہ کہتے ہوئے سنے گئے

"میں چاہتا ہوں ہمارے اور ان کے (ایرانیوں کے) درمیان آگ کا ایک پہاڑ

حائل ہوتا؟ ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا :-

" میں چاہتا تھا کہ ہمارے اور ایرانیوں کے بیچ میں آگ کے دریا حائل ہو جائیں تاکہ وہ ہم تک نہ پہنچ سکیں مگر ہوا تو ہوا کہ عمر رضہ کے لیے نہ تو کوئی آگ کا پہاڑ بنا اور نہ آگ کا دریا رُکا ہوا۔ ایرانی جیسے پہلے کر چکے تھے کہ جو کچھ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اسے واپس لے کے رہیں گے۔ اور مسلمانوں سے اپنی شکست کا انتقام بھی لیں گے۔ چنانچہ اگر ایک طرف ان کے شیرازے بکھرتے تھے تو دوسری طرف وہ از سرِ نو اکٹھے ہو جاتے تھے۔ مسلمان مجبور ہو جاتے تھے کہ ان کی شیرازہ بندی قائم نہ رہنے دیں۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ایک طرف وہ ایرانیوں سے محفوظ ہو جائیں گے اور دوسری طرف وہ اپنے تصرفات میں اضافہ بھی کر سکیں گے۔ ہو در اصل یہ رہا تھا کہ جیسے جیسے مسلمان کوئی حصہ فتح کرتے جاتے تھے ان کے اندر مزید حصوں کے فتح کرنے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔

اسی طرح جلولاء کے مقام پر اسلامی لشکر پھر ایرانیوں کے لشکر سے ٹکرایا اور فتح یاب ہوا۔ نہاوند کے مقام پر بھی رن پڑا اور میدان اسلامی لشکر کے ہاتھ رہا۔ حلوان کے مقام پر بھی فتح نے اسلامی جیش کے قدم چومے، ان معرکوں کے بعد جو بڑے عظیم معرکے تھے حضرت عمر رضہ کا خیال تھا کہ جنگ رک جائے۔ عراق میں آپ نے دو شہر بسائے تھے اب آپ کی خواہش یہ ہوئی کہ اسلامی لشکروں کو ان دونوں شہروں میں اتار دیا جائے تاکہ اس سے دشمن سے بچاؤ اور اس طرف کی مدد ہو سکے۔ ان دونوں شہروں کے نام تھے کوفہ اور بصرہ، رہا ایران کے بادشاہ کا معاملہ تو ہر اسلامی فتح کے بعد بادشاہ محاذ جنگ سے اور دور ہوتا جاتا تھا۔

اب مسلمانوں کو اس امر کا احساس ہو چلا تھا کہ جب تک ایرانیوں کے سر پر ان کا بادشاہ موجود ہے جو ان کی شیرازہ بندی کرتا رہے گا اور انھیں جنگ پر اکساتا رہے گا اس وقت تک مسلمان ایران کی عظمت و شوکت کو کم نہ کر سکیں گے اور جیسا کہ چاہیئے ان کی قوت کو نہیں تباہ کر سکیں گے۔ اِدھر کوفہ اور بصرہ کی چھاؤنیوں میں اسلامی قلمرو کو وسعت دینے اور قریب کی ایرانی سرزمین پر غلبہ پانے کی زبردست خواہش موجود تھی۔

اب تک کوفہ نے ایرانی مملکت کے بعض حصوں کو فتح کرنے میں بصرہ کے مقابلہ میں زیادہ کارگزاری کی تھی۔ چنانچہ بصرہ میں اس خواہش کا زور کرنا قدرتی تھا کہ ان کی فتوحات کا بھی دائرہ وسیع ہو۔ اور وہ بھی بکثرت مال غنیمت سے بہرہ اندوز ہو سکیں یوں بھی اہل بصرہ کے سامنے جہاد کی فضیلت تھی، حد یہ ہوئی کہ ایک دن احنف بن قیس نے حضرت عمرؓ سے کہہ دیا کہ اہل کوفہ کے مقابلہ میں ہماری زندگیاں قدرے تنگی میں بسر ہوتی ہیں اور جب تک ہم ایران کو بالکل ہی فتح نہ کرلیں گے ہم ان سے محفوظ نہ رہ پائیں گے، یہ بات اس وقت کہی گئی جب احنف ایک وفد کے ساتھ بصرہ سے آئے تھے، کوفہ اور بصرہ دونوں حضرت عمرؓ سے مستقل اصرار کرتے رہے اور ان پر زور دیتے رہے کہ مسلمان لشکروں کو ایران کے اندر گھس جانے کی اجازت دے دیں اور آخر کار دربار خلافت سے انھیں یہ اِذن (حکم) مل ہی گیا۔ پہلے اہل بصرہ نکلے جنہوں نے شاہ ایران کا پیچھا کرنا شروع کیا اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں اور دوسرے شہر سے تیسرے شہر میں اس کا تعاقب شروع کیا یہاں تک کہ اسے خراساں تک سے نکل جانے پر مجبور کیا۔ بادشاہ نے تنگ آکر دریا پار کیا اور ترکوں کے یہاں پناہ گزیں ہو گیا۔

اب ایران کے بادشاہ نے ترکوں کے بادشاہ سے اپنے وطن سے مسلمانوں کو نکالنے کے سلسلہ میں مدد چاہی۔ ترک بادشاہ نے یہ درخواست قبول کرلی اور مدد کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن مسلمانوں نے اس موقعہ پر بھی اسی عزم و ثبات کا مظاہرہ کیا جیسا کہ انہوں نے اس سے پہلے ایرانیوں کے مقابلہ میں کیا تھا۔ مسلمانوں نے ترکوں کا پیچھا اس وقت تک کرتے رہنا لازم سمجھا جب تک ان کو ان کے دیس واپس جانے پر مجبور نہ کر دیا۔ چنانچہ اس دس سال اور چند ماہ کی تھوڑی سی مدت میں حضرت عمرؓ نے کسروی مملکت کو مکمل طور پر فتح کر لیا۔

یزد جرد روپوش ہو گیا اور بھاگا بھاگا پھرتا رہا۔ آخر کار حضرت عثمانؓ کے دور میں وہ اپنے ہی کسی ہم وطن کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔

مسلمانوں نے محض شام فلسطین اور مصر اور برقہ کی فتوحات پر اکتفا نکی اور نہ مشرق میں کسریٰ کے تصرفات پر اکتفا کی۔ بلکہ حالات نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا تھا کہ شام

کو محفوظ رکھنے کے لئے جزیرہ کو بھی فتح کر لیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان سوائے طبعی اور قدرتی سرحدوں کے کوئی چیز مانع نہ رہ گئی تھی۔ ان قدرتی سرحدوں پر بھی حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں قسطنطنیہ کی فتح کے موقع پر مسلمانوں نے یورش کی لیکن یہ یورش کسی دوسرے مقالہ کا عنوان بنے گی۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ جو فتوحات ہوئیں اور رومیوں اور ایرانیوں کو جو مسلمانوں نے زیر کیا تو اس سے حضرت عمرؓ بے حد مسرور و خورسند تھے۔ یا یہ جو ہر جانب سے مدینہ میں غنیمت اور خمس کی مد کا مال و اسباب ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ پھولے نہ سماتے تھے لیکن ایسا نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ نہ ان فتوحات سے خوش ہوئے اور نہ اتنی مال و منال کی آمد پر مسرور ہوئے جس کی کثرت و بہتات تصور اور تخیل سے بھی پرے تھی!

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی پے بہ پے فتوحات سے حضرت عمرؓ بے حد مسرور ہوتے تھے۔ اور اس بات پر بھی آپ مصر تھے کہ دنیا میں اللہ کا نور پھیل جائے اور اسلام کا نام اور پیغام، رفعت حاصل کرے۔ اسی طرح یہ بات بھی آپ کے لئے مسرت آگیں تھی کہ خمس اور غنیمت کی شکل میں آئی ہوئی دولت و ثروت سے مسلمان ساز و برگ زندگی درست کر لیں اور تنگی اور غربت و افلاس کی زندگی کے بعد وہ فراغت اور عیش سامانی کا منہ دیکھیں لیکن اس جذبہ نشاط کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ دولت اور فتح و نصرت کے اس ہجوم میں اپنے اندر رنج و الم کا بھی احساس لئے ہوئے تھے۔

فتح کے بعد حضرت عمرؓ مجبور ہو گئے تھے کہ مشرق اور مغرب میں جنگ کی نگرانی کریں۔ اور پھر نگرانی بھی یوں کریں کہ:۔

گویا آپ خود ہی لشکر کی بنفس نفیس سپہ سالاری فرما رہے ہیں۔

اسی طرح اس فتح کے بعد آپ کو پورب اور پچھم ہر طرف انتظامی امور دیکھنے پڑتے تھے اور ساتھ ہی مفتوحہ علاقہ کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑتا تھا۔ عمال اور حکام کے انتخابات میں آپ زبردست احتیاط برتتے تھے اور والیوں کے دور حکومت ختم ہو جانے کے بعد تو آپ کی محتسبانہ سخت گیری میں اور اضافہ ہو جایا کرتا تھا۔

دولت جو مدینہ میں آ رہی تھی اور آپ کے پریشانی کا باعث تھی، جب کبھی غنیمت میں آئے ہوئے مال و منال پر آپ کی نظر پڑتی تو آپ کو خیال پیدا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری دولت و ثروت آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے ادوار میں کیوں نہ بھیجی تھی اور آپ ہی کے دور میں مسلمانوں کو یہ سب نعمتیں کیوں آئی تھیں۔

یہ سب سوچ سوچ کر آپ پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن پھر آپ اپنے آپ سے پوچھتے تھے کہ وہ دولت جو پیغمبر اسلامؐ اور آپ کے جانشین حضرت ابوبکر صدیقؓ کو میسر نہ آسکی یقیناً کوئی قابل قدر شے نہیں ہو سکتی۔

ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کا دور دورِ صدیقی اور دورِ نبوت کے مقابلہ میں قابل ترجیح نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد کی اس فراوانیٔ دولت سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ اور ان کے دور کے لوگ دراصل ایک عظیم آزمائش میں مبتلا کیے گئے ہیں۔

اس احتیاط کے باوجود حضرت عمرؓ جنگ، صلح اور ملکی دولت کے بارے میں اپنی ریاستوں سے مطمئن نہ تھے۔ آپ ہمیشہ اس بات سے خائف رہا کرتے تھے کہ کہیں اپنے کسی قول یا فعل میں یا کسی بڑے یا چھوٹے معاملہ میں آپ حد اعتدال سے تجاوز نہ کر گئے ہوں۔ اور یہ تجاوز اور یہ جور ان کے اس اعمال نامہ میں نہ ثبت ہو چکا ہو۔ جس میں ہر چھوٹا بڑا عمل ثبت ہو جایا کرتا ہے۔

اور جسے ہاتھ میں لے کے آپ کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنی ہوگی اور جس کی رُو سے اللہ تعالیٰ آپ سے شدید باز پرس فرمائیگا۔ آپ کے دن اور رات کے سبھی اوقات انہیں تفکرات عالیہ میں تلخ رہا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے مسائل میں آپ اس درجہ منہمک رہا کرتے تھے کہ آپ کبھی کبھی یقیناً ان افکار روز حساب سے نجات پا جایا کرتے تھے مگر رہتا تھا وہ خیال ہر وقت دامنگیر! قرآن کے احکامات کے بارے میں آپ مشورہ لیتے رہتے تھے۔ اپنی خلافت کی پائداری کے لئے صبر اور صلوٰۃ کا سہارا لیتے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود آپ کو یہ کہتے رہنے سے کوئی

”وائے کاش میں خلافت سے جب چھوٹوں تو خلافت کا مجھ پر اور میرا خلافت پہ کوئی بار نہ رہ جائے“

کوئی چیز باز نہ رکھ سکتی تھی!

باب ۸

حضرت عمرؓ کی مشکلات

حضرت عمرؓ کے سامنے دو اور مسئلے آگئے جو اگرچہ ان دوسرے مسائل کے بارے میں جو آپ کو پیش آئے اتنے پرپیچ نہ تھے تاہم حل طلب ضرور تھے اور انھیں عظیم مدبر نے باسانی حل کر دیا۔

پہلا مسئلہ خلیفہ کے لقب سے متعلق تھا۔ میرا خیال کچھ ایسا ہے کہ حضرت عمرؓ اور عام مسلمانوں کے سامنے یہ مسئلہ اس وقت آیا جب ایک طرف عراق کی سمت لشکر روانہ کر دیا گیا اور دوسری طرف، اس فیصلہ کے پیشِ نظر کہ لشکر کی قیادت حضرت خالدؓ سے لے کر حضرت ابوعبیدہؓ کو سونپ دی جائے، شامی لشکر کو افراتفری سے بچانے کی سبیل کی گئی اور اب سب یہ سننے کے لئے بے چین تھے کہ پورب؟ پچھم؟ اسلام کے جاں نثاروں نے کیا کارنامے انجام دیئے ہیں۔

معاً اس موقعہ پر یہ سوال پیدا ہو گیا کہ حضرت عمرؓ کیا لقب اختیار فرمائیں جس سے کہ انھیں پکارا جائے۔ لوگوں کی رائے یہ ہو رہی تھی کہ چونکہ حضرت ابوبکرؓ کو جنہیں آنحضرتؐ کی جانشینی نصیب ہوئی تھی خلیفہ رسول اللہ کے لقب سے پکارا گیا تھا۔ مناسب تھا کہ حضرت عمرؓ، خلیفہ رسول اللہ کے خلیفہ کہلائیں، لیکن مسئلہ میں ایک قباحت پیدا ہو رہی تھی ـــ

حضرت عمرؓ نے سوچا، کیا ان کے بعد آنے والے کو خلیفہ رسول کے خلیفہ کا خلیفہ (خلیفہ خلیفۂ خلیفۂ رسول اللہ) نہ کہنا پڑے گا۔ یوں یہ لقب اتنا لمبا ہوتا جاتا کہ اس کا زبان سے ادا کرنا تک مشکل ہو جاتا۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ لقب کا مسئلہ آخر میں خود مسلمانوں نے حل کر دیا تھا کسی موقع پر دفعتہً ایک شخص بول اٹھا، ہم سب مومنین کا گروہ ہیں اور آپ ہمارے حاکم اور امیر ہیں، خلفاء کا لقب امیرالمؤمنین بن چکا تھا!

اس بحث میں الجھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ لقب کی مشکل حضرت عمرؓ نے حل کی تھی یا اس کے حل کرنے میں مسلمانوں کی عقل عمومی کو دخل تھا۔ البتہ یہ بالکل یقینی امر ہے کہ امیرالمومنین کا لقب سب سے پہلے آپ ہی نے اختیار کیا تھا۔

بعد میں تاریخ کے منظر عام پر کتنے بے شمار امیرالمومنین آئے! مگر کیا یہ لوگ واقعی امیرالمؤمنین تھے، کیا انہیں اس برگزیدہ لقب کے اختیار کا استحقاق حاصل تھا؟ یا یہ مقدس عنوان انہوں نے زبردستی اور ظلم و ستم کر کے اپنے لئے حاصل کیا تھا؟

ظاہر ہے مسلمانوں کی قیادت حد درجہ مشکل شے ہے ہر شخص میں یہ صلاحیت نہیں ہوا کرتی کہ اس لقب کو اختیار کر کے مسلمانوں کی رہنمائی کا حق بھی ادا کرے۔ یہ کام حد درجہ کٹھن کام ہوتا ہے۔ اس میں بڑے پاپڑ بیلنے ہوتے ہیں۔ دُکھ جھیلنے ہوتے ہیں۔ مسلسل محنت و مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ ایسی جفا طلبی کرنی ہوتی ہے جس سے سوا جفا طلبی کا تصور نا ممکن ہوتا ہے، ظلم کا قلع قمع کرنا پڑتا ہے۔ زبردستوں کے مقابلہ میں زیردستوں کی دستگیری کرنی پڑتی ہے۔

تمام انسانوں میں برابری اور عدل قائم کرنا ہوتا ہے۔ نزدیک اور دُور ہر جگہ کے مسائل دیکھنے ہوتے ہیں۔ امن اور نا امنی یا خلفشار کے دَور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کے مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ پھر ملک و ملت کو اتنا قوی اور زور مند بنانا پڑتا ہے کہ کسی کی، ملک کی سالمیت اور آزادی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھنے کی ہمت تک نہ پڑے۔ اور سب سے بڑھ کر۔۔ ہر چیز سے بڑھ کر۔۔ یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مملکت کا رویہ خود امیرالمؤمنین سے منصفانہ ہو اور اس کا مطالبہ انصاف بھی اعلیٰ کی ذات سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ سخت گیری کا ہو۔ یہ ہیں مومنوں کے سردار بننے کے لوازمات۔ اس کے تضمنات، اس کے مشکلات! اور حضرت

عمرؓ حقیقت میں امیرالمومنین کہے جانے کے حقدار تھے یعنی اس بات کے مستحق تھے کہ مومنوں کے امیر ہوں۔ آپ کے بعد جو خلفاء آئے یا وہ آئے جنھیں خلفاء کا اقتدار نصیب ہو، وہ اس امارت اور قیادت کے لیے کس قدر ناموزوں ثابت ہوئے تھے۔

دوسری مشکل جس سے حضرت عمرؓ بآسانی عہدہ برآ ہو گئے تعین تاریخ کی مشکل تھی۔ اس وقت تک حضرت عمرؓ کے حکام وعمال اور قائدین لشکر جب کبھی آپ کو خطوط وغیرہ لکھتے تھے تو ان پر صرف مہینوں کا ذکر ہوتا تھا (مثلاً اگر ایک خط رمضان میں لکھا گیا ہے تو سرنامہ، مورّخہ رمضان لکھا ہوگا) سنتوں اور سالوں کا نہیں۔ ہوتا بھی کیسے۔ اب تک مسلمانوں نے اپنے لیے کسی قسم کی تقویم نہیں قبول کی تھی۔ یہ بات حضرت عمرؓ کو بہت کھل رہی تھی۔ اس باب میں بھی آپ نے اپنے مشیروں سے مشورہ کیا۔ آخر میں یہ طے پایا کہ اس سال کو اسلام کی تاریخ کا آغاز سمجھا جائے جس میں آنحضرتؐ نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تھی۔ یہ ایک نہایت کامیاب انتخاب تھا۔ اس انتخاب کی موزونیت اس میں تھی کہ اسی سال مسلمان ایک منظم جماعت کی حیثیت سے پہلی بار ابھرے تھے۔ اور اب آنحضرتؐ نے اس جماعت کے امور کی باضابطہ نگہبانی شروع کر دی تھی اور احکام الٰہی کی روشنی میں اس پر حکومت فرمانے لگے تھے۔ گو اس میں آپ اپنی اور مسلمانوں کی ذاتی آراء کو قبول کرتے تھے۔ یہ قلیل سی جماعت بے کسی، بے بسی اور محدود اختیارات کے ساتھ، سامنے آئی تھی۔ لیکن اللہ نے اس کی قلّت کو کثرت میں بدل دیا اور اس کو کشادگی بخش دی، قوت واقتدار سونپ دیے۔ جلد ہی یہ جماعت عرب کے جزیرہ نما پر چھا گئی۔

نہ صرف یہ بلکہ عرب کے حدود کے باہر بھی اس کا تسلط پھیل گیا۔ اب جو حضرت عمرؓ آنکھ اٹھا کے دیکھتے ہیں تو وہ محض مدینہ ہی کے امیرالمومنین نہ تھے۔ عرب کے بھی امیرالمومنین بن چکے تھے اور آپ کی حکومت مصر اور شام اور عراق اور ایران تک پھیل چکی تھی۔ جب آپ قتل ہوتے ہیں تو ایران کی عظیم شہنشاہیت کا صرف ایک تھوڑا سا حصہ آپ کے سامنے سرنگوں ہونے سے

رہ گیا تھا اسے بھی آپ کے لائق اور راشد جانشین عثمانؓ نے اسلامی اقتدار کے ماتحت کر دیا حضرت عمرؓ نے اس وسیع اور عریض اور لامحدود حکومت کو حد درجہ عدل گستری اور حسن تدبر سے چلایا۔ آپ کے پورے دور میں آپ سے کوئی ایک فعل بھی ایسا سرزد نہ ہوا جس پر آپ کی گرفت کی جا سکتی تھی۔ اسی طرح آپ کی مطلق اطاعت بھی کی گئی۔ یوں آپ حقیقی معنوں میں امیر المومنین تھے۔ اور آپ امیر المومنین کسی وقت بھی موضوع بحث نہ بنائی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر خلافت فاروقی کی بقیہ مشکلات بھی اتنی ہی سہل الحل ہوتیں جتنی پہلے دنوں مشکلات تھیں تو شاید حضرت عمرؓ کی اس لیاقت اور قابلیت اور اہلیت کا جس کی نظیر، نہ صرف اسلامی تاریخ میں بلکہ عالمی تاریخ میں بھی نہیں ملتی، اظہار نہ ہوتا۔ اس لیے کہ اس قسم کی عدیم النظیر لیاقتیں اور اہلیتیں اسی صورت میں ظہور کرتی ہیں جب ایک شخصیت کو زبردست مشکلات اور حوادث سے ٹکرانا پڑتا ہے۔

جیسے حضرت عمرؓ کو اس بات کا احساس سا ہو گیا تھا کہ خلافت اور اس کے عظیم مسائل ان کے لیے آزمائش ہیں۔ آپ کو یقین تھا کہ اس گراں بار عہدہ کے ذریعہ اللہ آپ کو آزما رہا ہے اور اسی طرح آپ کے دور کی فتوحات اور کامرانیوں سے آپ کی رعیت بھی آزمائی جا رہی تھی۔ اگر دفن ابوبکرؓ کے فوراً بعد کی آپ کی تقریر پر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل ظاہر ہو جاتی ہے کہ آپ کو اس آزمائش کا بڑا ہی قوی احساس تھا۔ آپ کی اس تاریخی تقریر کی ابتدا یوں ہوئی تھی!

"اللہ نے چاہا ہے کہ تم پر حکمران بنا کے میری آزمائش کرے اور مجھے تم پر حاکم کر کے تمہاری بھی آزمائش کرے" تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عمرؓ کا پورا دورِ خلافت آزمائش تھا آپ کے لیے بھی، آپ کی رعایا کے لیے بھی!

اس آزمائش کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ ابھی آپ اپنے مختصر تاریخی اور افتتاحی خطبۂ خلافت اور اعلانِ سلطنت سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ کو ایک طرف عراق میں ایرانیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے مسلمانوں کو آمادہ جہاد کرنا پڑا، دوسری طرف بعض دوسرے امور کی طرف فوری توجہ کرنی پڑی۔ یہ امور یہ تھے:-

شام میں اسلامی فتوحات کی تکمیل، عراق کی سرحدوں پر مثنیٰ کے لشکر بے یار و مددگار کی مصیبت کا حل، ایسا کہ وہ اپنے کام کو پورا کر سکے۔ اس لشکر کی تیاری میں مدد دینا جو اسلام کے ہاتھ سے نکلے ہوئے عراق کی تادیب اور گوشمالی کر سکے۔

اس سے پہلے، پورب اور پچھم میں مسلمانوں کی شدید آزمائشوں کا اور ایران اور روم پر ان کے تسلط کا ذکر آ ہی چکا ہے مگر یہ آزمائشیں بھی زیادہ سے زیادہ ان زبردست اور حیرت انگیز حوادث کی جھلکیاں ہیں جن سے دورِ خلافت عمرؓ بھرا ہوا ہے۔ یہ حوادث اس وقت تک پرخروش رہے جب تک کہ حضرت عمرؓ اپنے رفقاء گرامی آنحضرتؐ و ابوبکرؓ سے نہ جا ملے۔

باب ۹

نئی مشکلات اور ان کا حل

یہ حوادث پیہم ایسے تھے کہ اگر حضرت عمرؓ کا تمام کا تمام وقت ان حوادث سے نبرد آزما ہونے ہی میں لگ جاتا تو تعجب کی بات نہ تھی لیکن لطف کی بات یہ تھی کہ ان حوادث کے جلو میں نئی مشکلات بھی آرہی تھیں، اور یہ مشکلیں کم خطرناک نہ تھیں۔ میری مراد ان مشکلات سے، مشرق و مغرب میں فوج کشی کی مشکل سے یا فوجوں کی تنظیم اور ان کی دیکھ بھال کی مشکل سے یا مستقل طور پر یہ دیکھتے رہنے کی مشکل سے کہ کہیں مجاہدین، جنگ کو ایک بار نہ سمجھ بیٹھیں یا کسی دوسری طرف نہ متوجہ ہو جائیں، میری مراد ان مشکلات سے نہیں ہے۔ میں جن مشکلات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ان کا ظہور مسلمانوں کی ان فتوحات سے ہوا تھا جو جنگ کے میدانوں میں انھیں حاصل ہوئی تھیں۔ فتح یاب اسلامی لشکروں کو غنیمت کا جو مال و منال میسر آتا تھا اسے احاطہ تحریر میں لانا تقریباً غیر ممکن ہے۔

نہ اس مال کی کثرت کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور نہ قیمت کا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس مال و منال کی تقسیم میں کمال احتیاط اور انتہائی دقت نظر سے اللہ کا حکم نافذ ہوتا تھا۔ چنانچہ عین اس نظام شرعی کی رو سے جو آنحضرتؐ کے زمانہ میں رائج ہو چکا تھا غنیمت کا چار خمس یعنی ⅘ حصہ تو مجاہدوں میں بانٹ دیا جاتا تھا اور قائدین لشکر ان لوگوں کو جو خاص طور پر داد شجاعت دیتے تھے الگ سے بھی انعامات اور عطیات دیتے تھے

اور غنیمت کا پانچواں حصہ خود حضرت عمرؓ کے پاس روانہ کر دیا جاتا تھا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن اب اس کے بعد سے ایک مشکل پیدا ہو جاتی تھی۔ مال غنیمت ہمیشہ قابل انتقال نہ ہوتا تھا کہ اس کا پانچواں حصہ امیر المومنین کے پاس بھیج دیا جائے۔ اکثر مجاہدین اسلام کو غنیمت کی شکل میں قطعات زمین ملتے رہتے تھے اور یہ حضرات ان لوگوں پر جو اپنے پرانے مذہب پر قائم رہنے کو ترجیح دیتے تھے، جزیہ لگا دیتے تھے، حضرت عمرؓ نے خاص طور پر اس بات پر اصرار کیا تھا کہ زمین کو تقسیم نہ کیا جائے۔ بلکہ اسے انہیں لوگوں کے تصرف میں رہنے دیا جائے جو پہلے سے اس پر قابض تھے۔ تاکہ یہ لوگ اسے کاشت کرتے رہیں اور اس کا ٹیکس اور محصول ادا کرتے رہیں۔

اس طرح حضرت عمرؓ کی خدمت میں مندرجہ ذیل اقسام کی رقوم آتی تھیں :-

(۱) اسلامی لشکر کی فتح و نصرت کی صورت میں غنائم (غنیمت کی جمع) کا پانچواں حصہ۔

(۲) اس زمین کا لگان یا محصول جو مفتوحہ زمینوں پر بدستور کاشت کرنے والے غیر مسلم، معاہدہ کی رو سے ادا کرتے تھے۔

(۳) جزیہ جو ان لوگوں پر عائد ہوتا تھا جو نئے دین میں داخل ہونے سے انکار کرتے تھے۔

یہ مال و منال جو آتا تھا توقع سے کہیں زیادہ ہوتا تھا اور دراصل مسلمان سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اتنی دولت مدینہ میں آ رہی ہو گی حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جب غنائم کے یہ پانچویں حصے آتے تھے یعنی ارتداد کے فتنے کو فرد کرنے کی جنگوں کے سلسلہ میں، تو اس وقت ان کا طریق کار بے حد سہل ہوتا تھا۔ آپ مال غنیمت میں اللہ تعالیٰ کے نام سے پانچواں حصہ محفوظ کر لیتے تھے اور بقیہ تمام حصہ کو تمام مسلمانوں میں، بغیر ان کے مرتبوں یا منزلتوں کا یا ان کی خدمات کا لحاظ کئے ہوئے تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اس تقسیم کے عمل میں آپ آزادوں اور غلاموں میں کوئی امتیاز نہ برتتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے سورہ انفال کی آیت : اہم تھی۔ آیت کا ترجمہ حسب ذیل

ہے :-

"اور جان رکھو کہ جو مال تم کو شکست خوردہ کفار سے دستیاب ہو اس میں سے پانچواں حصہ خدا کا اور اس کے رسول کا اور اہل قرابت کا اور یتیموں کا اور محتاجوں اور مسافروں کا ہے۔ اگر تم خدا پر اور اس نصرت پہ ایمان رکھتے ہو، جو حق و باطل میں فرق کرنے کے دن (یعنی جنگ بدر میں) جس دن دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی اپنے بندے محمدؐ پر نازل فرمائی اور خدا ہر چیز پر قادر ہے"

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شام اور عراق اور ایران سے خمس کی مد میں جو مال و منال آتا تھا وہ قیاس اور گمان سے بھی زائد تھا۔ چنانچہ ایک طرف خمس کی مصیبت تھی اس نقطہ نگاہ سے کہ وہ کثرت وقیمت کے لحاظ سے قیاس و گمان سے بھی سوا تھا اور اس کی تقسیم ایک اہم مسئلہ تھی اور دوسری جانب جزیہ اور خراج کا مسئلہ تھا۔ یہ دولت مجموعی طور پر اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ اس کی تقسیم ایک مشکل بات تھی۔ اس میں دراصل خطرہ بھی تھا۔ اس میں ایک امکان یہ بھی تھا کہ لوگ ان رقوم کی توقع میں اور اپنے اپنے ان حصوں کی امید میں جو انہیں خمس اور جزیہ اور خراج سے مل سکتا تھا کام کرنا ہی چھوڑ دیں اور بالکل کاہل ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس مشکل کا کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔ اس ارادے نے خصوصیت کے ساتھ اس وقت تقویت حاصل کی جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور ان کا لشکر ایران کے پائے تخت مدائن میں داخل ہوئے اور وہاں سے حاصل شدہ غنیمت کا پانچواں حصہ مدینہ روانہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے مشیروں سے اس دولت کے بارے میں مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ کی رائے یہ تھی کہ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کی روش کو قائم رکھتے ہوئے اس تمام دولت کو تقسیم کر دیں اور ہر سال جو بھی مال جمع ہو سکے اس میں بغیر کچھ باقی رکھتے ہوئے سب کا سب لوگوں میں بانٹ دیں۔

حضرت عثمانؓ کی رائے حضرت علیؓ کی رائے سے مختلف تھی۔ آپ نے فرمایا :-

" دولت بہت زیادہ مقدار میں آتی ہے اور میری رائے یہ ہے کہ اس دولت میں تمام لوگوں کا حصہ ہو اب اگر ایک قسم کی مردم شماری ہو جائے تو یہ بآسانی معلوم ہو سکے گا کہ کسے ملا، کسے نہ ملا، ورنہ تو معاملہ بگڑ جائے گا۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عثمانؓ کی خواہش یہ تھی کہ مالِ غنیمت کی تقسیم منظم انداز میں ہو۔ اس طرح کہ سب اس مال سے بہرہ اندوز ہوں۔ کوئی بھی محروم نہ رہنے پائے۔

بہر حال حضرت عثمانؓ کی رائے صرف اس حد تک اور آگے بڑھی تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ دولت کی تقسیم یوں عمل میں آئے کہ کسی کو کم یا کسی کو زیادہ نہ ملنے پائے لیکن یہ بات حضرت عثمان ذوالنورین (ذوالنورین یعنی دو روشنیوں والے اس مناسبت سے کہ آپؓ کے عقد میں یکے بعد دیگرے رسالت مآب کی دو صاحبزادیاں، یعنی حضرت فاطمہؓ کی بڑی بہنیں حضرت رقیہؓ اور حضرت اُمّ کلثومؓ، آئی تھیں) نے بھی نہیں فرمائی تھی کہ حضرت عمرؓ بیت المال میں تھوڑی یا زیادہ رقم باقی رہنے دیں۔

اس میں شک نہیں عثمانؓ خردمند نے دقتِ نظر اور جدتِ فکر کا ثبوت بہم پہنچایا تھا۔ مردم شماری اور تمام شہریوں کے اعداد و شمار کا جمع کرنا ایک ایسے نظام کو لانا تھا جسے اس سے پہلے عربوں نے بالکل نہ دیکھا تھا۔ اس نظام سے امیرالمومنین کے لئے اس بات کا امکان پیدا ہو چلا تھا کہ مال کی تقسیم میں کسی کو اس کے حق سے محروم نہ رکھا جائے اور ہر حقدار کو اس کا حق دلایا جائے۔

قریش میں ایک شخص تھے حضرت عمرؓ کے اعزّا میں۔ ولید بن ہشام ابن المغیرہ۔ ان صاحب نے ایک مشورہ دیا جو عین صواب تھا۔ اور شاید یہ پہلا موقعہ تھا جب مسلمان عربوں نے غیر عرب لوگوں کی تقلید کی تھی۔ ولید نے حضرت عمرؓ سے یہ کہا تھا کہ شام میں انھوں نے سلاطین کو دفاتر قائم کرتے ہوئے اور ساتھ ہی لشکر کو آراستہ اور منظم کرتے ہوئے دیکھا ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک دفتر مرتب کیا یعنی بڑے پیمانے پر ایک سیکرٹیریٹ قائم کیا اور اسی طرح ایک فوج بھی منظم اور آراستہ کی۔ ولید ابن ہشام کی رائے پر عمل کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے قریش کے تین ممتاز

آدمیوں کو جو لوگوں کے حسب نسب سے خوب واقف تھے اس بات پر مقرر کیا وہ آنحضرتؐ کی قرابت کے پیش نظر بنی ھاشم سے ابتداء کرتے ہوئے تمام لوگوں کے نام قبیلہ وار لکھ دیں۔ یہ حضرات تھے :-

"عقیل بن ابی طالب مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم"

ولید کی رائے کا اصل مقصد یہ تھا کہ مال و دولت کی تقسیم بغیر کسی وجہ اور سبب کے نہ ہونی چاہیئے بلکہ جب کبھی حکومت اسلامی کی جانب سے کوئی رقم صرف کی جائے تو اس کا کوئی خاص مقصد بھی ہو۔ اور یہ مقصد لشکر کی تنظیم اور اس کو اسلحہ سے آراستہ کرنا تھا لشکر کے منظم اور مسلح اور مرتب ہو جانے کے بعد امیرالمومنینؓ صرف اس بات کے مکلف رہ جاتے تھے کہ اہل لشکر کو اس رقم سے تنخواہیں وغیرہ دیتے رہیں اور بعد میں بھی جب مال غنیمت آئے اور انھیں ان کا حصہ ملے۔ یعنی ان کے نام کے حصص چھوڑ دیئے جائیں۔

ظاہر ہے حالت امن میں فوج کے افراد تن تنہا نہیں رہتے تھے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بھائی بند اور ماں باپ ہوتے تھے۔ جس وقت مجاہد لوگ اللہ کی راہ میں لڑنے کے لئے اپنے ان متعلقین کو چھوڑ کے چلے جاتے تھے اس وقت ان لوگوں کی گزر اوقات کے لئے کچھ ہونا ضروری ہو جاتا تھا۔ اب لشکر کو، لشکر کے خاندانوں کو اور دوسرے ضرورت مندوں کو دینے دلانے کے بعد بھی امیرالمومنینؓ کے پاس کچھ نہ کچھ بچ ہی رہتا تھا۔ یہ باقی ماندہ رقم خلیفہ کے پاس محفوظ رہنی چاہیئے تھی۔ تاکہ اس رقم سے ایک طرف نئے حوادث کا مقابلہ کیا جائے اور دوسری طرف اہل حاجت کی حاجت برآری کی جائے۔

ولید کی اس تجویز سے جس میں بڑی جدت تھی مقصود محض یہ نہ تھا کہ مالی اور داراتی نقطہ نگاہ سے تنظیم عمل میں آجائے۔ دراصل اس تجویز کی رو سے فوج کا حق مال غنیمت کے علاوہ رقم متذکرہ صدر میں بھی تسلیم کیا جائے۔ اور فوج جس وقت میدان کارزار میں ہو اس وقت اس کے متعلقین اور دوسرے ضرورتمند مسلمانوں کے مصارف کا بار سنبھالا جائے

اور اس کے بعد بھی بیت المال میں کچھ نہ کچھ باقی رہتے دیا جائے" تاکہ حوادث کا مقابلہ کیا جاسکے۔
حضرت عمرؓ نے عہد کی یہ تنظیم کہ وظائف اور عطیات اس وقت دیئے جائیں جب تمام لوگوں کے ناموں اور قبیلوں کا ایک رجسٹر تیار ہو جائے اپنے اندر جدت رکھتی ہے۔ اس تنظیم کی رو سے تمام لوگوں کو ایک ہی سطح پر نہیں رکھا گیا بلکہ ان کی طبقہ بندی کی گئی تھی۔ اس کی رو سے مختلف چیزوں کو ذہن میں رکھا گیا تھا۔ مثلاً تدوین دیوان اور تنظیم دفتر میں سب سے پہلے بنی ہاشم سے ابتدا کی گئی تھی۔ اس کے بعد اس قبیلہ کا نام رکھا گیا تھا (شاید بنی زہرہ کا۔ اس لئے کہ بنی زہرہ میں آنحضرتؐ کی ننہیال تھی۔ مترجم) جو بنی ہاشم کے بعد آنحضرتؐ سے قریب تھا اس کے بعد، اسی قرابت کے پیش نظر اور اسی معیار کے مطابق دوسرے قبیلوں کے لوگوں کے دفتر تیار کیے گئے۔ اس سے پہلے کہیں بیان ہو چکا ہے کہ جس وقت کاتبین دفتر اور دیوان مرتب کرنے والوں نے بنی ہاشم کے بعد علی الترتیب بنی تیم اور بنی عدی کے نام حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے قبیلوں کے نام لکھے تو اسے حضرت عمرؓ نے منظور نہ کیا اور فرمایا:-

"عمرؓ کو وہ مقام ملنا چاہیئے جو انہیں اللہ نے عطا کیا ہے۔"

میرے نزدیک ایک بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے محض اپنے ہی قبیلہ کو موخر نہ کیا تھا یعنی اسے تیسرے نمبر سے ہٹا کر اس نمبر پر نہ رکھ دیا تھا جہاں از روئے قرابت نبوی اسے ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے علاوہ قرابت نبویؐ کے احترام کا ایک اور ثبوت دیا گیا کہ عطیات کی تعداد کے تعین میں بھی اسی "رسول اللہ سے زیادہ قریب زیادہ مستحق ہے" کے معیار کو پیش نظر رکھا گیا۔ چنانچہ اعزائے قریبی رسولؐ کو بقیہ بنی ہاشم پر ترجیح دی گئی۔ اس کے بعد لوگوں کے نام اس لحاظ سے ترتیب دیئے گئے کہ کون پہلے اسلام لایا اور کون بعد میں، اسی طرح اسلام کے لئے صبر و استقامت کا مظاہرہ قرآن کی آیات کا حفظ، جس کی اس زمانہ میں غیر معمولی اہمیت تھی، یہ تمام چیزیں بھی وجوہ ترجیح تھیں۔ چنانچہ طے پایا کہ مندرجہ دمشرحہ ذیل ارباب کے لئے ذیل کی رقوم عطا ہوں:-

(۱) جو لوگ فتح مکہ سے پہلے ہجرت کر گئے تھے ان کے لئے تین ہزار درہم فی کس، اس میں آزاد اور غلام کی تخصیص نہ تھی۔ گویا معیار محض ہجرت قبل از فتح، تھا۔

(۲) ان مجاہدوں کے لئے جو معرکہ بدر میں شریک ہوئے تھے، پانچ ہزار درہم سالانہ فی کس۔

(۳) حبشہ (موجودہ ایتھوپیا) ہجرت کر کے جانے والوں اور اُحُد کے معرکہ میں شرکت کرنے والوں کے لئے چار ہزار درہم سالانہ۔

(۴) مہاجرین اولین اور غازیان بدر کے بیٹوں کے لئے جو ان معرکوں میں حاضر تھے تین ہزار درہم فی کس۔

حضراتِ حسنؓ و حسینؓ کو اس سلسلہ میں مستثنیٰ قرار دیا گیا اور ان کو ان کے عالی مرتبہ والد کے مانند پانچ پانچ ہزار درہم کا مستحق گردانا گیا تھا۔ اسی طرح اسامہ بن زیدؓ کو بھی مہاجرین کے بیٹوں کے گروہ میں امتیازی حیثیت دی گئی اور انھیں تین ہزار کے بجائے چار ہزار درہم کا وظیفہ عطا ہوا۔

لطیفہ یہ ہے کہ اسامہ بن زیدؓ کو جب چار ہزار درہم کا مستحق مانا گیا تو حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے احتجاجاً کہا:

"آپ نے میرے لئے تین ہزار مقرر فرمائے لیکن اسامہ بن زیدؓ کے لئے چار ہزار کا عطیہ مقرر کیا؟" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:-

میں نے انھیں اس لئے ترجیح دی کہ آنحضرتؐ کی نگاہوں میں وہ تم سے زیادہ محبوب تھے اور ان کے والد حضرت زیدؓ بھی تمہارے والد کے مقابلہ میں نگاہِ رسولؐ میں زیادہ مقبول تھے۔ عمر بن ابی سلمہ کے چار ہزار درہم مقرر ہوئے تو اس پر محمد بن عبداللہ بن جحش نے بھی احتجاج کیا:-

آخر آپ نے ابوسلمہ کے بیٹے کو کیوں ترجیح دی ہم لوگوں پر؟ آخر ہم لوگوں کے والدوں نے ہجرت بھی کی اور معرکوں میں بھی شریک ہوئے! حضرت عمرؓ نے جواب دیا میں نے انھیں یعنی عمر ابن ابی سلمہ کو اس قربت کی بنا پر ترجیح دی ہے جو انہیں سرورِ دوجہاں

سے حاصل ہے۔ اب جو صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں کسی چیز سے محروم کیا گیا ہے اور وہ اس امر کے منتظر ہیں کہ ان کی دلجوئی کی جائے یعنی ان کا وظیفہ زائد کر دیا جائے تو وہ حضرت امّ المومنین اُمّ سلمہؓ (آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات میں سے ایک تھیں) کی سی معزز اور محترم ماں لاکے دکھائیں۔ اگر کوئی ایسا کر سکتا ہے تو میں بھی اس کی رضایت خاطر کی کوشش کروں گا۔

حضرت عمرؓ نے حضرت عباس بن عبدالمطلب کی بھی اوروں پر فضیلت تسلیم کی اور ان کے لیے پانچ ہزار درہم مقرر کئے۔ آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات کو تمام دوسرے لوگوں پر، مہاجرین اولین، غازیان بدر و اُحد سب پر استثناءً ترجیح دی۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک کے لئے بارہ بارہ ہزار درہم مقرر کئے۔ (یہ سب اس نقطۂ نگاہ سے تھا کہ ہر معاملہ میں مرکزی شخصیت رسالت مآبؐ کو تسلیم کیا گیا تھا۔ مترجم) اس کے بعد لوگوں کی مزید طبقہ بندی ہوئی۔ اور بے شمار لوگوں کے لئے پندرہ پندرہ سو درہم منظور ہوئے۔ اس کے بعد دو دو ہزار درہم، یہ سب کچھ ہو چکا تو مزید حلقہ بندی ہوئی۔ یہاں تک کہ آخری اور سب سے معمولی عطیہ تین سو درہم کے حساب سے منظور ہوا۔ تین سو درہم سے کم کسی کو نہیں دیا گیا۔ ہر اس بچہ کے لئے جس کا دودھ چھٹ چکا تھا، ایک سو درہم کی رقم منظور ہوئی۔ جس وقت بچہ کچھ اور بڑھ جاتا تھا یہ رقم ایک سو سے بڑھ کر دو سو ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد جب بچہ سنِ بلوغ کو پہنچ جاتا تھا تو وہ جس طبقہ کا ہوتا تھا اس کے مطابق اس کا سرکاری وظیفہ مقرر ہو جاتا تھا۔ ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا کہ حضرت عمرؓ نے وظائف اطفال کا یہ نظام بدل دیا۔ ہوا یہ کہ آپ نے ایک عورت کے بارے میں یہ مشاہدہ کیا کہ اس نے محض اس خیال سے کہ سرکاری وظیفہ بندھ جائے گا اپنے کسی بچہ کے دودھ کے چھڑانے میں عجلت برتی۔ حضرت عمرؓ اس واقعہ سے سخت متاثر ہوئے۔ ہل گئے۔ سہم گئے۔ جس رات آپ نے یہ منظر دیکھا تھا یعنی عورت کو دودھ چھڑاتے تاکہ وظیفہ مقرر ہو جائے اور بچے کو دودھ کے لئے بلکتے ہوئے تو اس رات آپ تمام رات بیدار رہے ساری رات کرب و اضطراب میں کاٹ کے آپ نے فجر کی نماز ادا کی۔ نماز ادا کرنے کے بعد آپ نے خود ہی اپنے کو للکارا:

"عمرؓ کا برا ہو ارے اس نے تو مسلمانوں کے بچوں کو مار دیا ؟"

اس کے بعد ہی آپ نے سرکاری طور پر اعلان کروا دیا کہ عورتیں بچوں کا دودھ چھڑانے میں عجلت نہ کریں انھیں اطمینان سے معینہ مدت تک دودھ پلائیں اور اب ہر مسلمان بچہ کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے گا۔ یہی احکامات صوبوں کے گورنروں کو بھی بھیج دیئے گئے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس دن سے ایک بچہ پیدا ہوتا تھا اس کا ولی اور نگران (والد، والدہ یا اور کوئی بزرگ) اسی دن سے اس کے نام کا وظیفہ سرکار سے آ کے لے لیتا تھا۔ لاوارث بچوں کے لئے بھی ننو درہم مقرر ہوئے۔ جیسے لاوارث لڑکے یا لڑکی کا ولی حکومت سے لے لیتا تھا اور پھر اس کے لئے جمع رکھتا تھا۔ بچے کی دودھ پلائی اور غذا کے لئے ولی کو بیت المال سے علیحدہ رقم ملتی تھی۔ جب یہ لاوارث بچہ بڑا ہو جاتا تھا۔ تو اس کے وظیفہ میں اضافہ کر دیا جاتا تھا اور اسے عام مسلمانوں کے لڑکوں کے مانند سمجھا جاتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے بیوہ خواتین کے لئے بھی وظائف مقرر کر دیئے تھے۔ چنانچہ حضرت صفیہ بن عبدالمطلبؓ کے لئے جو رسالت پناہ علیہ السلام کی پھوپھی تھیں ایک ہزار درہم مقرر ہوئے۔ اسی طرح اسماء بنت عمیس، زوجہ حضرت ابوبکرؓ اور والدہ عبداللہ بن مسعودؓ کے لئے بھی ہزار ہزار درہم منظور کئے گئے۔ حضرت عمرؓ ان عطیات اور وظائف کو خود مدینہ میں لوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔ کبھی کبھی مدینہ کے نزدیک اور دور کے قبیلوں میں حضرت عمرؓ مختلف لوگوں کی رقوم اور مال لے کے دوڑتے ہوئے جایا کرتے تھے۔ تمام لوگوں کو اور مستورات کو، ان کے عطیات ان کے ہاتھوں میں عنایت فرما دیتے تھے۔ اپنے عمال کو حضرت عمرؓ یہ حکم دیتے تھے کہ مقرر کردہ اصولوں سے مطلق انحراف نہ ہو۔ جب تک غلام آزاد نہ ہوتے تھے اس وقت تو خیر لیکن جوں ہی انہیں آزاد کر دیا جاتا، انھیں بھی اتنا ہی ملتا جتنا ان کے آقاؤں کو۔

یہ تھا نظام وظائف جسے حضرت عمرؓ نے قائم کیا تھا۔ یہاں جو کچھ بیان ہوا ہے۔ اس کی بنیاد روایات ہیں۔ میرے نزدیک ان میں بعض یقیناً محتاج تحقیق ہیں۔ لیکن بدقسمتی کہیئے کہ قابل اعتماد ماخذ کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

باب ۱۰

وظائف

عطیات کا یہ نظام جسے حضرت عمرؓ نے قائم کیا تھا، ہر اعتبار سے نیا تھا۔ قدیم ملل میں کوئی قوم بھی، جو عربوں سے پہلے تمدن آشنا ہوئی تھی، نہ صرف اس نظام سے واقف نہ تھی اس سے ملتی جلتی کوئی چیز بھی اس کے تصور میں نہ آئی تھی ہم جانتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں بعض قوموں میں اس کا رواج تھا کہ سپاہیوں اور فوجیوں کو بھرتی کیا جاتا تھا، اور انہیں اس مال و دولت میں ساجھی بنا دیا جاتا تھا جو فوج کے ہاتھ لگتے تھے۔ اسی طرح بعض قوموں میں سپاہیوں اور فوجی سرداروں کو زمینیں دے دی جاتی تھیں جس کے غلہ سے وہ اپنی گزران کرتے تھے لیکن ایک چیز جس کی مثال قدیم اور جدید دونوں تمدنوں اور تہذیبوں میں مفقود ہے کسی حکومت کا تمام رعایا کے لیے غذائی ذمہ داری کا قبول کرنا ہے۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تمام مسلمانوں کے کھلانے کی ذمہ داری خود حکومت نے لے لی تھی۔

موجودہ تمدن صرف بعض ملکوں میں اور وہ بھی ابھی حال میں، اس قابل ہوا ہے کہ وہ سوشل سیکوریٹی کا سلسلہ شروع کرے اور آج کی حکومت لوگوں کو یہ ضمانت دے سکے کہ انھیں وہ اس شرط پر (کسی خاص زمانہ میں) کھلائے گی کہ بعد میں یہ رقوم اسے واپس دے دی جائیں گی (تقاوی قرضوں کی بھی یہی صورت ہوتی ہے) لوگوں کو بیماری کا علاج کرانے، بیکاری کے دور میں بوڑھوں، کمزوروں اور اپاہجوں کی مدد کرنے، پنشن کے حقوق عطا کرنے، اور ملازموں کو ملازمت کی ضمانت دینے کے سلسلے میں یقیناً حکومتوں نے کارنامے

انجام دیتے ہیں اور دیتی ہیں، لیکن عمرؓ کے زمانے سے آج تک یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی حکومت تمام افراد مملکت کے لئے حکومت کے خزانہ سے معین مقدار میں وظائف بھی مقرر کردے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ کی یہ روش حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں صرف ایک خاص مدت تک قائم رہی۔ بعد میں جب لوگوں نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ حضرت عثمانؓ بعض لوگوں کو خطیر وظائف دیں، تو انھیں، انہیں لوگوں کے پے بہ پے مطالبہ پہ ان وظائف کو صرف اہل لشکر اور بزرگ اصحاب نبیؐ کے لئے مخصوص کردینا پڑا۔ اجلِ صحابہ کو مستثنیٰ کرنے کی وجہ ظاہر تھی یہ وہ لوگ تھے جو معرکوں میں خود شریک ہوئے تھے فتح ونصرت میں خود حصہ لیا تھا اور گروہ مرتدین سے جنگ کی تھی۔ حضرت عثمانؓ اعتراض کرنے والوں کے مطالبات ماننے پہ مجبور ہوگئے تھے۔ اور آپ کو اعلان کرنا پڑا تھا کہ بجز سپاہیوں اور مخصوص اصحاب نبیؐ کے عام لوگوں کے وظائف بند کئے جاتے ہیں۔ دراصل جن لوگوں نے حضرت عثمانؓ پر اعتراض کیا تھا وہ یہ کہتے تھے کہ یہ مال ان لوگوں کا حق ہے جو اس کے لئے شریک جہاد ہوئے ہیں اس مسئلہ پر ہم نے کہیں اور روشنی ڈالی ہے۔

باب ۱۱

رفاہی حکومت کا قیام

جدید تمدن میں بعض قومیں بچوں کی پیدائش کے ہی دن سے ان کے لئے راتب مقرر کر دیتی ہیں یہ عموماً اس زمانہ میں ہوتا ہے جب کسی ملک میں کسی خاص جنگی مصیبت وغیرہ کی بنا پر بچوں کی تعداد کم ہونی شروع ہو جاتی ہے۔

بچوں کی اس نگہداشت اور ان کے لئے راتب یا وظیفہ مقرر کرنے کا یہ سبب نہیں ہوتا کہ حکومت اسے اپنا فرض گردانتی ہے۔ بلکہ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ بچوں کی تعداد بڑھانے میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جاسکے کیونکہ یہی بچے ایک ملک کی پبلک زندگی اور کسی بڑے خطرے کے موقع پر اس کے دفاع کے کام کو انجام دیتے ہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس کام کو حکومت کا فرض اور بچوں کا حق جان کر کیا۔ شروع میں حضرت عمرؓ نے یہ چاہا تھا کہ قوم کے بچوں کے لئے وظائف کا اجراء اس وقت عمل میں آئے جب ان کا دودھ چھڑایا جائے۔ لیکن جب لوگوں نے دودھ چھڑانے میں عجلت کرنی شروع کر دی یعنی قبل از وقت بچوں کو ماں کے دودھ سے محروم کرنے لگے تو حضرت عمرؓ جیسے دہل سے گئے اور پیدائش کی ابتداء ہی سے وظائف کے اعطاء کا اعلان کر دیا۔ ہم یہ بات اس سے پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔

لاوارث بچوں کی نگہداشت بھی حضرت عمرؓ کی جدت طرازی ہے۔ میرے خیال میں جدید طرز کی حکومتیں بھی ان لاوارثوں پر وہ توجہ نہیں مبذول کرتیں جو حضرت

عمرؓ نے مبذول فرمائی تھی۔ آپ کے حیرت انگیز کارناموں میں یہ بھی ایک کارنامہ ہے کہ ان گزر گاہِ حیات پہ بے کس عالم میں پڑے ہوئے اطفال کی، دینی اور عمومی تربیت کے لئے آپ نے باضابطہ ادارے قائم کر دیئے تھے۔ آج کی تمدن آشنا حکومتیں ان بے خطاؤں کے لئے حکومت کے خزانے میں کوئی حق نہیں تسلیم کرتیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ تک کیا تھا کہ لاوارث بچوں کو کچھ مدت تک تو وظائف ملتے تھے اور اس کے بعد جب وہ سنِ بلوغت کو پہنچتے تو انہیں کچھ جمع شدہ رقم مل جاتی تھی جس کی بنیاد پہ وہ کوئی کاروبار شروع کر دیتے تھے۔

حضرت عمرؓ ہی اس اجتماعی نظام کے بھی موجد ہیں جس کی رو سے حکومت کے خزانے کو عام لوگوں کی معاش کی ضمانت دینی پڑتی تھی۔ حضرت عمرؓ کا یہ ایک مستقل خیال تھا جس پر وہ سختی سے قائم تھے کہ حکومت جو وظائف دیتی ہے یہ عوام پر کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ کم و بیش افراد قوم کا خزانہ قوم پر حق ہے۔

آپ سے یہ قول بھی منسوب ہے کہ ہر مسلمان کا خزانۂ سلطنت پر حق ہے جو اسے ملنا چاہیئے۔ آپ فرمایا کرتے تھے:

"اگر میں زندہ رہ گیا تو ایک چرواہے کو بھی اس سے پہلے کہ اس کا چہرہ اپنے مقررہ عطیئے کے نہ ملنے سے سرخ ہو جائے، اس کا حق بیت المال سے مل جایا کرے گا۔"

آپ یہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ آپ کی حکومت یہ عزم کر چکی تھی کہ لوگوں کو ان کے حقوق بغیر کسی سرگردانی اور دوڑ دھوپ کے خواہ وہ مرکز سے قریب ہوں یا دور مل جایا کریں گے۔

بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ سے یہ بدگمانی کی ہے کہ وہ عطیات کے بارے میں شخصیتوں کو بھی دیکھتے تھے بعضوں کو بہت دیتے تھے بعض کو کم۔ گویا وہ طبقاتی نظام کے قائل تھے۔ لیکن ایسا سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کبھی طبقاتی نظام کو ترجیح نہیں دی۔ اشخاص کو اشخاص پر فوقیت نہیں دی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یہ اسلام کے نظامِ فکر کی صریح اور علانیہ مخالفت کی جرأت ہو سکتی تھی۔ قرآنی تصور کے بموجب تمام انسانوں میں مساواتِ مطلق پائی جاتی ہے۔ الّا یہ کہ ایک شخص از روئے خوف الٰہی، دیانت و طہارت

دانش وخرد، عزم اور احتیاط یعنی تقویٰ، دوسروں سے بڑھ جائے۔ وہ شخص جو غریبوں کے مقابلہ میں امیروں کی پرواہ بالکل نہ کرتا تھا۔ کمزوروں کی خاطر بااثر لوگوں سے ٹکرا جاتا تھا اور جسے اپنے عمال اور امراء سے ادنیٰ سا بھی خطرہ نہ تھا یعنی انکی ذرا سی بھی پرواہ نہ کرتا تھا اس کو طبقاتی نظام مسلط کرنے کے الزام سے کسی صورت، متہم نہیں کیا جاسکتا۔

دراصل بات یہ ہے کہ بیت المال میں خراج اور محاصل، جزیہ اور مال غنیمت کی جو مقدار آتی تھی وہ اتنی نہ ہوتی تھی کہ تمام مسلمانوں کو اس میں سے دیا جاسکے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ مجبور تھے کہ بعض لوگوں کو بعض پر ترجیح دیں۔ اس سلسلہ میں معیار یہ تھا کہ کس نے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ کس نے اسلام کی خاطر مصیبتیں زیادہ جھیلیں اور کون نبی اکرمؐ سے رشتہ کی رُو سے زیادہ قریب ہے۔ حضرت عمرؓ اس بات کے سختی سے قائل تھے کہ عربوں کو جو بھی فضیلت مل گئی تھی وہ تمام تر آنحضرتؐ کی ذات کا طفیل تھی۔ اس لئے جو آپ سے جتنا قریب تھا وہ اتنا ہی فضیلت مآب تھا۔

حضرت عمرؓ ان لوگوں کو سب سے مقدم جانتے تھے جنھوں نے آنحضرتؐ کے لئے اپنی جانیں تک خطرے میں ڈال تھیں۔ رنج ومصیبت اور تنگی کے دَور میں آپ کے ساتھ رہے تھے۔ آپ کے دشمنوں اور اسلام کے دشمنوں سے جنھوں نے رسولِ گرامی کے خلاف سازش کی تھی اور صرف اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا، جنگ کی تھی، اس کے باوجود حضرت عمرؓ فرماتے تھے اگر خزانے میں مزید رقوم آ گئیں تو میں عطیات میں اضافہ کردوں گا۔ اور اگر یہ دولت کچھ اور زیادہ ہو گئی تو میں آخری فرد امت تک ان عطیات کو پہنچا دوں گا۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ ہر مسلمان کو کم از کم چار ہزار درہم ملیں۔ ایک ہزار گھوڑے اور خچر کے لئے، ایک ہزار ہتھیار کے لئے، ایک ہزار اہل وعیال کے لئے، اور ایک ہزار اپنی ذات کے لئے لیکن موت نے انھیں فرصت ہی نہ دی۔ آپ کے حوصلوں کا اور امت سے عمیق محبت کا عالم یہ تھا کہ آپ نے ارشاد فرمایا :۔

"اگر دولت میں اضافہ ہو گیا تو مسلمانوں کو مالا مال کردوں گا ان۔ سلئے اجناس

تول دوں گا اور انہیں علی الحساب دوں گا۔"

حضرت عمرؓ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ مجاہدین اسلام اور اسلام کی خاطر سینہ سپر ہونے والوں اور ان لوگوں میں جنہوں نے اسلام کی کشمکش کے دور میں عافیت کی زندگی پر دارو گیر کی زندگی کو ترجیح دی تھی، فرق نہ کریں، یونہی آپ ابتدا میں اسلام لانے والوں اور مجبوراً مسلمان ہونے والوں اور اسلام پر مستقل طور سے قائم رہنے والوں اور مرتدوں میں جو اگر بعد میں اسلام کی طرف پلٹے بھی تو شمشیر و سناں کے اثر سے، فرق اور امتیاز برتنے پر مجبور رہتے۔

پس حضرت عمرؓ سے مساوی تقسیم دولت کا یہ مطالبہ صحیح نہ تھا۔ اگر حکومت کے پاس اتنی دولت ہم بھی جاتی کہ تمام مسلمانوں میں دولت مساوی طور پر تقسیم ہو جائے تو بھی حضرت عمرؓ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا ارادہ عام لوگوں کو ایک سطح پر لا کے عطیات سلطنتی میں برابر کا شریک کرنا اس شرط کے ساتھ تھا کہ شروع کے مسلمان جنھوں نے اسلام کے لئے بڑی آزمائشیں اٹھائی تھیں اپنے مرتبے سے گرنے نہ پائیں۔ حضرت عمرؓ کے نزدیک ان بزرگوں کی حیثیت کو بہر صورت قائم رکھنا ضروری تھا یہ تربیت یافتگان مکتب نبویؐ اور بوریا نشینان مسند بے نیازی متقی بھی تھے معلم بھی تھے۔ عام لوگوں کے دینی رہنما اور قائد بھی تھے۔ ان کی زندگیوں میں انہیں بہر صورت رہنما بنانا ضروری تھا۔ ہاں ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد تمام لوگوں کو ایک سطح پر لایا جاسکتا تھا اور کسی کو کسی پر فضیلت کا حق نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اگر حضرت عمرؓ کے بعد آنے والے خلفاء نے ان کی روش پر چلنا پسند کیا ہوتا اور ان کے مرتب کردہ نظام کو چلایا ہوتا تو امت بے حد نفع میں رہتی۔ لیکن ابھی حضرت عمرؓ کے انتقال پر تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ لوگوں میں دولت جمع کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا اور اس سلسلہ میں وہ ایک دوسرے کے رقیب بن گئے۔

پھر یہ ہوا کہ فضیلت کا ایک نیا معیار بنا جو یہ تھا خلیفۂ وقت کے نزدیک کون زیادہ مقرب ہے کون کم مقرب ہے۔ خلفاء نے بھی بیت المال سے حسب منشا لینا دینا

اپنا حق سمجھنا شروع کیا۔ بیت المال سے خلفاء اپنے لئے اور اپنے مقربوں کے لئے رقوم لینے لگے۔ خود حضرت عثمانؓ نے ایک مرتبہ شاہی خزانے سے مروان ابن حکم کو ایک بہت بڑی رقم دے دی۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے مروان سے یہ رقم چھین کے مدینہ کے غریب لوگوں میں بانٹ دی۔ معاویہؓ نے جب عنانِ حکومت سنبھالی تو خود کو خلیفۃ اللہ فی الارض سمجھ بیٹھے انھوں نے مال اللہ کو اپنی ذاتی دولت سمجھ لیا جس پر حسب منشاء تصرف کیا جا سکتا تھا۔

معاویہؓ کی حضرت علیؓ سے مال ہی کی خاطر جنگ ہوئی تھی۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ معاویہؓ نے اکثر صحابہؓ کو گراں قدر رقوم دے دے کر اپنی طرف توڑنے کی کوشش کی۔ جب موصوف کا (حضرت معاویہؓ کا) جنھوں نے آنحضرتؐ سے ملاقات کی تھی اور آپ کی صحبت اٹھائی تھی یہ حال ہوا تھا تو ان خلفاء کا تو پوچھنا ہی کیا جو آنحضرتؐ کی صحبت کے شرف سے محروم رہے۔ ان خلفاء نے امت میں طبقاتی نظام رائج کر دیا اور وہ یوں کہ یہ لوگ، لوگوں سے امتیازی برتاؤ کے قائل ہو گئے تھے۔

حضرت عمرؓ نے کبھی اس قسم کی کوئی بات نہ سوچی اور نہ آپ کے ذہن میں یہ تصور آیا تھا اور آپ کی فطرت یہ بات قبول نہیں کر سکتی تھی۔

آنحضرتؐ کی مکمل پیروی کرنے میں تمام امت میں آپ سے زیادہ کوئی آرزومند نہ اسی طرح آپ سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ آپ کا ایک قول جسے حضرت حسن بصری بھی دہرایا کرتے تھے یہ تھا:۔

"میری خواہش ہے کہ جب میں دنیا سے نکلوں تو میرا اور دنیا کا حساب صاف رہے اور میں اس دنیا سے صرف صالح عنصر قبول کروں اس کی نجاستیں اور کثافتیں اسی کے لئے چھوڑ دوں۔"

باب ۱۲

اُمّت کے لئے دِل سوزی

حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کے لئے عطیات دینے اور انہیں سکون زندگی بخشنے ہی کو کافی نہ سمجھا تھا۔ اسلام کی پوری تاریخ میں حضرت عمرؓ سے بڑھ کر اُمّت کی دلداری اور دلسوزی کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوا۔ آپ انہیں حتی الوسع آرام اور راحت بھی پہنچانا چاہتے تھے۔ آپ گھوڑوں اور اونٹوں تک کو خود تیار کیا کرتے تھے تاکہ بعد میں جب جہاد کا موقع آئے تو یہ چست اور تیز قسم کی سواریاں ثابت ہوں۔ آپ شام اور عراق میں اسلامی لشکروں سے جا ملنے والوں کو تیار ہونے میں مدد دیتے تھے جو لوگ ان علاقوں میں روزی کمانے کی غرض سے جانا چاہتے تھے ان کی بھی آپ مدد کرتے تھے۔ مکّہ کے حاجیوں کو بھی آپ سامان سفر سے لیس کرتے تھے۔ جب آپؓ کسی کو سواری دیتے تھے تو زادِ راہ بھی عنایت کرتے تھے۔

سورۃ توبہ اور سورۃ الانفال میں مال غنیمت اور صدقات کے بارے میں جو آیات ہیں ان کو عملی شکل دیتے ہوئے آپ یہ سب مصارف جن کا ابھی ذکر ہوا صدقات

ہی کی رقوم سے کرتے تھے۔

اسی پر بس نہ فرماتے ہوئے حضرت عمرؓ مدینہ اور اس کے نواح میں عام لوگوں کے روزمرہ کے مسائل سے بھی واقف ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت برآری فرماتے تھے اور اس میں رات دن لگے رہتے تھے اور حکومت کے افسروں کو بھی اس کی تاکید فرماتے تھے۔

حضرت عمرؓ کو ہمیشہ اس بات کا خوف لگا رہتا تھا کہ مبادا ان کے احکامات کی بجا آوری میں عمّالِ حکومت، تساہل برتیں اور اس بات سے تو آپ بہت ہی ڈرتے تھے کہ کہیں دور دراز کے علاقوں میں رعیت کی ضرورتیں پوری ہونے سے رہ جائیں اور حاجت مند آپ تک نہ پہنچ سکیں اور اس طرح اللہ آپ سے باز پرس کرے آپ کہتے رہتے تھے:۔

"کہ اگر فرات کے کنارے تک بھی ایک اونٹ بلا سبب ضائع ہو جائے گا تو اللہ مجھ ہی کو اس کا ذمہ دار قرار دے گا" جب صدقے کے اونٹ آتے تھے اور ان میں کسی کے جسم پر زخم ہوتا تھا تو آپ خاص زخم پر ہاتھ رکھ کر کہا کرتے تھے:

"میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں اس اونٹ کی اس تکلیف کے بارے میں بھی مجھ سے سوال نہ کیا جائے۔"

صدقے کے اونٹوں کی آپ بنفسِ نفیس دیکھ بھال کرتے تھے۔ کسی نے آپ کو ایک دفعہ اسی عالم میں چلچلاتی دھوپ میں ایک اونٹ پر مالش کرتے ہوئے دیکھا۔ عالم یہ تھا کہ آپ کے ساتھ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بھی کھڑے تھے۔ آپ حضرت علیؓ سے کچھ کہتے جاتے تھے اور حضرت علیؓ سے سن کر حضرت عثمانؓ لکھتے جاتے تھے اور اس موقع پر حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا تھا کہ یہ شخص (مراد حضرت عمرؓ) ان ہی صفات سے ممتاز ہے جو حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی نے حضرت موسیٰ میں دیکھیں تھیں۔ حضرت موسیٰ کے بارے میں بنت شعیبؑ نے یہ بیان دیا تھا:۔

(یَا اَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ)

یعنی

" بابا اس شخص کو ضرور رکھ لیجئے۔ اب تک اس سے بہتر شخص آپ کی مزدوری میں نہیں آیا ہے۔ یہ بازور اور قوی بھی ہے اور دیانت دار اور قابل اعتبار بھی ہے۔"

راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مدینہ میں راتوں کو گشت لگایا۔ رات آنے کے بعد آپ ایک دفعہ تن تنہا مدینہ کا گشت لگاتے تھے اور ایک دفعہ اپنے ساتھ اپنے کسی آدمی کو ساتھ لے لیتے تھے۔ ان شب گردیوں میں بسا اوقات بڑے بڑے لطائف پیش آجاتے تھے۔ جن سے انسان محظوظ بھی ہوتا ہے اور مرعوب بھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک رات کو آپ نے ایک عورت کو کہتے ہوئے سنا۔

کیا شراب پینے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے یا کوئی سلسلہ ایسا نکل سکتا ہے کہ میں نصر ابن حجاج تک پہنچ جاؤں!

صبح ہونے پر حضرت عمرؓ نے جب نصر ابن حجاج کے بارے میں پوچھا تو آپ کو بتایا گیا کہ وہ " قبیلہ سلیم کا ایک شخص ہے "۔

آپ نے اسے حاضر کئے جانے کا حکم دیا۔ اب جب آپ اسے دیکھتے ہیں تو وہ ایک خوبصورت اور جوان رعنا کی حیثیت سے سامنے تھا۔ اس کے بالوں میں بھی حسن تھا حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس کے بال ترشوا دیئے جائیں۔ بال کٹوا کے جب یہ شخص آیا تو اس کا حسن و جمال اور نکھر آیا۔ گویا وہی معاملہ پیش آیا جس کی طرف عبجدی کا یہ مصرع اشارہ کرتا ہے کہ

ے آراستن سرو ز پیراستن است

اب اس شخص کو عمامہ باندھنے کا حکم ہوتا ہے لیکن (اس دور کے فیشن اور مذاق اور لباس کی رو سے) اس سے بھی اس کے بانکپن اور تیکھے پن میں ہی ہوتا گیا، کمی نہ واقع ہوئی۔ یہ دیکھنے کے بعد حضرت عمرؓ نے قسم کھائی کہ اس جامہ زیب شخص کو مدینہ میں

سبلسنے نہ دیں گے۔ چنانچہ آپ فی الفور اس جوان رعنا کی جانب متوجہ ہوئے اور اسے سپاہی کی حیثیت سے بھرتی کر کے بصرہ بھجوا دیا!

ایک رات اور اسی قسم کا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ حضرت عمرؓ گشت لگاتے لگاتے ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔ یہاں چند خواتین آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ موضوع یہ تھا کہ :-

"مدینہ میں سب سے زیادہ حسین اور صبیح (جس میں صباحت ہو) کون شخص ہے۔"

اس پر ایک نے کہا اپنا وہ شغال (گیدڑ) ہے نا! دوسرے دن صبح خلافت کی جانب سے پرسش ہوئی۔ یہ کون بزرگ ہیں جن کا لقب شغال (گیدڑ) ہے۔ شغال صاحب بھی قبیلہ سُلیم کے نکلے حسن و جمال اور مردانہ بانکپن لیے ہوئے' ان کے ساتھ بھی باری باری سر منڈوانے اور پگڑی پہنوانے کا عمل ہوا، مگر حسن تھا ان کا کہ نکھرتا ہی گیا گویا (بگڑنے میں بھی زلف ان کی بنا کی!)

چنانچہ ایسے خطرناک معشوق فریب کو بھی فوجی وردی پہنا دی گئی یعنی شیشہ گری اور عشوہ طرازی کی زندگی سے نکال کے انہیں خارشگافی اور جفاطلبی کی زندگی کی طرف لایا گیا۔

روایت ہے کہ اس غریب نے جب یہ سنا کہ اب اسے سپاہی بننا پڑے گا اور مدینہ کی گلیاں اس سے چھوٹ جائیں گی تو اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اسے بھی وہیں بھیجا جائے جہاں اس کا چچیرا بھائی نصر بن حجاج جا چکا ہے یعنی بصرہ!

ایک رات کو ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ اس رات حضرت عمرؓ نے شہر کا اتنا حصہ دیکھا تھا کہ تقریباً شہر کے باہر نکل گئے تھے۔ وہاں آپ کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ایک شخص ایک مکان کے سامنے تن تنہا بیٹھا ہوا ہے۔ البتہ اس نے اپنے سامنے ایک چراغ روشن کر رکھا ہے ؎ اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک!

حضرت عمر اعظمؓ اجازت لے کر اس شخص کے پاس پہنچتے ہیں پہلے اسے سلام کرتے ہیں پھر سوال فرماتے ہیں

"اتنی رات گئے تم تن تنہا یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ حضرت عمرؓ کے کانوں میں گھر کے اندر سے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ شخص جو اکیلا بیٹھا تھا اس نے بتایا کہ اس کی بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے اور کوئی اس کے پاس نہیں ہے اور وہ اس وقت اس کے لئے کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔

یہ سب سن کر حضرت عمرؓ فوراً پلٹ گئے اور اپنے مکان پر پہنچ کر اپنی بیوی اُمِ کلثوم سے کہا۔

"تمہارے لئے ثواب کمانے کا ایک وسیلہ ہاتھ آیا ہے، بولو، اس سے فائدہ اٹھاؤ گی؟ اور اُمِ کلثوم نے جب تشریح چاہی تو "مہ و پروینِ" کے امیر نے کہا کہ دراصل میں ایک دکھ کی ماری عورت کی حالت دیکھ کے آ رہا ہوں، اس وقت وہ تن تنہا دردِ زہ کی مصیبت میں مبتلا ہے، امیرالمومنین کی بیوی فوراً چل پڑیں۔ اب میاں بیوی رات کی تاریکیوں میں بیابان میں پہنچ چکے تھے۔ جہاں ایک چھوٹے سے مکان میں ایک لاچار اور بیکس عورت دردِ زہ میں مبتلا تھی اُمِ کلثوم اندر گئیں، عورت کی مدد کی، اور نسوانی نگہداشت برتی۔

دکھیا عورت کے یہاں ایک بچہ پیدا ہو چکا تھا۔ یہ خوش خبری دیتے ہوئے اُمِ کلثوم نے اپنے شوہر سے کہا کہ بچے کے والد سے کہہ دیں کہ اسے اللہ نے ایک لڑکا عنایت فرمایا ہے۔ لیکن اُمِ کلثوم نے اپنے شوہر کو امیرالمومنین کہہ کے مخاطب کیا تھا! اب تو باپ صاحب (جو ابھی ابھی باپ بنے تھے) گھبرائے سٹپٹائے۔

"آپ نے پہلے کیوں نہ فرمایا کہ آپ امیرالمومنین ہیں؟" مردِ صحرا نے کہا۔ دوسرے ہی دن صبح سے حضرت عمرؓ کی مستعد اور فرض شناس حکومت نے "مردِ صحرا" کے حالات یکسر بہتر بنا دیئے تھے!

ایک اور رات کا قصہ ہے حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو، جس کا تعلق مدینہ سے تھا اور جسے آپ پہچانتے تھے پینے پلانے کا شغل کرتے دیکھا!

دوسرے دن صبح آپ نے اس شخص کو بلا بھیجا اور فرمایا۔

"تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شراب پینے کی ممانعت فرمائی ہے" اس شخص نے سر تو اثبات میں ہلا دیا لیکن تھا منہ پھٹ کہنے لگا۔

آپ کو کیسے معلوم ہوا' اور جب حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ پچھلی رات آپ نے خود اسے شراب پیتے دیکھا تھا تو اس آدمی نے کہا:

"مگر یہ بتائیے کہ اسی اللہ نے جس نے شراب سے روکا ہے' لوگوں کے عیوب ٹٹولنے سے نہیں روکا ہے؟

اب حضرت عمرؓ خاموش تھے اور اللہ سے طالب عفو ہو رہے تھے۔

حضرت عمرؓ کا' مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک مشفقانہ' محض مدینہ تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اس کی لپیٹ میں نزدیک اور دور' سب جگہ کے لوگ آتے تھے۔ باہر کے علاقوں سے جہاں کہیں کوئی شخص مدینہ پہنچتا تھا۔ حضرت عمرؓ اس سے عام لوگوں کے مسائل اور مصائب کے بارے میں ضرور دریافت فرماتے تھے۔ یہی نہیں کہ آپ کو صرف یہ فکر ستاتی تھی کہ مسلمانوں کی زندگی جوں توں گزر جائے' آپ مسلمانوں کے مستقبل' ان کی آخروی فلاح تک کی فکر میں غلطاں رہتے تھے۔

خالد بن عرفطہ نام کے ایک شخص ایک بار عراق سے آئے ان کو دیکھتے ہی امیرالمومنین نے پوچھا کہ وہاں لوگوں کا کیا حال ہے۔

"سب آپ کو درازیٔ عمر کی دعا دیتے ہیں امیرالمومنین! اور یہ تمنا کرتے ہیں کہ خود ان کی عمروں میں سے کچھ حصہ آپ کی عمر میں شامل ہو جائے" خالد بولے

قادسیہ کی جنگ میں جس مجاہد نے برائے نام بھی شرکت کر لی تھی اسے دو دو ہزار یا ڈیڑھ' ڈیڑھ ہزار عطا ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہر بچہ اور ہر بچی کے لئے سو درہم ماہوار اور دو جریب الگ بندھے ہوئے ہیں۔ بالغ مردوں کو بھی پانچ چھ سو مل جاتے ہیں' اب جب ایک شخص کو اتنا اتنا مل جاتا ہے اور اس کے مصارف بھی کچھ ایسے سنگین نہیں ہوتے مثلاً بعض گھرانوں میں تو کھانے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں فضول خرچی اور اسراف کے بھی امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

خالد کی یہ سب باتیں سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

"کوئی مضائقہ نہیں یہ سب لوگوں کا حق ہی تو ہے جو انہیں ملتا ہے۔ دراصل مدینے

والا پروردگار ہے۔ اور مجھے لینے سے زیادہ عطا کرنے اور بخشنے میں لذت ملتی ہے اور ضروری نہیں کہ اس پر مجھے مستحق شمار ٹھہرایا جائے۔ ممکن ہے اگر یہ سب دولت میرے والد خطاب کی ہوتی تو میں ایسا بے دریغ نہ صرف کرتا۔ پھر جب فلاح مملکت کے لئے صرف کرنے کے لئے رقوم موجود ہیں تو انہیں روکے رکھنے سے کیا حاصل۔

ان لوگوں کو چاہیئے کہ جب انہیں ان کے سرکاری عطیئے ملیں تو مثلاً کچھ بھیڑیں خرید لیں، ان کی پرورش کریں، پھر مزید عطیات ملنے پر جانوروں کی مزید راسیں خرید لیں۔ یوں ان لوگوں کے پاس کچھ سرمایہ اکٹھا ہوتا جائے گا۔ بہت ممکن ہے میرے بعد جو حکمران آئیں وہ اس نظام کو قائم نہ رکھیں۔ اب ایسی صورت میں یہی سرمایہ ان غریبوں کے کام آئے گا اور اس کی بنیاد پر لوگ زندگی کاٹ سکتے ہیں۔

اور اے خالد یہ جو کچھ میں تم سے، کہ تم میرے روبرو بیٹھے ہو، کہہ رہا ہوں اس کا مخاطب میں اس شخص کو بھی سمجھ رہا ہوں جو اسلام کی قلمرو کے آخری سرے پر بیٹھا ہوا ہے اور یہ اس لئے کہ میں اسے مطلقاً اپنی ذمہ داری گردانتا ہوں۔ اور میرے سردار کا فرمان ہے "جو حکمران اپنی رعایا کی خبرگیری سے غافل رہتا ہے اسے فردوس کی بو تک نہیں نصیب ہو پاتی۔"

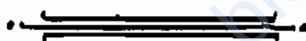
نزدیک اور دور رہنے والوں کے ساتھ حضرت عمرؓ کی یہ عدل گستری اور ان کے فلاح و صلاح اور بہبود مطلق کے لئے یہ تڑپ اور یہ دلسوزی یہ سب اس پیمان وفا کے مظاہر تھے جو ابوبکرؓ کی تدفین کے بعد آپ نے اپنی پہلی اور افتتاحی تقریر میں کیا تھا۔ اس تاریخی تقریر میں آپ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے جو مسائل کہ بالکل سامنے موجود ہوں گے اور جن کا حل مرکز ہی میں ممکن ہوگا انہیں اور ان میں سے ایک ایک کو آپ خود ہی حل کریں گے، البتہ وہ مسائل جنہیں آپ بنفس نفیس نہیں حل کر سکتے، ان کے لئے آپ متدین، امانت دار اور قابل افسران مقرر کر دیں گے اور ان حکام میں سے جو لوگ احکامات کی بجا آوری اور مملکت کی فلاح میں تساہل برتیں گے، ان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔

خلافت کے پورے دور میں حضرت عمرؓ اس وعدے سے نہیں پھرے!

ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک عامل کو لوگوں کے سرکاری عطیات انہیں دے دینے کے لئے لکھ بھیجا۔ عامل نے تعمیل حکم کے بعد لکھا۔

عطیات دینے دلانے کے بعد بھی بچ رہے ہیں۔ اس پر پیکر عدل و مروت نے عامل کو یہ پھر لکھا۔

یہ جو کچھ بچ رہا ہے اسے بھی عوام میں بانٹ دو۔ یہ دراصل غنیمت ہے جو اللہ کی جانب سے ان لوگوں کے لئے آگیا ہے کوئی عمرؓ یا آل عمرؓ کا مال تو نہیں۔



باب ۱۳

والیوں اور حکام سے مخصوص طرزِ عمل

یہ نرمی، اور یہ انصاف پسندی، کہ حق، حق دار کو دلایا جائے، خواہ کچھ بھی ہو، یہی وہ صفتیں تھیں جنھوں نے حضرت عمرؓ کو اپنے والیوں پر اتنا سخت بنا دیا تھا۔ آپ ہر والی کے تقرر سے پہلے اس کے مملوکہ سامان کی فہرست بنوالتے تھے، اپنا دور ختم کرنے کے بعد اگر کسی والی کے پاس فہرست سے کچھ زیادہ نکلتا تھا تو حضرت عمرؓ اسے لے لیتے تھے۔ اور بیت المال میں ڈال دیتے تھے۔

خالدؓ بن ولید کے معاملہ میں حضرت عمرؓ کی سختی معروف چیز ہے۔ والیوں کے ایک پورے گروہ کے اموال، ان کے، ان کے عہدوں سے نکالے جانے کے بعد چھین لئے گئے تھے۔ اسی صورت سے دورانِ عہدہ بھی آپ والیوں سے کڑی باز پرس کرتے تھے۔ آپ عوام کی شکایات کی ہمیشہ تحقیقات کرواتے تھے۔

کبھی کبھی آپ ان شکایات کی تحقیقات کے لئے صحابہ کرامؓ میں سے بعض افراد کو روانہ فرماتے تھے۔

مثلاً عمرو بن العاصؓ کے خلاف، مصر سے جو شکایتیں آئی تھیں ان کی تحقیقات کے لئے آپ نے محمد بن مسلمہ کو بھیجا تھا۔

انہیں بزرگ کو آپ نے کوفہ بھی روانہ کیا تھا۔ کیوں کہ وہاں کے حاکم سعد ابن ابی وقاصؓ کی شکایت آئی تھی کہ موصوف نے دارالامارۃ کے سامنے ایک باب کھڑا کر دیا تھا۔

حضرت عمرؓ کی ہدایات تھیں کہ حکومت کے اعلیٰ حکام اپنے یہاں دربانوں کا سلسلہ نہ شروع کر دیں جس وقت حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ سعدؓ نے بازار کے شور و شغب سے بچنے کے لیے قصر امارت کے سامنے ایک استقبالیہ عمارت (آج کل کے ریسپشن روم کے مانند) بنوالی ہے اور ان سے ملنے کے لیے آنے والوں کو پہلے وہاں پوچھ گچھ سے گزرنا ہوتا ہے۔ تو آپ نے اپنے نمائندہ خاص (محمد بن مسلمہ) کو حکم دیا کہ :-

"کوفہ پہنچتے ہی اس سے پہلے کہ سعدؓ سے گفتگو تک ہو، اس عمارت کو جلا دیا جائے۔" مسلمہؓ نے ایسا ہی کیا۔

بعض راوی لکھتے ہیں کہ سعدؓ نے ابن مسلمہؓ کو کچھ رقم بھی پیش کرنا چاہی تھی جسے انہوں نے قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ مدینہ واپس لوٹ کے ابن مسلمہؓ نے حضرت عمرؓ کو ہر بات بتلائی۔

ادھر کچھ لوگوں نے سعدؓ کی مبالغہ آمیز طور پر شکایت بھی کی۔ اس پر محمد بن مسلمہ کو پھر بھیجا گیا۔ اس بار مسلمہ کو ہدایت کی گئی کہ عوام اور خواص سب سے کوفہ کے والی کے طرزِ عمل کے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے۔ چنانچہ ابن مسلمہ نے یہی کیا۔ مگر اس تفتیش کے باوجود انہوں نے ہر شخص کو سعدؓ کا مداح پایا۔ کچھ لوگوں نے البتہ یہ کہا کہ سعدؓ نماز میں بڑی عجلت کرتے ہیں۔ بعد میں حضرت عمرؓ کے پوچھنے پر سعدؓ نے یہ جواب دیا تھا کہ شروع کی رکعتوں میں تو وہ ضرور طوالت برتتے ہیں لیکن بعد کی رکعتوں میں وہ ایسا نہیں کرتے۔

اس پر حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو الزام سے بری کر دیا تھا۔ تاہم ان کی دولت بحق حکومت ضبط کر لی تھی۔ بعد میں جب زخم لگنے کے بعد حضرت عمرؓ نے وصیت فرمائی کہ نئے قائد کے انتخاب کے لیے چھ آدمیوں کی کونسل مقرر ہو تو اس میں حضرت سعدؓ کا بھی

نام لیا گیا۔ یہ بہرحال طے ہے کہ سعدؓ کی معزولی خیانت یا نااہلی کی بنا پر نہ تھی۔

حضرت عمرؓ ایک بات اپنی رعیت سے ہمیشہ کہتے رہتے تھے اور اسے بار بار کہنے کے باوجود نہ تھکتے تھے، وہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے حکام کو لوگوں کی کھالیں ادھیڑنے یا اُن پر ظلم کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ بلکہ اس لئے بھیجا تھا کہ وہ امت کو دین کے نظام اور اس کے ارفع مقاصد سے آشنا کریں۔ اور آنحضرتؐ کے طرز عمل کی ترویج اور اشاعت کرتے رہیں۔ ساتھ ہی غنیمت میں آئے ہوئے مال کو بھی لوگوں میں تقسیم کرتے رہیں۔ آپ نے اکثر اپنے عمال سے یہ فرمایا تھا کہ وہ مسلمانوں کو مارا نہ کریں اس سے ان کی ذلت ہوتی ہے۔ انھیں اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ مسلمان کبیدہ خاطر یا کمزور نہ ہونے پائیں، آپ جب بھی کسی اسلامی لشکر کے سپاہی سے ملتے تھے تو اس کے بارے میں اور فوج اور اس کے سرداروں کے بارے میں سوالات کرتے تھے۔

آپ یہ بھی ناپسند کرتے تھے کہ کسی شہر کو فتح کرنے کے بعد عرب، وہاں بہت دن قیام کریں اور اس طرح تمدنی زندگی میں ملوث اور صحرائی زندگی کی جفا طلبی سے محروم ہو جائیں۔

باب ۱۴

مسلمانوں کی دو چھاؤنیاں کوفہ و بصرہ اور ملکی انتظام

حضرت عمرؓ نے بعض ان افراد کو دیکھنے کے بعد جن کے ذریعہ مدائن فتح ہوا تھا محسوس کیا کہ ان کے چہروں کے رنگ اڑ چکے ہیں۔ اس تغیر رنگ کے بارے میں جب ان لوگوں سے پوچھا گیا تو ان لوگوں نے کہا اس کا سبب ایسی آب و ہوا اور غذا ہے جس کے ہم عادی نہ تھے ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو لکھا کہ عرب اسی ماحول میں خوش رہ سکتے ہیں جس میں ان کے اونٹ خوش رہتے ہیں۔ لہٰذا بہتر ہے کسی خشک ساحلی علاقہ کو منتخب کر کے انہیں وہیں بسا دیا جائے۔

روایات بیان کرتی ہیں کہ سعدؓ نے چند لوگوں کو اس بات پر مامور کیا کہ حضرت عمرؓ کے پیش نظر جس قسم کی جگہ ہے وہ جگہ تلاش کی جائے۔ چنانچہ تلاش کنندگان نے تلاش شروع کی اور زمین کے اس بڑے قطعہ کو تلاش کر لیا جس پر بعد میں کوفہ کا شہر بسایا گیا۔ جس قسم کے احکامات سعدؓ کو موصول ہوئے تھے ویسے ہی عتبہ بن غزوانؓ کو بھی موصول ہوئے۔ ان ابن غزوانؓ نے بھی ایک قطعہ تلاش کیا جس پر بصرہ شہر آباد کیا گیا۔ ایرانی جنگوں میں جو مسلمان شریک ہوتے وہ انہیں دونوں شہروں میں قیام پذیر

ہوتے تھے۔ علاوہ بریں یہ شہر مسلمانوں کی چھاؤنیاں بھی بن گئے۔

ہر لشکر اپنی اپنی چھاؤنی میں رہتا تھا۔ اور اسی چھاؤنی سے نکل نکل کے فوجی دستے دشمن سے جنگ آزما ہوتے تھے۔ لڑائی کے لئے نکلنے والے دستوں کا چھاؤنی سے باہر جانا ایک باضابطہ تنظیم کے ماتحت ہوتا تھا۔ سپاہیوں کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ تعمیر کریں یعنی کسی محاذ پہ چھ مہینے سے زائد کی مدت کے لئے چھاؤنی سے غائب رہیں۔ حضرت عمرؓ نے انہی وجوہ کی بنا پہ، ملکوں اور صوبوں کی تنظیم اور تشکیل اسی دور کی اصطلاح میں کی تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنی مملکت کو مندرجہ ذیل بڑے صوبوں میں منقسم فرما دیا تھا۔

کوفہ، بصرہ، شام، جزیرہ، موصل، مصر، یمن، بحرین اور مصر بہر (صوبہ) کا ایک والی یعنی گورنر ہوتا تھا۔ ہر صوبہ اضلاع میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ انتظامی نقطۂ نگاہ سے گورنر صوبہ اور صوبہ میں واقع اضلاع کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اضلاع کے حکام گورنر کے حکم سے مقرر ہوتے تھے یا کبھی کبھی براہ راست حضرت عمرؓ کے حکم اور آپ کی ایماد سے یہ تقرر عمل میں آتا تھا۔ حکام اضلاع اپنے اپنے دائرہ کار میں خودمختار تھے۔ یہی لوگ زمینوں کے محاصل اور ذمیوں سے وصول کیا جانے والا جزیہ بھی مقرر کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جزیہ کا نظام اس انداز میں قائم کیا تھا کہ اسے ایک مکمل نظام کہا جا سکتا ہے۔ گورنر اور حکام اس نظام کی خلاف ورزی نہ کر سکتے تھے۔

ہر مالدار ذمی کے لئے سالانہ اڑتالیس درہم کی رقم دینی واجب تھی۔ متوسط طبقہ کے لئے یعنی ذمیوں کے متوسط طبقہ کے لئے چوبیس درہم اور ذمی ناداروں کے لئے بارہ درہم سالانہ کی رقم واجب الادا ہوتی تھی۔

حضرت عمرؓ یہ فرماتے تھے کہ ان لوگوں میں یعنی غیر مسلموں میں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی ذمہ داری میں آ کے ذمی ہو جاتے تھے ہر شخص، خواہ وہ کتنا ہی نادار ہو ایک درہم ماہوار تو دے ہی سکتا ہے۔

میرا خیال ہے حضرت عمرؓ نے مزارعتی ٹیکس کا نظام مفتوحہ ممالک میں ویسا ہی رہنے دیا جیسا کہ ایرانیوں اور رومیوں کے عہد میں تھا۔ ضلعی حکام یا داخلی علاقوں کے حکام

ان لگانوں اور ٹیکسوں کو وصول کر کے گورنروں کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ صوبوں کے گورنر ان رقوم سے عوام کے وظیفے اور سرکاری وسیقے دیا کرتے تھے اور امیرالمومنین کی مقامی طور پر نیابت کرنے کے سلسلہ میں جو ضروری مصارف ہوتے انھیں عمل میں لاتے اور باقی رقوم غنیمت کے پانچویں حصے کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ کے پاس بھیجدیتے تھے۔ اور حضرت عمرؓ ان تمام رقوم کو یعنی صوبوں سے آئی ہوئی رقوم اور صدقات کی مد میں آئی ہوئی رقوم کو امت کی فلاح وبہبود کی خاطر صرف کر دیتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے مفتوحہ ممالک میں یہی نظام جاری کیا۔ ہر گورنر کے ساتھ ساتھ آپ ایک متولی بیت المال (آج کل کی اصطلاح میں وزیر خزانہ) بھی روانہ فرماتے تھے۔ چنانچہ والی (گورنر) عوام کی دینی قیادت، ان میں ان کے سرکاری عطیات و وظائف کی تقسیم اور ان کے دوسرے بنیادی اور اہم معاملات کی نگہداشت کے ذمہ دار ہوتے تھے اور عامل حضرات خزانہ کا اہتمام و انصرام سنبھالتے تھے اور ضلعوں کے محاصل قبول کرتے تھے۔ وصول کرتے تھے۔ یہ لوگ والیوں کو عطیات و وظائف کی مد اور ذاتی مصارف کی مد کے لئے رقوم دیتے تھے اس کے بعد جو رقم باقی بچتی تھی اسے یہ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس بھجوا دیتے تھے اور تمام مصارف کا حساب بھی بھیجتے تھے۔

یہ سب اس لیے کہ حضرت عمرؓ حکومت اور دولت سے متعلق جملہ امور سے واقفیت رکھتے تھے۔ اور حکومت کی آمدنی اور اس کے مصارف کی جزئیات تک آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ آپ کی حکومت کے وزراء خزانہ اور صوبائی بیت المالوں کے امناء اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ جمع شدہ رقوم کے صرف میں مکمل ترین احتیاط کریں۔ اور امیرالمومنین کو کوڑی کوڑی کا حساب دے دیں۔

یہ حضرات شاید یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت عمرؓ میں تمام امور متعلقہ سے واقفیت بہم پہنچانے کی حیرت انگیز اور کرشمہ ریز اہلیت موجود ہے اور آپ والیوں سے مصارف اور آمدنی دونوں کا رتی رتی کا حساب لے لیں گے اپنی خلافت کے سال اول کو چھوڑ کے جس میں حج کی امارت حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ

کو سونپی گئی تھی، آپ ہر سال حج فرمایا کرتے تھے۔ حج کے لئے نکلنے سے پہلے ہی پہلے آپ والیوں کو کہلا بھیجتے تھے کہ اپنے اپنے صوبوں کے زائرین حج کی امیری اور قیادت سنبھالتے ہوئے حج کے لیے آئیں۔

یوں حضرت عمرؓ کے لیے ایک موقع فراہم ہوتا تھا کہ ایک طرف والیوں سے ملاقات کریں اور دوسری جانب رعیت کے وفود سے، چنانچہ والیوں سے آپ رعیت کے بارے میں پوچھتے تھے اور رعیت سے والیوں کے بارے میں!

والی جب اپنی رعیت پر ظلم وستم ڈھاتے تھے تو حضرت عمرؓ دادرسی کرتے تھے اور والیوں کو تنبیہہ کرتے تھے بلکہ ان سے ان مظالم کا قصاص دلواتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس معاملہ میں آپ سے بحث تک کی لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایسا کرنا عین رسالت مآبؐ کی تقلید ہے اور اس میں قطعاً کوئی مضائقہ نہیں۔ والی بے شک رعیت کو تنبیہہ کریں لیکن انھیں ظلم کا کوئی حق نہیں حاصل۔

آپ اکثر رعیت کے لوگوں ــــ یعنی عوام سے کہا کرتے تھے:۔

"کوئی بھی حاکم ہو اگر وہ کسی شخص کو تکلیف پہنچائے تو وہ مجھ سے شکایت کرے۔ میں اس کی پاداش میں اس حاکم کے سربراہ والی کی فہمائش کروں گا۔"

یوں، ایک عرب شخصیت کے ذریعہ، جسے مکمل طور پر یا معمولی طور پر بھی بدیسی تمدنوں کا کوئی علم نہ تھا ایک ایسی حکومت قائم کر دی گئی جس سے ایک طرف عوام کے تمام کے تمام مطالبات پورے ہو رہے تھے دوسری طرف لوگوں کے لیے عدل وانصاف کی ضمانت بھی ہو رہی تھی اور اسلامی اصولوں اور بدیسی طرز ہائے حکومت کی روشنی میں ان کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ لیکن اسلامی اصولوں سے ذرہ برابر انحراف بھی نہیں ہوتا تھا اور نہ عوام کے مفاد کو نقصان پہنچ رہا تھا۔

حضرت عمرؓ کی زبردست خواہش تھی کہ غیر مسلموں کے حقوق کسی حال پامال نہ کئے جائیں اور ان سے جزیہ اور خراج کی رقوم انصاف کے ساتھ، یعنی ذرا بھی ان پر زیادتی کئے بغیر، وصول کی جائیں۔

والیوں کو مستقل طور پر یہ جتلایا جاتا تھا کہ انھیں ذمیوں کے باب میں بہت محتاط رہنا پڑے گا اور انھیں ان کے ساتھ انصاف کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ ان غیر مسلموں کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسولؐ پر عائد ہوتی ہے۔

سلام دراصل غیر مسلموں سے اس بات کا معاہدہ کرتا ہے کہ وہ انھیں ان کا جائز حق دلائے گا۔ ان سے انصاف کرے گا اور ان کی ہر قسم کی حفاظت کرے گا۔

سورہ نحل کی آیت ۹۱ میں:-

"اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایفائے عہد کا حکم دیتا ہے۔
چنانچہ غیر مسلموں کی حفاظت کا عہد بھی ایک اہم
عہد ہے جسے پورا ہونا چاہیئے۔"

آیت کا مطلب و مفہوم

"عہد کرنے کے بعد اپنے عہد اور وعدے پورے کرو اور ایک بار جب قرار و پیمان باندھ لیا جائے اور اس پیمان بندی میں اللہ تعالیٰ کو کفیل بنا لیا جائے تو اسے ہرگز نہیں شکست کرنا چاہیئے اللہ تعالیٰ تمام انسانی افعال سے باخبر ہے۔"

حضرت عمرؓ نے اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں کا اس عالم میں بھی ذکر کیا جب آپ پیغام مرگ سن رہے تھے اور آپ کے لئے بزم جہاں سے رخصت ہونے کی گھڑی آ پہنچی تھی۔

حضرت عمرؓ نے والیوں کے لئے صرف یہی ضروری نہ سمجھا تھا کہ وہ اپنے اپنے صوبوں میں عدل قائم کریں۔ آپ نے یہ بھی ضروری سمجھا تھا کہ ان والیوں کے صوبوں میں اہل قضا بھی جائیں اور خداوندی احکامات نافذ کریں۔

"آپ چاہتے تھے کہ عدلیہ مطلقاً آزاد ہو"

اور بجز کتاب کے کسی چیز سے بھی متاثر نہ ہو۔ **قضاۃ** (جمع قاضی یعنی جج) کو یہ حکم تھا کہ انصاف قائم کرنے کے سلسلہ میں سب سے پہلے کتاب وسنت کی طرف رجوع کریں اور اگر متعلقہ اور زیر غور مسئلہ میں کوئی قرآنی حکم صراحت سے نہ موجود ہو تو عدل وانصاف تک پہنچنے کے لئے خود اجتہاد کریں۔

ججوں کو حکم تھا کہ کسی صورت میں بھی گورنروں کی ماتحتی اور زیردستی قبول نہ کریں۔ قاضی مقرر ہو جانے کے بعد ہر ایک شخص محض کتاب وسنّت کا پابند ہوتا تھا۔



باب ۱۵

سُرخ آندھیوں کا سال

۱۸ھ کے اواخر میں جس وقت کہ لوگ تازہ تازہ حج سے واپس آئے تھے سُرخ آندھیوں کا سال آگیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ حجاز، تھامہ اور نجد شدید خشک سالی کی لپیٹ میں آگئے۔ بارش جیسے روٹھ کے کہیں چلی گئی اور زندگی مطلقاً دشوار ہوگئی یہ خوفناک اور تباہ کن سلسلہ نو ماہ کی مدت تک جاری رہا۔ زمین کالی پڑگئی۔ اس سال کو سرخ آندھیوں کا سال کہتے ہیں۔

اس شدید آزمائش میں جس میں اُمت مبتلا ہوئی تھی حضرت عمرؓ کی شخصیت بہت نمایاں طور پہ اُبھر آئی تھی۔ اس معرکہ میں حضرت عمرؓ کا عزم بھی ظاہر ہوا اور ایک خاص انداز میں حضرت عمرؓ کی اس صفت کا ظہور رہوا جسے ناسازگار اور مخالف اور کمر شکن حالات سے پورے عزم اور صبر کے ساتھ نبرد آزما ہونے کی صفت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس نازک موقع پر فاروق عادلؓ نے ملّت کی پوری پوری پاس داری فرمائی اور رات دن غیر معمولی تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مشغول اور کوشاں رہے، تاآنکہ قوم نے از سر نو آسودگی اور فراغت حاصل کی۔

حضرت عمرؓ تمام دن منہمک رہتے تھے۔ پھر کافی دیر سے عشاء کی نماز ادا کرتے پھر گھر جاتے اور مزید عبادت کرتے تھے اور محض تھوڑی دیر سونے کے بعد پھر جاگ

اٹھتے تھے۔ جب آپ بیدار ہوتے تو ابھی رات باقی رہتی تھی اس کے بعد آپ کا معمول تھا کہ گھر سے باہر آ جاتے تھے اور مختلف راہوں سے گزرنے کے بعد مدینہ کے اطراف میں پہنچ جاتے تھے اور وہاں ان بادہ نشینوں اور صحرا نوردوں کو دیکھتے بھالتے تھے جو محض بھوک سے تنگ آ کے اور محض روٹی کی خاطر مدینہ کے اطراف میں آ کے پڑ رہے تھے۔ پناہ گزین ہو گئے تھے۔

حضرت عمرؓ ان آفت کے ماروں کے گھروں میں رات کے پچھلے پہر گشت لگاتے تھے جس گھر میں بھی آپ لوگوں کو کسی قسم کی تکلیف میں مبتلا پاتے (مثلاً اگر آپ یہ دیکھتے کہ کچھ لوگ پیاسے ہیں یا بھوکے ہیں تو فوراً اس کا تدارک فرماتے)

اکثر ایسا ہوتا کہ حضرت عمرؓ اپنے غلام کے ساتھ ساتھ آٹا اور زیتون کا روغن جس کے ساتھ بادہ نشین عرب روٹی کھا لیتے ہیں لئے پھیری سی لگاتے رہتے تھے۔ ادھر آپ نے کسی کو بھوک سے بے کل پایا اور ادھر آپ نے فوری طور پر اس کا تدارک کر دیا کبھی کبھی تو آپ خود ہی کھانا پکا دیتے تھے اس مشقت طلب کام کے بعد آپ پھر گھر لوٹ آتے تھے اور صبح کی نماز گھر آ کے ادا کرتے تھے۔

خشک سالی جب بہت شدید ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے گورنروں کو لکھ بھیجا کہ اولین فرصت میں فلاکت زدوں کے لئے کپڑے اور غذائی مواد کا انتظام کر دیں۔

راویوں نے ہمیں بتایا ہے کہ آپ نے حضرت عمرو بن العاصؓ والی مصر کو مندرجہ ذیل خط لکھا تھا:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ عمر۔ امیر المومنین کی جانب سے۔

عاصی ابن عاصی (عاصی یعنی گنہگار) کے نام :-

"کیا تم مجھے اور یہاں کے سب لوگوں کو ہلاک ہوتے دیکھتے رہو گے اور خود تم اور اہل مصر مزے سے زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ والی مصر! مدد۔ مدد۔ مدد"

راویت کی رو سے عمرو بن العاصؓ نے مہلت طلب کی اور یقین دلایا کہ

جلد از جلد ایک ایسے کارواں کے ساتھ مدد روانہ کریں گے جس کا پہلا اونٹ مصر اور دوسرا مدینہ میں ہوگا۔

مگر اس سلسلہ میں بعض راویوں کا خیال ہے کہ خشک سالی کے سال تک مصر فتح ہی نہ ہؤا تھا۔ ان حضرات کے قول کے مطابق مصر سنہ ۲۰ھ میں فتح ہوا تھا چنانچہ حضرت عمرؓ کے عمرو بن العاصؓ کو لکھنے یا ان کے مدینہ میں مدد بھیجنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مگر ابن سعدؒ بار بار حضرت عمرؓ کے عمرو بن العاصؓ کو لکھنے اور وہاں سے مدد آنے کی روایت دہراتے ہیں۔

ابن سعد کہتے ہیں :-

"عمر بن الخطابؓ پہلے شخص ہیں جن کے دور میں غذائی سامان بحری راستے سے آیا۔ یعنی مصر سے بحر قلزم کے راستے آیا۔

ایک بات جو یقینی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے گورنروں نے ان کے پاس کافی مقدار میں غذائی سامان روانہ کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے چند لوگ اس بات پہ مامور کر رکھے تھے کہ وہ پہلے اس سامان کو جا کے اپنی تحویل میں لیں اور پھر اسے لیکر بادہ نشینوں کے علاقوں میں جائیں۔ ان کے لئے اونٹ ذبح کریں۔ انہیں آٹا دیں اور پہننے کے لئے کپڑے دیں اور ہر قبیلہ کو اس کی ضروریات کے مطابق ضروری چیزیں فراہم کر دیں۔ ان لوگوں کو یہ حکم تھا کہ ایک متحرک اور ستیار امدادی پارٹی کی طرح راستہ میں بھی حاجت مندوں کی حاجت براری کرتے جائیں۔ یعنی بھوکوں کو غذا بانٹتے ہوئے اور ننگوں کو کپڑا تقسیم کرتے ہوئے۔ حضرت عمرؓ ہر روز بعیریں ذبح کرواتے اور پھر اعلان کروا دیتے جسے بھی کھانا میسر نہ آرہا ہو وہ آجائے۔ حاجت مندوں کے لئے صلائے عام تھی۔ اور کھانا کیا تھا گوشت اور اس میں بھیگی ہوئی روٹیاں یعنی ثرید۔

امیرالمومنین کے پاس کچھ آدمی اس لئے مامور تھے کہ گوشت کو بنائیں اور کاٹیں اور کچھ اسے بعد میں بھونتے اور پکانے پہ مامور تھے۔ اس کے بعد گوشت میں روٹی بھگو دی جاتی اور اس پہ زیتون کا روغن ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ تھی امیرالمومنین کی دعوتِ شیراز

بچے۔ بس خشک سالی کے دَور میں ہزاروں نے قبول کیا تھا۔ کھانے کے بعد لوگ بیوی بچوں کے لئے بھی سامان غذا لے جاتے تھے۔

حضرت عمرؓ کسی حال تیار نہ ہوتے تھے کہ اپنی ذات کو کسی معاملہ میں بھی دوسروں پر ترجیح دیں۔ چنانچہ مخصوص غذا تو درکنار آپ عام لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے یعنی وہی نان خشک اور روغن زیتون! پھر وہ دور بھی آیا جب درویش صفت عمرؓ نے اپنے اوپر ساری لذتیں حرام کر لی تھیں گوشت، گھی اور دودھ، سب حرام کر لی تھیں۔

روغن زیتون کھاتے کھاتے حضرت عمرؓ اس کی گرم تاثیر کا شکار ہو گئے، اپنے غلام سے کہہ کر بعد میں آپ نے اس تیل کو آگ پر گرم کروانا اور پکوانا شروع کر دیا تاکہ اس کی حدت اور حرارت میں کمی واقع ہو جائے۔ مگر تیل نے پکنے کے بعد اور ہی گل کھلائے امیر المومنین کے لئے یہ تیل مروڑ اور نفخ لے کے آیا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ فاروق عادلؓ کا شکم مبارک جب بولنے لگتا تو آپ اپنا ہاتھ پیٹ پر مارتے اور فرماتے :۔

"اے شکم! تیری فریاد نہیں سُنی جائے گی۔ اور کھانے کو تجھے یہی تیل ملتا رہے گا۔ البتہ جب امت کو زندگی کی آسائشیں میسر ہو جائیں گی تو دیکھا جائے گا!"

کبھی کبھی تو حضرت عمرؓ خود اپنے شکم پر ہاتھ مار کے یہ کہتے ہوئے سُنے گئے :۔

"تجھے اسی روکھی سوکھی غذا کا اس وقت تک عادی رہنا پڑیگا جب تک لوگ از سر نو زندگی کی افراطِ عیش حاصل نہ کر لیں گے۔"

اپنے گھر کے ارکان اور کنبہ کے افراد پر اس پوری مدت میں آپ نے حد درجہ سخت گیری فرمائی گو عام حالات میں بھی یہ سخت گیری جاری رہتی تھی لیکن اس دَور میں تو، اس تصور سے کہ لوگ بھوکے ہیں۔ کھانے پینے اور پہننے کے معاملہ میں آپ اہل و عیال کی ذرا پروا نہ کرتے تھے۔ عام لوگ جس مصیبت میں مبتلا تھے اس سے آپ گھر سے رنج و غم میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اس حد تک کہ آپ کے دوست آپ کا یہ عالم دیکھ کے سوچنے لگے تھے کہ کہیں یہ دل سوزی اور جاں کاہی آپ کے لئے جان لیوا ثابت نہ ہو۔

حضرت عمرؓ کا رنگ جو اب تک سرخ سفید تھا سیاہ پڑ چکا تھا اور چہرہ پر جیسا ہی دوڑ گئی تھی کثرت سے تیل کھانے اور بھوکے رہنے کا نتیجہ تھی۔

حضرت عمرؓ اکثر و بیشتر اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے رہتے تھے کہ امت محمدی کم از کم ان کے امیرالمومنین ہوتے ہوئے تباہ و برباد نہ ہو۔

بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن آپ نے مسجد میں تقریر شروع کی اور مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے اعمال کی بنیاد خوف الٰہی کو بنائیں اور سب سے پہلے اپنے دلوں کی آلودگیاں ختم کریں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ یعنی یہ قحط اور یہ خشک سالی کی تباہ کاریاں کا سلسلہ یہ سب رب دو عالم کا غضب ہے البتہ انہیں یہ نہیں معلوم کہ اس میں خاص ان کی ذات مغضوب ہے یا امت محمدی کے افراد ہیں کہ غضب کا شکار ہیں۔ یہی خیالات تھے جن کے پیش نظر آپ عام لوگوں سے بار بار اس بات کی اپیل کرتے تھے کہ وہ اپنے گناہوں اور خطاؤں سے تائب ہوتے رہیں اور پاکبازانہ زندگی کی طرف مستقل گامزن ہوتے رہیں۔

ابن سعدؒ کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ نے نماز استسقاء ادا کی لیکن یہی ابن سعد اور دوسرے محدثین دو چیزوں میں غلط بحث کر دیتے ہیں "۔

پہلی بات تو یہ ہے اور میں نہیں کہہ سکتا یہ بات کس حد تک صحیح ہو سکتی ہے، کہ مدینہ میں کسی شخص نے اپنی ایک بکری ذبح کر ڈالی۔ اس بکری کو ذبح کرنے پر اس شخص کے لڑکوں نے بھوک سے تنگ آ کے اصرار کیا تھا۔ بکری تو ذبح ہو لی لیکن ذبح ہونے پر اس میں سوا سے ہڈیوں کے کچھ بھی نہ نکلا۔ اس شخص نے یہ دیکھ کے آنحضرتؐ کے نام نامی کو پکار کے فریاد کی چند دن بعد اس شخص نے رسالت مآبؐ کو خواب میں دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ آنحضرتؐ اس سے فرما رہے ہیں کہ عمرؓ سے میرا سلام کہو اور کہو الکیس الکیس یعنی کیسہ زر، (روپیوں کی تھیلی) صبح ہونے پر اس شخص نے یہی کیا۔ یعنی حضرت عمرؓ کے پاس گیا اور یہ خواب بیان کیا۔

ابن سعد نے اپنے شیوخ سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خواب سننے کے بعد حضرت عمرؓ کانپتے ہوئے باہر نکل آئے اور کچھ بیان کرنے کی غرض سے آ کے منبر پر تشریف فرما ہو گئے لوگ بھی جمع ہو گئے حضرت عمرؓ نے مجمع سے پوچھنا شروع کر دیا تھا کہ آیا ان کے طرز عمل میں لوگوں ک

کوئی بات قابل گرفت نظر آئی ہے ؟ لوگوں نے ہم آواز ہو کے کہا :- "نہیں" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ انہیں ایک شخص نے ایک عجیب قسم کا خواب سنایا ہے اور بظاہر وہ خواب نہیں ہے، لیکن مجمع برس میں ایک شخص بلسل اثنا خواب کی تعبیر صاف ہے، آنحضرت حکم دے رہے ہیں کہ نماز استسقاء ادا کی جائے اور اللہ تعالیٰ سے طلب آب کی دعا کی جائے۔ چنانچہ ایک خاص دن مقرر ہوا جس دن حضرت عمرؓ نے مدینہ میں اور عمال حکومت نے مملکت کے دوسرے حصوں میں نماز استسقاء ادا کی۔ اس دن کے بارے میں عمال کو پہلے سے لکھ دیا گیا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ ایک دن استسقاء کی نماز ادا کرنے کی غایت سے نکلے تمام لوگوں نے بھی حضرت عمرؓ کے ساتھ گڑ گڑا گڑگڑا کے دعا مانگی کہ خشک سالی کا دور ختم ہو۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالیٰ سے نبیؐ کے چچا کے وسیلہ سے خشک سالی کی ہولناک مصیبت سے نجات چاہی۔ روایت کی رو سے ایسا کرتے وقت عالم یہ تھا کہ حضرت عمرؓ اور پوری قوم زار و قطار رو رہے تھے تمام راویوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ چند ہی دنوں کے بعد جل تھل ایک ہو گئے تھے۔ آنحضرتؐ کو کسی کے خواب میں دیکھنے والی روایت کے بارے میں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کس حد تک درست اور صحیح ہے البتہ عباس بن عبد المطلب کے توسل کا قصہ میری رائے میں مطلقاً افترا و کذب ہے ظاہراً اس روایت کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد عباسیہ کے حکمرانوں کو خوش کیا جائے۔ حضرت عمرؓ ان لوگوں میں نہ تھے کہ اللہ تک رسائی کرنے کے لئے کسی کا سہارا کسی کی سفارش طلب کرتے۔ ایک بات قطعی اور تحقیق کے محک آزمائش پر پوری اترتی ہوئی ہے وہ یہ کہ حضرت عمرؓ نے طلب آب کی نماز ادا کی تھی۔ اور اس نماز کی ادائیگی کے تھوڑے یا کچھ ہی دنوں کے بعد اللہ کے حکم سے بارشیں آگئی تھیں اور جل تھل ایک ہو گئے تھے۔ حضرت عمرؓ جب مطمئن ہو گئے کہ بارش نے قحط پر غلبہ پا لیا ہے اور لوگ سیراب ہو چکے ہیں تو آپ نے اب ان بادیہ نشینوں اور دشت و جبل کے مکینوں کو جو مدینہ کے اطراف میں آ گئے تھے ان کے اپنے اپنے مقاموں پر روانہ کرنا شروع کر دیا لیکن ان لوگوں کو کہ پناہ گزیں تھے۔ ہٹانے میں آپ پوری پوری احتیاط برت رہے تھے۔

خشک سالی کے ان قہر انگیز اور ہلاکت خیز مہینوں میں حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے

بھی مدینہ سے آدمی ارسال نہیں کئے۔ دوسرے سال حضرت عمرؓ نے اپنے محصل روانہ کئے اور انہیں ہدایت دی گئی تھی کہ اس سال دگنا محصول لیں لیکن آدھا وہیں قبیلہ کے ناداروں میں بانٹ آئیں۔ آدھا البتہ واپس لے آئیں۔ ان واقعات سے حضرت عمرؓ کا ایک بالکل صحیح تصور ذہنوں میں قائم ہو جاتا ہے۔ ان واقعات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو امت کے گوناں گوں مسائل، ان کے حل کا۔ ان کے لئے ہمہ جہت سعی کرنے کا کس درجہ خیال تھا۔ ان واقعات سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی ذات گرامی اور جان موقر پر کس قدر ایثار کرتے تھے۔ کچھ یہ بھی نہیں کہ خدانخواستہ آپ تنگدست رہے ہوں اور یہ ایثار بربنائے مجبوری تھا۔ یہ ایثار اس جذبہ عالیہ کے ماتحت تھا کہ آپ یہ نہیں پسند فرماتے تھے کہ لوگ تو بھوکوں مرتے رہیں۔ ہلاکت کا شکار رہیں، مصیبت میں گرفتار رہیں اور امیر المومنین اہل ان کے مدینہ کے رفقاء فراغت میں بسر کریں!

اس مردافگن دور میں حضرت عمرؓ ایک بات بار بار فرمایا کرتے تھے اور ان کے اس قول سے عدل و مساوات اور انسانوں کی مطلق برابری پر ان کا عقیدہ ظاہر ہوتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے

"پہلے تو ہم اس بات کی کوشش کریں گے کہ بیت المال کے غذائی ذخیروں سے قوم کو کھلائیں۔ اگر ہم اس میں ناکام رہے تو ہم ہر گھر پر اس گھر کے افراد کی تعداد کے برابر لوگوں کو کھلانے کی ذمہ داری ڈال دیں گے۔ یعنی گویا ہر آدمی اور ہر متنفس کو اپنے کھانے میں ایک اور آدمی کو شریک کرنا پڑے گا۔ اس طرح ہر شخص کو آدھا پیٹ ملے گا اور آدھا پیٹ کھا کے مر کوئی بھی نہیں سکتا۔"

مطلب یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ یہ چاہتے تھے کہ جس وقت حکومت کے غذائی ذخائر جواب دے جائیں تو مدینہ اور دوسرے شہروں کے امراء اپنے اوپر ناداروں کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری قبول کریں تاکہ یہ نہ ہو کہ آسمان کے نیچے ایک طبقہ آسودہ حال ہو اور دوسرا بھوک سے مر جائے۔

اسلام کی پوری اور تابناک تاریخ میں ایک خلیفہ یا ایک بادشاہ بھی ایسا نہیں ہوا جس نے اس عظیم کردار کا یا اس سے ملتے جلتے کردار کا جس کا ثبوت حضرت عمرؓ نے پیش کیا، مظاہرہ کیا ہو بلکہ میرے خیال میں تو قدیم اور جدید دونوں ادوار میں پوری انسانی اور عالمی تاریخ کا کوئی حکمران یا تاجدار اپنے معاصر ہم مذہبوں اور غیر ہم مذہبوں سے اس رواداری، فیاضی، حسن سلوک اور انسانیت کا ثبوت نہیں دے سکا۔

باب ۱۶

دانشمندانہ قیادت اور امامت کی جھلکیاں

اپنی خلافت کے دور میں حضرت عمرؓ نے امامت کے دنیاوی مسائل ہی کی جانب توجہ نہ کی تھی بلکہ ان کے دینی امور کی طرف بھی پوری توجہ کا ثبوت بہم پہنچا رہے تھے چنانچہ منبر میں آپ مسلمانوں کو دین مبین کے مختلف مسائل سے واقف بھی کراتے رہتے تھے۔ ہر روز آپ جھٹپٹے وقت گھر سے باہر آ جاتے اور منبر پر بغرض تقریر بیٹھ جاتے۔ آپ کی ان حکیمانہ مجلس آرائیوں کی بات وہ رنز دیک ہر جگہ پھیل جاتی اور رموز دین جاننے اور عقل و حکمت کے موتی لوٹنے کی غرض سے لوگ جوق در جوق پہنچ جاتے تھے۔ آجکل کی اصطلاح میں حضرت عمرؓ ایک عملی انسان تھے۔ چنانچہ اپنی ان گہر ریز اور آتشیں تقریروں کے ذریعہ آپ محض دینی مسائل ہی نہ بیان کرتے تھے۔ دراصل آپ یہ سعی کرتے تھے کہ دین و دنیا کے ہنگامہ خیز مسائل میں تطبیق قائم کی جا سکے اور عام لوگ یہ سمجھ سکیں کہ اپنی روزمرہ کی زندگیوں کو کس طرح الٰہی احکامات اور خداوندی فرامین کا مظہر بنا سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ ان مجلسوں میں مفسر قرآن کی حیثیت سے قرآنی آیات کا مفہوم اس طرح واضح کر کے رکھ دیتے تھے کہ وہ لوگوں کی عملی زندگی سے تطابق پیدا کر سکیں، اسی تقریر ہی کے دوران فاروق اعظمؓ امت کے افراد کو قرآن و سنت کی روشنی میں ہدایت اور ادب اور معرفت نفس اور قول و عمل اور گفتار و کردار میں اللہ کی رضا جوئی کی راہ رشد دکھاتے تھے۔ عمری ادب گاہ دین و دانش کا دلبستان ہوتی تھی۔

صوبوں میں آپ چیدہ چیدہ لوگوں کو امیر شریعت بنا کے بھیجتے تھے۔ ان لوگوں کا کام یہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو روحانی اور فکری طور پر تندرست رکھنے کی خاطر ان کے لئے باجماعت نمازوں کی تنظیم کریں انہیں شریعت حقہ کے اصول سمجھائیں، ان میں عدل و مساوات کی روح جو جان اسلام ہے، نافذ کریں اور ان میں رہ کر ایسے کردار کا ثبوت دیں جو مکمل طور پر اسلام کی محترم تعالیم کا عکس ہو۔ کبھی کبھی ان امیران شریعت کے ساتھ ساتھ اصحاب رسولؐ بھی بھیجے جاتے تھے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ یہ امت کو دین کے اسرار سمجھائیں اور کتاب اللہ سے اس کا تعلق مستقل طور پر برقرار رکھیں اور اس کے اخلاق شدھاریں۔ حضرت عمرؓ نے اس پر بس نہ کیا تھا آپ نے دین کے جملہ امور کو مکمل توجہ کا مستحق سمجھا تھا تمام جزئیات دین پر آپ کی نظر غائرانہ پڑتی تھی نہ کہ طائرانہ، حکیمانہ پڑتی تھی نہ کہ غیر عاقلانہ، یہی سبب تھا کہ آپ بعض ایسی دینی پابندیوں کے موجد ثابت ہوئے جو اپنی موجودہ شکل میں آنحضرتؐ اور صدیق اکبرؓ کے ادوار میں نہ تھیں۔

مثلاً عشاء کی نماز کے بعد، رمضان میں صلوٰۃ تراویح کی سنت آپ ہی کے زمانہ سے رائج ہوئی اور یہ پابندی محض مردوں ہی کے لئے نہ تھی، عورتوں کے لئے بھی تھی۔ مردوں کے لئے ایک مرد قاری ہوتا تھا جو ان کے لئے تراویح میں قرآن پڑھتا تھا اور عورتوں کے لئے ایک ایک عورت قاری ہوتی تھی۔ یہ رواج آپ کے زمانہ میں تمام عالم اسلام پر مسلط ہو گیا۔ آپ نے احکامات صادر کئے کہ پوری امت اس طریق کو قبول کرے۔

شراب خواروں اور بادہ آشاموں کو حضرت عمرؓ نے کڑی سزائیں دیں۔ آپ سے پہلے شرب خمر کی شرعی سزا نہ مقرر ہوئی تھی۔ جہاں تک نص قرآنی کا تعلق ہے شراب بے شک حرام ہے لیکن شراب پینے کی سزا متعین نہیں۔ صرف یہ ہے کہ اللہ کے اوامر و نواہی کی پروا نہ کرنے والوں کو قیامت میں جو عذاب ملے گا انہیں ہی میں میخوار اور بادہ گسار بھی شامل ہوں گے۔

حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرتؐ کے کسی بھی فعل میں ادنیٰ سا بھی اضافہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس خیال سے کہ مسلمان دور و نزدیک پہنچ رہے ہیں۔ اقلیم و کشور فتح کر رہے ہیں ممکن ہے مرکز سے یہ دوری اور یہ بُعد انہیں اوامر و نواہی کے باب میں تغافل شعار بنا دے تقلید میں اجتہاد کا رنگ بھر دیا اور خالص اسلام کی خاطر کچھ نئی سنتیں رائج کر دیں۔

مدینہ میں جس وقت عمرؓ عادل وژرف بین نے دولت کی بہتات دیکھی تو آپ کو یہ خوف لاحق ہونے لگا کہ کہیں اس کثرت مال ومنال کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ لوگ اپنی بدفطرت کی جانب مائل ہو جائیں اور ایام جاہلیت کی بزم نوشانوشش پھر سے آراستہ ہو جائے۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر آپ نے اس معاملہ پر سخت کڑی نگاہ ڈالی اور مسلمانوں سے مشورہ لیا کہ شراب پینے والے کے لئے کیا سزا رکھنی چاہیے۔

محدثین نے بیان کیا ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت علیؓ کا مشورہ یہ تھا کہ چونکہ جب ایک آدمی شراب پی لیتا ہے تو وہ مدہوش ہو جاتا ہے اور عالم مدہوشی میں وہ بے تکلف لوگوں پر تہمت دبہتان لگا سکتا ہے اس لئے عملاً شراب خور، بہتان تراش کے مساوی مجرم ہوا۔ لہٰذا اس کی سزا بھی وہی اسی کوڑے، یعنی بہتان لگانے والے کی سزا کے برابر ہونی چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کی یہ صائب رائے قبول کر لی اور پہلے اسے مدینہ میں عملی طور پر نافذ کیا پھر اپنے گورنروں کو لکھ بھیجا کہ شراب خوروں کو اس نہج پر سزا دیں۔

روایات حاکی ہیں کہ چند مسلمان جو شام کی فتح میں شریک تھے اور دمشق میں اس لشکر کے ساتھ داخل ہوئے تھے جس میں خود حضرت ابوعبیدہؓ تھے، دمشق کی نزہت انگیز اور جمیل زندگی سے متاثر ہو گئے اور شراب سے شوق کر ڈالا! حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو واقعہ کی اطلاع دے دی۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں تحریر کیا کہ شارہین خمسا سے مسجد میں سب کے سامنے پوچھا جائے کہ وہ شراب کو حلال سمجھتے ہیں یا حرام۔ اگر وہ اسے (شراب کو) حلال بتا دیں تو ان کی گردنیں مار دی جائیں اور اگر حرام بتائیں تو بھی ان پر حد شرع جاری کی جائے یعنی ان میں سے ہر ایک کو اسی اسی کوڑے مارے جائیں۔ میخواری کی یہ شرعی سزا چھپ کر یا خفیہ نہیں دی جاتی تھی بلکہ دوسروں کی عبرت کے لئے کھلے بندوں دی جاتی تھی۔

بہر حال حضرت ابوعبیدہؓ نے ان لوگوں سے عمری ہدایت کے مطابق سوال کیا کہ وہ شراب کو حلال جانتے ہیں یا حرام؟ ان لوگوں نے جواب دیا: "حرام" بس پھر کیا تھا تمام مسلمانوں کے روبرو شرعی حد جاری کی گئی یعنی ان میں سے ایک ایک کو اسی اسی کوڑے مارے گئے۔ اتفاق سے ان شراب پینے والوں میں قریش کے ایک معزز شخص بھی تھے جنہوں نے دین کی خاطر سختیاں

سہمی مقیس اور فتح مکہ سے پہلے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ ان کا نام ابوجندل بن سہیل بن عمرو تھا۔

ابوجندل پر جب شراب خوری کی علت میں حد جاری کی گئی تو ان پر اس درجہ ندامت اور خجالت کے جذبات طاری ہوئے کہ وہ گھر بیٹھ رہے۔ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ ابوعبیدہؓ نے ان کے بارے میں حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجا اور ان سے گزارش کی کہ ابوجندل کو دو لفظ لکھ بھیجیں تاکہ ایک طرف واقعہ حد شرعی پر ان کے آنسو پونچھے جا سکیں اور دوسری جانب ان کے لئے اُمید کے بند کواڑ از سر نو کھل جائیں۔

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابوجندل کو ابوعبیدہؓ کی درخواست کے مطابق ایک خط لکھا بھی اور اس میں ایک طرف ان کی اشک شوئی کی دوسری جانب انہیں مایوسی اور ناامیدی سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ اس تحریر میں سورۂ زمر کی آیت ۵۳ کو زیب عنوان بنایا گیا تھا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے :۔

" آپ فرما دیجئے اے رسول معظمؐ کہ ان اصحاب کے لئے جن سے کچھ زیادتیاں سرزد ہو گئی ہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی رحمت انہیں از سر نو اپنے دامن میں لے سکتی ہے وہ تمام کے تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے وہ تو صد درجہ کرم گستر اور بندہ نواز ہے۔"

اس دل نشیں حکیمانہ نامے کو پڑھنے کے بعد ابوجندل کا ابر غم چھٹ گیا اور وہ حسب معمول اُمت کے دوسرے افراد سے ملنے جلنے لگے۔

حضرت عمرؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن الاوسط ابی شحمہ کا واقعہ معروف و مشہور ہے۔ اس واقعہ سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ جو حضرت عمرؓ کے باب میں کہا جاتا رہا ہے کہ وہ خدا کے معاملہ میں کیسی بھی بدنامی کی ادنیٰ سی پرواہ نہ کرتے تھے یہ حرف بحرف صحیح ہے۔

پورا قصہ یہ ہے کہ یہ لڑکا مصر میں تھا وہاں اس نے کسی دوست کے ساتھ بیٹھ کر شراب پی لڑکوں نے شراب تو پی لی لیکن بعد میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ دونوں والی کے پاس پہنچے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے یہ پسند نہ کیا کہ امیرالمومنینؓ کے بیٹے پر برسرعام حد جاری کی جائے چنانچہ حد تو جاری کی گئی مگر گورنر کے مکان کے صحن میں! یہ خبر حضرت عمرؓ تک پہنچ گئی اور داخلی علاقوں کی کون سی بات تھی جو گوش حق نیوش عمرؓ تک نہ پہنچ رہی تھی؟ حضرت عمرؓ نے عمرو

بن العاصؓ کو اس بات پر کہ انہوں نے امیرالمومنینؓ کے بیٹے سے خصوصی برتاؤ کیا، شدید تنبیہ اور فہمائش کا خط لکھ بھیجا۔ اس خط میں محض تنبیہ ہی پر اکتفا نہ کی گئی تھی اس میں یہ حکم بھی درج تھا کہ امیرالمومنینؓ کے بیٹے کو ایک ننگے اونٹ کی پشت پر سوار کرا کے مدینہ روانہ کر دیا جائے تاکہ اس لڑکے کے لئے سفر اور بھی دشوار ہو جائے۔ عمرو بن العاصؓ نے امیرالمومنین کے احکامات کی پیروی کی لیکن ساتھ ہی لکھ بھیجا کہ انہیں بے حد افسوس ہے کہ غلط فہمی ہوئی اور ان کے بیٹے کو جو سزا دی گئی تھی اس میں کوئی رعایت نہیں برتی گئی۔ تمام سزائیں یوں ہی والی کے صحن میں دی جاتی ہیں۔ مگر حضرت عمرؓ بھلا کب کسی کی ماننے والے تھے والی کے عذر کو بالکل قبول نہ کیا اور اب لڑکے کا انتظار کرنے لگے جس وقت یہ نوجوان مدینہ پہنچا تو بالکل بیمار اور شکستہ سا تھا۔ سفر مدد دراز نے اس کی یوں ہی گت بنادی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس لڑکے کی بیماری کی پرواہ کی اور نہ رنج سفر کی۔ اسے دیکھتے ہی تمام مسلمانوں کے روبرو اس پر حد جاری کرنی شروع کر دی۔ یعنی اسے کوڑوں کی اسّی ضربیں مارنے کے ارادے سے کوڑے لگانے شروع کر دیے۔ بیٹے نے باپ سے فریاد بھی کی لیکن فاروقؓ عادل ذرا بھی ملتفت نہ ہوئے اور جب لڑکے نے یہ کہہ دیا کہ "تم میرے قاتل ہو" تو اس پر بھی حضرت عمرؓ متاثر نہ ہوئے اور بھرپور ضربیں مارنے کا عمل جاری رکھا۔

روایت ہے کہ جس وقت حضرت عمرؓ نے بیٹے کو بالکل ہی موت کے دہانہ پر دیکھا تو اس سے صرف اتنا کہا:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے ملاقات ہو تو کہنا کہ تمہارا باپ ان کی لائی ہوئی شریعت کے نفاذ کے لئے حدیں جاری کرتا ہے"

یہ لڑکا مر گیا۔ مگر کیا باپ نے اس موت پر کسی قسم کے رنج و غم کا اظہار کیا؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ حضرت عمرؓ نے محض شراب پینے کے جرم میں شرعی حدیں نہیں نافذ کی تھیں بلکہ شراب فروشوں کو بھی آپ انتہائی کڑی سزائیں دیتے تھے۔ ایک بار تو آپ نے رشید ثقفی نامی شخص کا اس علت میں مکان ہی جلوا دیا اور اسے شہر بدر کروا دیا۔ یہ شخص پہلے تو خیبر چلا گیا پھر وہاں سے دوبارہ روم میں پہنچ گیا جہاں اس نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔

آپ کی نظران تمام لوگوں اوران تمام خطا کاروں کو بیچھا کرتی تھی جس میں کسی نہ کسی قسم کی دینی مداہنت پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ ایک خط لگ گیا جسمیں لکھنے والے نے کسی کو ایک شعر لکھا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ وہ حضرت عمرؓ سے اس بات کی ضمانت چاہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں ایسے انتظامات ہونے چاہییں کہ اس کی ناموس پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

مکتوب الیہ بنی سلیم کا رہنے والا ایک سپاہی پیشہ تھا جس کا نام جعدہ تھا اور جس کی عادت یہ ہو گئی تھی کہ وہ ان سپاہیوں کی بیویوں کے لئے جو جنگ پر گئے ہوئے تھے کچھ غلط ارادے رکھتا تھا یعنی انہیں ورغلانے کی کوشش کرتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے اس شخص کو یعنی جعدہ السلمی کو بلا بھیجا اور اس کے بعد اسے سو کوڑے رسید کروائے اور اسے اسلامی سپاہیوں کے غیاب میں ان کی مستورات سے ملنے سے روک دیا۔

یوں اپنے ابتدائے عہد خلافت سے انتقال تک حضرت عمرؓ دینی امور میں حد درجہ شدت برتتے رہے تھے۔



باب ۱۷

نماز تراویح
اور
حضرت عمرؓ کی فقہی احتیاط

رمضان میں نماز تراویح کا آغاز کرانے کے سلسلے میں حضرت عمرؓ پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح شراب خور پر شرعی حد جاری کرنے پر بھی، بلکہ اس سے حضرت عمرؓ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اس عمل سے یقیناً حضرت عمرؓ نے اللہ کی خوشنودی حاصل کی ہوگی اور ان کی خدمات جلیلہ کے صلہ میں انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو مزید نوازنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ یقیناً یہ خدمت ان عظیم خدمات میں اضافہ تھی جو حضرت عمرؓ نے نبیٔ اعظمؐ کی رفاقت اور حضرت ابوبکرؓ کی مشیری کے سلسلہ میں اتنے نمایاں طور پر انجام دی تھیں۔ امت کے مسائل سے گہرا ربط، ناداروں اور امیروں کے لئے یکساں دلسوزی، اسلام کی فتوحات کے دائرے کی وسعت، جو آنحضرتؐ اور ابوبکر صدیقؓ کے ادوار میں اس درجہ نہ پھیلی تھیں۔ یہ خدمات بھی کم اہم نہ تھیں۔ اور انہیں بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔

ایک چیز جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت مکروہ ہے وہ یہ ہے کہ قائدین امت کسی ایسی نئی اور انوکھی بات کو شروع کریں جس کا اسلامی نقطۂ نگاہ سے جواز نہ ہو۔ یا یہ کہ امت کے مسائل سے تغافل برتا جائے۔ اسی طرح قائد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی ذات کو مسلمانوں یا اسلامی

مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں پر ترجیح دے۔

جب صورت حال یہ ہے اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے امیر اور امام کے فرائض اتنے صبر آزما ہیں تو حضرت عمرؓ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی غیر اسلامی بدعت کا آغاز کریں گے۔ حضرت عمرؓ تو ہمیشہ اپنے اندر ایک شدید آرزو اس بات کی رکھتے رہے کہ مسلمان خوش حال رہیں۔ اور غیر مسلموں سے بھی انتہائی نرمی کا برتاؤ کیا جائے اور سب خوش دلی اور آسودگی میں زندگی گزاریں۔ ان سے یہ توقع کی ہی نہ جا سکتی تھی کہ وہ خدائی احکام کی خلاف ورزی کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ مزمل میں نبی صلعم کو قیام لیل کا یعنی راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت کرنے کا حکم دیا ہے۔

"اے محمدؐ جو کپڑے میں لپٹ رہے ہو رات کو قیام کیا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات یا اس سے کچھ کم یا اس سے زیادہ۔ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔"

چنانچہ مسلمانوں کے لئے تراویح کی سنت رائج کر کے حضرت عمرؓ نے دراصل ایک ایسی سنت کا اجراء کیا تھا جس کا مطالبہ خدا نے اپنے رسولؐ سے پہلے ہی کیا تھا۔ ایسا کرنے میں حضرت عمرؓ انتہائی سختی سے قرآنی احکامات کو پیش نظر رکھے ہوئے تھے۔

محدثوں نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ آنحضرت نے ایک دن رات کو مسجد میں قیام فرمایا یعنی نماز میں کھڑے ہو کر قرآن مجید پڑھا اور لوگوں نے اسے سنا۔ آنحضرتؐ کی اس مخصوص نماز میں جس میں آپ قرآن کی تلاوت فرماتے تھے شریک ہونے کے لئے لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ دوسرے دن بھی آنحضرتؐ نے پچھلی شب کی طرح قیام فرمایا اور پھر لوگوں کا ہجوم ہو گیا اس کے بعد لوگوں کا ہجوم بہت بڑھنے لگا اتنا کہ مسجد اٹ گئی۔ جب آنحضرتؐ نے یہ دیکھا تو آپؐ نے عشاء ہی کی نماز پر اکتفا کی اور قیام لیل مسجد میں نہیں گھر میں فرمایا۔ جب لوگوں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

"میں نے مسجد میں مزید قیام لیل سے اس لئے گریز کیا کہ مجھے یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ کہیں یہ فرض نہ ہو جائے اور تم لوگ اسے نباہ نہ سکو۔"

اب ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کیا کہ آنحضرتؐ ہی کے ایک

طریقہ کو جو آپ نے رمضان میں اختیار کیا دوبارہ رائج کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شراب کو حرام قرار دیا ہے اور اس کی تحریم میں بڑی سختی برتی ہے اور جس وقت شراب کی حرمت سے متعلق آیات سنائی گئیں تو پوری قوم نے اللہ اور رسول کے فرمان کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ لیکن آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اور کچھ مزید عرصہ کے گزرنے کے بعد بعض لوگ اپنی فطرت پر لوٹ آئے اور شراب پینے کے جواز میں طرح طرح کے بہانے تراشنے لگے۔ اب اگر حضرت عمرؓ نے حتی الوسع اس بات کی کوشش کی کہ لوگ خدا اور رسولؐ کی نافرمانی نہ کرنے پائیں تو اس میں آپ پر کوئی الزام نہیں عائد ہوتا۔ یوں بھی ایک امام کا اور خصوصاً دینی اور دنیوی دونوں امور میں اُمت کے قائد کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ قوم کی تربیت کرے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے شراب کے سلسلہ میں شرعی حد جاری کر کے کوئی زیادتی نہیں کی۔ بلکہ مہاجرینؓ اور انصار سے باقاعدہ مشورہ بھی لیا گیا تھا اور وہ حضرت عمرؓ کی رائے سے متفق بھی ہوئے تھے۔ حضرت علیؓ نے یہ مشورہ دیا تھا کہ شراب پینے والے کو اسّی کوڑے لگوائے جائیں۔

ابو محجن الثقفی کا قصہ مشہور ہے۔ اس شاعر نے ایک شعر کہا تھا جس میں اس نے شراب سے اپنا زبردست قلبی تعلق دکھایا تھا۔ یہ شعر قادسیہ کی جنگ کے موقع پر کہا گیا تھا۔ اس شعر کو سننے کے بعد حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے شاعر کو ایک محل میں پابہ زنجیر کر دیا تھا۔

ان شعروں کا مفہوم یہ ہے :۔

" جب میں مر جاؤں تو مجھے شاخ انگور کی جڑ میں دفن کیجیو۔ تاکہ مرنے کے بعد میری ہڈیاں بھی نشہ مے سے سرشار ہوتی رہیں۔ ہاں مجھے کسی چٹیل میدان میں مت گاڑ دینا کہ پھر دختر رز سے مجھے پیوستگی ہی نصیب نہ ہو۔"

عجب اتفاق ہے کہ قادسیہ کا معرکہ سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا اور ابو محجن نے خواہش ظاہر کی کہ اسے آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ بھی معرکہ میں شریک ہو سکے۔ حضرت سعدؓ نے انکار کر دیا۔ کچھ دیر بعد شاعر نے حضرت سعدؓ کی بیوی سلمیٰ بنت حفصہ سے یہ درخواست کی کہ اسے معرکہ میں شریک ہونے کے لئے آزاد کر دیا جائے اور حضرت سعدؓ کا گھوڑا (جس کا نام بلقاء تھا) وہ بھی اسے عاریتہً دے دیا جائے۔ شاعر نے وعدہ کیا تھا کہ معرکہ میں شریک ہونے

کے بعد خود ہی آ کے پابہ زنجیر ہو جائے گا۔

سلمٰی نے انکار کیا اور اسے ناپسند کیا کہ وہ اپنے شوہر حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کے کام میں دخیل ہوں۔

ابو محجن خاموش ہو گیا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر چند شعر کہے جن کا مفہوم مندرجہ ذیل ہے:۔

"میرے لئے اس سے زیادہ رنج والم کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ میدان کارزار میں تو مجاہدوں کی شمشیر زنیاں ہوتی رہیں اور میں پابہ زنجیر کسی جگہ عزلت گزیں رہوں۔ میں کہ قید سلاسل میں ہوں آخر کیسے اپنے جوہر نمایاں کر سکتا ہوں۔ ہائے اک دور تھا وہ بھی کہ میرے پاس دولت بھی تھی اور میرے ارد گرد رفقاء بھی تھے۔ لیکن آج سب نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے میں یہ قول دیتا ہوں کہ اگر مجھے زور دست اور ضربت کاری کے اظہار کے لئے چھوڑ دیا جائے تو بغیر پیمان شکنی کئے اسی زنداں میں پھر کشاں کشاں واپس آ جاؤں گا۔"

سلمٰی نے جب یہ دل گداز اشعار سنے تو متاثر ہوئیں اور ابو محجن کو اپنے شوہر کا گھوڑا (بلقاء) عاریتہً دے دیا اور معرکہ میں شریک ہونے کے لئے مشروط طور پر آزاد کر دیا۔

ابو محجن نے میدان کارزار میں شجاعت کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ راوی لکھتے ہیں کہ حضرت سعدؓ اثنائے جنگ جب کبھی اپنا گھوڑا دیکھتے تھے تو انہیں تعجب ہوتا تھا۔ معرکہ ختم ہونے کے بعد ابو محجن نے گھوڑا بھی واپس کیا اور اپنے کو سپرد زنجیر بھی کر دیا۔ سلمٰی نے سارا قصہ حضرت سعدؓ سے بیان کیا۔

حضرت سعدؓ نے ابو محجن کو معاف کر دیا۔ اب شاعر نے اللہ سے پیمان باندھا کہ اپنے شعروں میں کبھی ذکر شراب نہ کرے گا۔

میں نے یہاں اس قصہ کو اس لئے نہیں بیان کیا کہ میں ابو محجن کی شجاعت کی داستان بیان کرنی چاہتا تھا دراصل اس جنگ میں جو قادسیہ کے نام سے موسوم ہے بے شمار مسلمانوں نے شجاعت کا ثبوت دیا تھا۔ میرا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ حضرت سعدؓ نے ابو محجن کو شراب کا اس انداز میں ذکر کرنے پر قید کر لیا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ قادسیہ کے معرکہ میں ابو محجن نے شراب وغیرہ نہیں پی تھی۔ اسے ایام جاہلیت کا دور بادہ خواری یاد آگیا تھا۔ اور اس کے اشعار اسی کی غمازی کرتے ہیں اور یہ جو حضرت سعدؓ نے ابو محجن کو پابہ زنجیر کیا تھا اس کی غایت یہ تھی کہ آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس قسم کے اشعار سے ایک ایسے موقع پر جہاں نوائے جنگ کی ضرورت نہ تھی بلکہ زور دست و بازو کی، مسلمان متاثر ہوتے، اسی لئے آپ نے تنبیہ کے طور پر اسے گرفتار کیا تھا۔

حضرت عمرؓ مجبور ہو گئے تھے کہ شراب خوری اور مے فروشی کے معاملے کو توجہ کا مستحق قرار دیں۔ یوں بھی ایک امیرالمومنین کے لئے فرض سا ہو جاتا ہے کہ وہ صحت مند اور پاکیزہ اعمال کو نافذ کرے اور بدی کی قوتوں سے امت کو نجات دلائے اور اس سلسلے میں وہ ضرورت کے وقت جواز بھی ڈھونڈھ سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے محض دینی امور کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ بلکہ آپ اس سے آگے بھی بڑھے۔ مثلاً آپ نے ایک عدالتی نظام رائج کیا جو مملکت کے تمام صوبوں اور اقلیتوں میں پھیل گیا یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ خود مدینہ میں آپ ہی قضا کے فرائض انجام دیتے تھے۔ جب کبھی کسی مقدمے یا معاملے میں مدعی اور مدعا علیہ آپ کے پاس آتے تھے تو آپ اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھ جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ معاملہ کو فیصل کرنے میں وہ ان کی مدد فرمائے۔ اس لئے کہ ایک غلط عدالتی فیصلہ کرنا آپ کے نزدیک دین کے دائرے سے خارج ہونا تھا۔

حضرت عمرؓ نے معلموں کی ایک جماعت بھی قائم کی تھی جنہیں ایک خاص نظام کے تحت صوبوں میں بھیجا جاتا تھا۔ ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ لوگوں کو قرآن اور دین مبین کے قوانین و قواعد سکھائیں۔ یہ اقدام دراصل عمری بدعت نہ تھی بلکہ آنحضرتؐ ہی کی تقلید میں تھا۔ آنحضرتؐ نے بھی قبائل کے اندر اپنے رفقائے نامدار کو قرآن اور اصول دین کی تعلیم کے لئے بھیجنا شروع کیا تھا اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اس نظام کو بڑی دست بخشی اور یہ کوشش کی کہ ان معلموں کے جانے سے دور و نزدیک سب جگہ کے لوگ دین سے واقف

ہو جائیں۔ قرآن پڑھ سکیں اور اپنی زندگیاں سدھار سکیں۔

حضرت عمرؓ نے ابتدائی عمارت مسجد نبوی کو گرا دیا تھا اور اسے گروا کے اس کے قطعہ کو وسعت دی تھی یہ اقدام اس وقت ضروری ہو گیا جب مدینہ میں لوگوں کی آبادی بڑھ گئی۔ اب تک یہ ہوتا تھا کہ جب لوگ نماز پڑھ چکتے تھے تو اپنے گرد آلود ہاتھوں اور پیشانیوں کو صاف کرتے ہوئے کھڑے ہوتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے صحن مسجد میں کنکر کا فرش کروا دیا تاکہ لوگ اس سے بچے رہیں اور نماز میں سہولت ہو۔

مقام کعبہ کی موجودہ پوزیشن حضرت عمرؓ ہی نے متعین کی تھی۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں اگرچہ اس طرف توجہ ہوئی تھی لیکن اس خیال سے کہ قریش نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اب حضرت عمرؓ نے آنحضرتؐ کے ارادے کی تکمیل کر دی۔

حضرت عمرؓ کے سامنے جب کبھی کوئی مشکل مسئلہ آتا تھا آپ کتاب اللہ سے رجوع فرماتے تھے اگر کوئی صریح حکم قرآنی موجود ہوتا تھا تو آپ بغیر کسی پس و پیش کے اسی کی رو سے عمل کرتے تھے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ تو آپ سنت نبویؐ کا دامن تھامتے تھے۔ سنت اگر آپ کی مدد کرتی تو اس کی روشنی میں آپ بلا تکلف قدم اٹھا دیتے تھے لیکن نص قرآنی اور طریق نبوی کی غیر موجودگی میں آپ اجتہاد سے کام لیتے تھے اور وہ کرتے تھے جس میں آپ امت کی بھلائی دیکھتے تھے۔ آنحضرتؐ کے صحابہؓ سے جن کا آپ غیر معمولی احترام کرتے تھے آپ اس خیال سے برابر مشورہ لیتے رہتے تھے کہ شاید ان کے ذریعہ سے کسی نئی حدیث کی طرف راہنمائی ہو اور یہ بزرگ کوئی ایسی بات بتائیں جس سے امت صلاح و فلاح کی طرف گامزن ہو۔ آپ نے مملکت کے تمام گورنروں اور ججوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ آپ کی روش اختیار کرتے ہوئے اجتہاد اور مشورہ سے صرف اس صورت میں کام لیں۔ جب قرآن اور سنت ان کی مدد نہ کرے لیکن تا بحد مقدور یہی سعی کریں کہ انہیں قرآن و حدیث ہی کی راہ نمائی حاصل ہو۔

حضرت عمرؓ روایت حدیث میں حد درجہ محتاط تھے کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ ایک حدیث سے واقف تھے لیکن اس کی روایت سے اس لئے گریز کیا کہ کہیں لوگ اس میں کمی بیشی نہ

کردیں۔ جب کبھی کوئی شخص آپ کے سامنے آکے آنحضرتؐ کا کوئی قول پیش کرتا تھا تو آپ اس وقت تک نہ قبول کرتے تھے جب تک ایک دوسرا راوی بھی بعینہٖ وہی الفاظ نہ بیان کرتا ہو۔ راوی اولی مجبور ہوتا تھا کہ اپنی روائت کی صحت کے لئے ایک دوسرے شخص کو بھی پیش کرے۔

کبھی کبھار ایسا ہوا کہ ایک شخص ایک حدیث لے کے آیا اور دوسرا راوی نہ پیش کرسکا تو آپ نے ایسے راوی کو ضرب سے نوازا۔

یعنی الٹے اس روائت پر اس کی لے دے کی۔ آپ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ بکثرت آنحضرتؐ سے اقوال اور احادیث منسوب کرتے رہیں۔ بکثرت روایات بیان کرنے والوں کو آپ نے دھمکی بھی دی کہ اگر وہ ایسا کرتے رہیں گے تو ان پر کوڑے پڑیں گے اور آپ انہیں ان کے وطن واپس کردیں گے۔

چنانچہ ابوھریرہؓ نے حضرت عمرؓ کے انتقال تک پھر کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ البتہ ان کی وفات کے بعد یہ سلسلہ پھر شروع کردیا۔

حضرت عمرؓ پہلے شخص ہیں جس نے ہاتھ میں دُرّہ (کوڑا) تھام لیا اور بڑے اور چھوٹے کی تمیز کئے بغیر ان تمام لوگوں کو کوڑے لگانے شروع کئے جو ذرا بھی راہ اعتدال سے جو اسلام کی صحیح راہ ہے تجاوز کرتے تھے۔ ایک دن جس وقت کہ آپ مسلمانوں کو مال غنیمت تقسیم کرنے کے لئے تشریف فرمائے تھے آپ نے خود دولتِ کسریٰ و جم کے فاتح اعظم سعد بن ابی وقاصؓ کو برسرعام کوڑے مارے۔

ہوا یہ تھا کہ (اپنا حصہ لینے کے لئے) حضرت سعدؓ لوگوں کے ہجوم سے گزرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے قریب آگئے تھے۔ فاروقِ عادل نے اس موقع پر انہیں للکارا تھا اور کوڑے مارتے ہوئے یہ کہا تھا۔

"کہ تم روئے ارض پر اقتدار خداوندی کے مظہر سے خائف نہ ہوئے تو میں نے چاہا کہ تم پر یہ بات روشن کردوں کہ اقتدار خداوندی کا مظہر تمہاری بھی پرواہ نہیں کرنے کا"

آپ ہاتھ میں دُرّہ (کوڑا) لے کر مدینہ کے بازاروں میں نکل جاتے تھے تاکہ لین دین کا بازار

دیانت اور خوش معاملگی سے گرم پائیں۔
ذرا آپ نے کسی کو بدمعاملگی کرتے دیکھا آپ نے فوراً برسر بازار درّے سے اس کی خبر لی۔
ایک مرتبہ آپ نے ایک شخص کو لوگوں کا راستہ روکے کھڑا پایا آپ نے اسے ایک درّہ رسید کیا اور کہا:۔
"راستے سے ہٹ جاؤ۔"
کچھ عرصہ کے بعد جب حج کا زمانہ قریب آیا تو آپ کی اسی شخص سے ملاقات ہوئی آپ نے اس سے پوچھا کیا تمہارا ارادہ حج کا ہے۔ اس آدمی نے کہا:۔
"امیرالمومنین! ہاں میں حج کرنا چاہتا ہوں۔"
اس پر حضرت عمرؓ نے اس شخص کو حج کے مصارف عطا فرمائے اور سوال کیا:۔
"جانتے ہو یہ میں نے تمہیں کیوں دیا؟"
یہ دراصل اس کوڑے کھانے کی پاداش میں ہے جو میں نے تمہیں ایک دن ایک راستے میں مارا تھا۔ اس شخص نے جواب دیا۔ امیرالمومنین یہ تو آپ کے کہنے سے مجھے یاد آیا ورنہ میں تو بالکل بھول ہی چکا تھا۔
حضرت عمرؓ کا ارادہ ہوا تھا کہ احادیث کو کتابی شکل دے دیں لیکن ایک مہینے تک استخارہ کرتے رہنے کے بعد آپ اس ارادے سے باز آ گئے اور فرمایا:
"مجھے ایک گروہ یاد آ گیا جس نے ایک کتاب تو مرتب کر لی تھی لیکن اس کے بعد وہ اللہ کی کتاب کو بھول گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک خاص نقطۂ نگاہ سے حضرت عمرؓ کو روائت حدیث میں تردد تھا۔ آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ دین کا معاملہ بداحتیاطی کی نذر ہو جائے اور اس میں ایسی چیزیں آ جائیں جو مشکوک قرار دی جائیں۔



باب ۱۸

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دیانتداری

اور

اپنے عمّال سے سخت گیری

اپنی زندگی کی جزئیات اور تفصیلات دونوں کی رُو سے حضرت عمرؓ کی خلافت اور سلطنت وحکومت کا مدار تمام تر دین پر تھا ۔حضرت عمرؓ کے بعد مسلمانوں میں پھر کوئی ایسا خلیفہ یا سلطان نہ اٹھا جو اپنی زندگی کی ہر آن میں اللہ کو یاد رکھے۔حضرت عمرؓ ہر بات میں اللہ کی رضا ڈھونڈھتے تھے اور حتی الوسع اس کے غضب سے دُور رہتے تھے میرے خیال میں حضرت عمرؓ کی زندگی میں ایک ساعت بھی ایسی نہیں گزری جس میں آپ نے اپنے اعمال و اقوال کی اساس اللہ کے خوف کو نہ بنایا ہو ۔ اور محض آپ کی خلافت ہی دین کی بُنیاد پر نہ تھی خود آپ کی نجی زندگی بھی خوفِ الٰہی کے احساس شدید کی مظہر تھی۔

ایک بار کسی نے آپ سے اس بات کی سفارش کی کہ کھانے پہننے کے معاملہ میں آپ اپنے ساتھ تھوڑے سے نرم ہو جائیں ، اس پر آپ نے قرآن کریم کی ایک آیت دہرائی تھی جس کا مفہوم یہ ہے :۔

" تم لوگوں نے دنیاوی نعمتوں میں مبتلا ہو کے اپنی تمام کی تمام نیکیاں زائل کر دیں آج تمہیں اس تغافل کا ثمرہ مل رہا ہے اور یہ عذاب اور یہ عتاب جو آج تم پر مسلط

ہو رہے ہیں یہ بھی تمہارے فسق و گناہ اور کبر و نخوت اور خدا کو بھول جانے کا عوض ہیں۔"

انہیں وعیدوں کے خوف سے حضرت عمرؓ حد درجہ عسرت میں زندگی کاٹا کرتے تھے۔ اور کچھ یہ بھی نہیں کہ آپ غریب رہے ہوں یا امت نے آپ کو حکومت کے خزانے سے بقدر ضرورت رقم لے لینے کی اجازت نہ دے دی ہو۔

حضرت عمرؓ نے اپنی ذات پر ایثار کرتے ہوئے آرام دہ زندگی کا تصور دماغ سے نکال دیا تھا۔ اور اس کا اصل مقصد اپنے کو محض لذّتوں سے محروم ہی کرنا نہ تھا اصل مدعا یہ تھا کہ اس نفس کشی اور تجرید و زہد کا ثمر انہیں آخرت میں مل جائے۔

کسی صوبہ کا گورنر مقرر کرتے وقت آپ مسلمانوں کی مصلحت سے بھی پہلے اللہ کی رضا اور مرضی کو سامنے رکھتے تھے۔

آپ صوبوں کے والی، ایسے لوگوں کو بناتے تھے، جن میں قوت اور جوشِ عمل اور اعلیٰ درجہ کی کارکردگی کے صفات پائے جائیں۔ آپ اس کی پروا بالکل نہ کرتے تھے کہ یہ لوگ شروع کے اسلام لائے ہوئے ہیں یا بعد کے۔ عموماً آپ اصحاب نبیؐ میں ممتاز لوگوں کو اس سلسلہ میں نظر انداز کرتے تھے اور جب اس بارے میں آپ سے کہا گیا تو فرمایا:

"میں نہیں چاہتا اصحاب نبیؐ مناصب پا کے ملوّث ہو جائیں اور خراب ہو جائیں اور یوں اپنی رفعت و منزلت سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔"

اور یہ بات محض برائے بیت نہ کہی گئی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس بات کا ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں آنحضرتؐ کے برگزیدہ اصحاب کسی آزمائش میں نہ مبتلا ہو جائیں۔ یا خود عوام کو آزمائش میں نہ مبتلا کر دیں۔ اسی باعث آپ ان بزرگوں کو ولایتیں نہ سونپتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت سعدؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کو جنہیں علی الترتیب ایران اور شام کی مہمات جنگی کی قیادتیں عطا ہوئی تھیں، مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

حد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ یہ تک پسند نہ کرتے تھے کہ یہ بزرگ مدینہ سے باہر نکلیں اور یہ محض اس لئے کہ آپ کو یہ خوف تھا کہ کہیں ان کی ذات کو کسی فتنہ کا مرکز نہ بنا دیا جائے۔ خود اہل قریش کے لئے حضرت عمرؓ کی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنی جگہ پر جمے رہیں اور دنیاوی کشائشوں

سے ملوث نہ ہونے پائیں۔

حضرت عمرؓ نے ایک بار تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا :۔

" اگر اہل قریش اللہ کے مال کو اپنی دولت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو ان کو یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ ابن خطاب کے جیتے جی وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ یاد رکھو میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ مدینہ کے چٹیل میدان میں ان کی کمر کو تھامے کھڑا رہوں تاکہ یہ آگ میں نہ گرنے پائیں ۔"

بعض اکابر صحابہ حضرت عمرؓ سے جہاد میں شرکت کی اجازت مانگا کرتے تھے۔ آپ ایسے حضرات کو یہ کہہ کر منع فرما دیا کرتے تھے کہ آنحضرتؐ کے ساتھ شریک جہاد ہو چکنے کے بعد انہیں جزا مل ہی جائے گی۔ اور اب یہ کام دوسروں کا ہے کہ جہاد میں شریک ہوں۔ ایک دفعہ آپ نے عمار ابن یاسرؓ کو کوفہ کی ولایت عطا کی۔

اہلِ کوفہ نے حسب عادت اپنے والی کی حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ دراصل ان کوفیوں نے اپنے والیوں کی شکایت کر کے حضرت عمرؓ کو پریشان سا کر رکھا تھا، لیکن بہرحال حضرت عمرؓ نے اس بار بھی ان کی شکایت سُنی۔

شکایت یہ تھی کہ گورنر عمار بن یاسرؓ عواقب سے مطلقاً بے خبر رہتے ہیں، حضرت عمرؓ نے عمار بن یاسرؓ سے پوچھا کہ کیا واقعی ایسا ہی ہے۔ اور جب ابن یاسر کوئی مناسب جواب نہ دے سکے تو انہیں معزول کر دیا گیا۔ بلکہ کچھ دنوں بعد حضرت عمرؓ نے عمارؓ سے پوچھا بھی :۔

" تم کو یہ بات ناگوار تو نہیں ہوئی کہ میں نے تمہیں معزول کیا۔"

عمارؓ نے جواب :۔

" اب جبکہ امیرالمؤمنین نے یہ بات پوچھ ہی لی تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ مجھے دونوں میں سے کوئی بات پسند نہ آئی تھی، نہ والی بنایا جانا، اور نہ ولایت سے محروم کیا جانا۔"

حضرت عمرؓ نے ذیل کی آیت پڑھتے ہوئے کہا کہ دراصل میں چاہتا تھا کہ تم کو گورنر بنا کے اللہ کا یہ قول پایہ تحقیق تک پہنچاؤں :۔

(وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ)

"ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ ان لوگوں کو جنھیں اس جہاں میں بے یار و مددگار اور مسکین سمجھ لیا گیا تھا دُنیا کی امامت اور اپنی وراثت بخشیں ۔"

یہ اللہ کو یاد کرتے رہنے، اس کے عذاب سے خائف رہنے اور امت کی فلاح کی مستقل فکر کرتے رہنے کی بنا پر ہی تو تھا کہ حضرت عمرؓ اپنے والیوں کی بے حد کڑی نگرانی کرتے تھے۔ ادھر ذرا سی بات آپ تک پہنچی اور ادھر آپ بدظن ہو گئے۔ یا تو، ایسے مواقع پر آپ فوراً تحقیقات کرواتے تھے یا کبھی کبھی آپ (اتنی سی بات پر) والیوں کو معزول تک کر دیتے تھے۔

جس بات کا آپ کو اکثر و بیشتر خدشہ لگا رہتا تھا وہ یہ تھی کہ کہیں آپ کے مقرر کردہ والی، لوگوں پر ظلم نہ کریں اور لوگوں میں اتنی استطاعت نہ رہے کہ وہ ان والیوں کی آپ سے آ کے شکایت کریں۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ حضرت عمرؓ کے نقطۂ نگاہ سے والی کے ظالم ہونے کا مطلب یہ تھا کہ خود مومنوں کا امیر اور خلیفہ بھی ظالم ہے۔

آپ اکثر اپنی رعیت سے، جس سے آپ کا مدینہ یا حج کے موقعہ پر تقابل ہوتا تھا کہتے رہتے تھے کہ میں ان والیوں کو محض تم پر ظلم کرنے یا تمہاری کھالیں ادھیڑنے کے لئے نہیں بھیجا۔ میں نے انھیں اس لئے بھیجا ہے کہ یہ تم کو روح اسلام سے آشنا کریں اور تمہارے حصّے کا مال غنیمت تم میں پورا پورا بانٹ دیں۔ آپ غیر مسلموں کے حقوق کے بارے میں اس درجہ سخت تھے کہ یہ معلوم ہو جانے پر کہ کسی والی نے ان سے پوری پوری رعایت نہیں کی اس کو کڑی سے کڑی سزا دینے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔

اپنی امت کی دولت کو کسی حال رائگاں نہیں جانے دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ کا پہلا اقدام تو یہ تھا کہ:۔

"خلیفہ اور امیر المومنین ہونے کے باوجود آپ سوائے قوت لایموت کے، جس سے آپ اور آپ کے اہل بیت جینے کی حد تک جی سکیں، بیت المال سے کچھ اور نہ لیتے تھے۔ ایک جوڑا کپڑا جاڑوں کے لئے اور ایک ہی جوڑا گرمی کے لئے لے لیتے تھے۔"

اسی طرح آپ اپنے عمالِ حکومت کی اتنی شدید اور کڑی نگرانی کرتے تھے کہ وہ بیت المال سے کم سے کم لینے پائیں۔ اور ان کے اسراف سے مسلمانوں کا خزانہ محفوظ و مصئون رہے۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ سے کیا سلوک کیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے ایک قاعدہ مقرر کر دیا تھا، وہ یہ تھا:۔

آپ جب کبھی کسی کو کسی علاقہ کا گورنر یا حاکم بناتے تھے پہلے اس کے مالی حالات کا مکمل جائزہ لیتے تھے اور اس کے مملوکہ سامان اور جائداد کی ایک فہرست بنا لیتے تھے پھر اس کو ولایت پر روانہ کر دیتے تھے۔

ولایت سے لوٹنے یا معزول ہونے پر والی سے سخت اور شدید قسم کا محاسبہ ہوتا تھا۔ اگر اس کے مال میں کچھ غیر قابلِ قبول اضافہ پایا جاتا تھا تو اضافی مال اس سے چھین لیا جاتا تھا۔

سعد بن ابی وقاصؓ جب کوفہ کی ولایت سے معزول ہوئے تھے تو آپ کے مال کے ساتھ یہی ہوا تھا۔

ایسا ہی بحرین کی گورنری سے ابو ہریرہؓ کے معزول ہونے کے بعد ان کی دولت کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا تھا۔

ان دونوں کے علاوہ بعض دوسرے عمال کے ساتھ، جن کا رویہ دولت کے بارے میں آپ کو کھٹکا تھا۔ یہی برتاؤ ہوا۔ یعنی ان کا مال ضبط کر لیا گیا تھا۔

حضرت عمرؓ کی عدل گستری تمام تر آپ کے جذبۂ خوفِ الٰہی کا نتیجہ تھی۔ آپ سے ہر حال میں انصاف و عدل اس لئے سرزد ہوتے تھے کہ آپ اپنے کو اللہ کے حضور میں موجود تصور کرتے تھے اور یہ نہیں پسند فرماتے تھے کہ:۔

"کوئی ایسی بات کریں جس کے لئے آپ کو
اللہ کے رو برو جواب ندامت
دینا پڑے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ محض عدل گستری ہی کا ایک نمونۂ کامل نہ تھے ۔ آپ تمام امور میں ، چھوٹے اور بڑے ، سب میں ، رعایتِ احکامِ دینی کا بھی ایک نمونۂ اتم تھے ۔

یہی آپ کی ہیبت اور صولت کا راز تھا ۔ یہ عالم تھا آپ کی ہیبت کا کہ آپ کے بعد یہ تک کہا گیا کہ :-

عمرؓ کا دُرّہ تمہاری تلواروں سے
زیادہ ہیبت ناک تھا ۔"

باب ۱۹

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا آخری حج

۲۳ھ میں حضرت عمرؓ نے حسب معمول حج کیا۔ خلافت کے سال اوّل کو چھوڑ کے حضرت عمرؓ نے ہر سال حج ادا کیا۔ کیونکہ پہلے سالِ خلافت میں آپ نے حج کی امارت حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو عطا کر دی تھی۔ بہر حال اس سال حج میں ازواجِ نبیؐ بھی شریک تھیں۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حج سے فارغ ہو چکنے کے بعد حضرت عمرؓ جب واپس آ رہے تھے تو آپ نے مکّہ کے باہر کسی مقام پر پہلے تو کچھ کنکریاں جمع کیں پھر اپنے کو ان پر ڈال دیا اور ان پتھروں پر اپنا سر رکھا اور کنکریوں کو اپنے دونوں پاؤں کے درمیان کر لیا اور اس کے بعد فرمایا :-

"اے خدا میری عمر اب کافی ہو چکی اور میری ہڈیاں چور ہو چکی ہیں اور اب مجھے اپنی رعیّت سے انتشار کا خوف لاحق ہو رہا ہے اس لئے کیا اچھا ہو کہ مجھے اپنی طرف بُلا لے اور میں تیرے دربار میں آؤں تو سرخرو آؤں۔"

مدینہ پہنچنے پر ایک دن آپ کی ملاقات ایک عجمی یعنی ایرانی غلام سے ہوئی جو مغیرہ بن شعبہؓ کے حصّہ میں آیا تھا۔ اس غلام کا نام فیروز اور اس کی کنیت ابو لؤلؤۃ تھی۔ یہ شخص نہاوند سے قید ہو کر آیا تھا۔ یہ غلام حضرت عمرؓ سے کہتا ہے :-

"میرے مالک مغیرہؓ نے میرے اوپر اتنی رقم عائد کر رکھی ہے جسے میں

نہیں دے سکتا ۔"

حضرت عمرؓ اس سے پوچھتے ہیں ؟ کتنی رقم تم پر عائد ہوئی ہے ۔ غلام کہتا ہے :۔

" چار درہم روزانہ ۔"

حضرت عمرؓ نے سوال کیا :۔ " کرتے کیا ہو تم ؟"

غلام نے بتایا :۔ " میں بڑھئی کا کام کرتا ہوں، لوہاری کا کام کرتا ہوں، اور نقاش (پینٹر) ہوں ۔"

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فیصلہ کیا اور کہا :۔ " تمہارا محصول زیادہ نہیں ہے "

غلام حالت غضب میں وہاں سے چلا گیا ۔ ایک بار پھر حضرت عمرؓ کی، جس وقت کہ آپ کے چند رفقاء نامدار آپ کے ساتھ تھے، اسی شخص سے ملاقات ہوئی ۔ امیر المومنین نے غلام کو بلایا اور بلا کے کہا :۔

" میں نے سنا ہے تم چکیاں بھی بنا لیتے ہو اگر ایسا ہے تو ایک ہمارے لیئے بھی بنا دو ۔"

غلام نے کہا :۔ " میں تمہارے لئے ایک ایسی چکی بناؤں گا جس کا ذکر (مرکز میں تو خیر ہوگا ہی) صوبوں تک میں ہوگا ۔ جب یہ غلام چلا گیا تو حضرت عمرؓ نے حاضرین مجلس سے فرمایا:۔ اس لڑکے نے مجھے دھمکی دی ہے " ممکن ہے حاضرین مجلس نے خود ہی حضرت عمرؓ سے اسی رائے کا اظہار کیا ہو ۔

ایک دن صبح کے وقت فجر کی اذان کے موقع پر حضرت عمرؓ باہر آئے ۔ حضرت عمرؓ کی عادت تھی کہ (امامت) نماز شروع کرنے سے پہلے لوگوں کو حکم دیتے تھے کہ صفیں کج نہ رہنے دیں ۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد آپ اس صف کو ملاحظہ فرما رہے تھے جو بالکل آپ کے قریب تھی ۔ جہاں آپ نے کسی شخص کو خطِ صف سے ذرا آگے پایا اسے (اس عدم احتیاط وانضباط پر) اپنے درہ سے چھو دیا جو اسے اشارہ ہوتا تھا اس بات کا کہ وہ شخص اپنی جگہ پر واپس جائے ۔ یہ بھی کر چکنے کے بعد آپ امامت کے لیے آگے بڑھے تو ابولؤلؤ نے جو مسجد کے کسی گوشہ میں چھپا بیٹھا تھا آپ پر خنجر سے وار کر دیا ۔

راویوں نے بیان کیا ہے کہ جس وقت حضرت عمرؓ نے زخم کی جراحت محسوس کی تو ہاتھ چھوڑ دیئے اور پکار کر کہا :۔ "پکڑ لو اس کتے کو جس نے مجھے مار دیا۔" یہ کہنے کے بعد حضرت عمرؓ زمین پر گر پڑے اور آپ کے بدن سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ لوگوں میں کہرام اور تلاطم برپا ہو گیا۔ غلام پے در پے ان تمام لوگوں کو زخمی کرتا جاتا تھا جو اس کے قریب جاتے تھے۔ حضرت عمر کے علاوہ اس شخص نے بارہ آدمی زخمی کر دیئے تھے۔ آخر میں کسی نے اس خبیث پر ایک کپڑا ڈال کے اسے پکڑ لیا اور جب وقت غلام کو یقین ہو گیا کہ وہ پکڑا گیا تو اس نے خود اپنے ہی خنجر سے اپنا کام تمام کر ڈالا!

اب بعض لوگ آگے بڑھے اور حضرت عمرؓ کو اٹھا کے ان کے مکان لائے۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ یہ کہتے رہے کہ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا۔ یعنی اللہ کے احکامات معین اوقات میں نافذ ہوتے ہیں۔

بعض راویوں کے بیان یہ ہیں :۔ " زخمی ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لیا اور انھیں امامت کے لئے آگے بڑھا دیا۔

ایک اور راوی لکھتا ہے کہ جب وقت لوگوں میں تلاطم اور ہیجان پیدا ہوا تو دفعتاً ایک شخص بول اٹھا :۔ " اللہ کے بندو نماز سے غافل مت ہونا، سورج طلوع ہی ہونے والا ہے۔ چنانچہ اب عبدالرحمٰن بن عوفؓ آگے بڑھ چکے تھے۔ آپ نے سب سے چھوٹی دو سورتیں یعنی سورۃ العصر اور سورۃ الکوثر پڑھ کے نماز پڑھائی۔

راویوں نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ جب غشی دیر تک طاری رہی تو کسی نے کہا کہ نماز سے ڈراؤ، انھیں، چنانچہ لوگوں نے کہا :۔

امیر المومنین، نماز، نماز، اس صدا پر دفعتاً آپ ہوش میں آگئے۔ اور فرمایا۔ ہاں نماز، اللہ اکبر، اسلام سے اس شخص کا کوئی تعلق نہیں جو تارک صلوٰۃ ہے، اس کے بعد آپ نے وضو کا پانی منگوایا۔ وضو کیا اور نماز پڑھی اور عالم یہ تھا کہ آپ کا زخم خونچکاں اور خون فشاں تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا :۔

میرے لئے طبیب بلواؤ۔ طبیب جب آیا تو اس نے پوچھا کہ آپ کیا پینا پسند

کریں گے حضرت عمرؓ نے جواب دیا: " نبیذ " یعنی کھجور کا ست جو ہر قسم کے نشہ سے پاک ہو۔" طبیب نے نبیذ پلوایا لیکن یہ عرق آپ کے زخم سے بہہ نکلا اور اسے آپ کے جسم نے نہیں قبول کیا۔ اب لوگ آپ کے بارے میں قطعاً شک میں مبتلا ہو گئے۔ کسی نے کہا یہ خون کی پیپ ہے، امیرالمومنین کو دودھ دوا استعمال کرنے کو' مگر دودھ بھی باہر آ گیا اور رنگ بالکل نہ تبدیل ہوا یہ دیکھ کے طبیب نے گویا اعلان کیا کہ امیرالمومنین شاید شام تک نہ بچ سکیں۔

راویوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ وہ ذرا تحقیق کریں کہ قاتل کون ہے۔ ابن عباسؓ نے لوگوں میں گشت لگایا اور جب لوٹ کے آئے تو فرمایا:۔

آپ کا قاتل مغیرہ بن شعبہ کا غلام (ابولؤلؤۃ) ہے یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کسی، اللہ کو سجدہ کرنے والے نے جو اپنے اس سجدے سے اللہ کے سامنے اس معاملہ میں مجھ سے قتیل و قال کر سکتا تھا، یعنی کسی مسلمان نے قتل نہیں کیا۔ اور ایک غیر مسلم سے یہ مکروہ فعل سرزد ہوا۔

اب ابن عباسؓ کو امیرالمومنین نے حکم دیا کہ وہ جا کے لوگوں سے یہ پوچھ آئیں کہ آیا ان کے ایماء اور ان کی سازش و صلاح سے یہ قتل ہوا ہے؟ لیکن ابن عباسؓ نے لوٹ کر یہ خبر سنادی:۔ " لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس قتل کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے اور ہماری خواہش تو یہ ہے کہ ہماری عمروں میں سے امیرالمومنین کی عمر میں اضافہ کر دیا جائے۔

اب حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے پاس جا کے کہیں کہ عمرؓ کی خواہش ہے کہ انہیں ان کے رفقاء نامدار آنحضرتؐ و صدیق اکبرؓ کے جوار میں دفن ہونے کی اجازت دے دی جائے۔

عبداللہ ابن عمرؓ جب حضرت عائشہؓ کے یہاں پہنچے تو انہیں بیٹھے روتے دیکھا۔ حضرت عمرؓ کا پیغام سننے کے بعد حضرت عائشہؓ نے فرمایا:۔

"بخدا یہ جگہ میں نے اپنے لئے منتخب کر لی تھی لیکن آج کے دن میں اسے قربان کئے دے رہی ہوں۔"

عبداللہ بن عمرؓ نے جب لوٹ کے آ کے یہ اطلاع دی کہ حضرت عائشہؓ نے آپ کی مرضی کے مطابق آپ کو مطلوبہ اجازت اور رخصت دے دی ہے تو آپ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور کہا کہ آپ کے لئے سب سے اہم چیز یہی تھی۔

اس مہم کے سر ہونے کے بعد لوگوں نے آپ سے اپنا جانشین مقرر کرنے کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا :-

"آنحضرتؐ نے کسی کو بھی اپنا جانشین مقرر نہ فرمایا تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے مجھے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ اب ہر صورت میں جانشین مقرر کرنے یا نہ کرنے دونوں میں میرے لئے یہ احساس تکلیف دہ ہے کہ کہیں میں راہ صواب سے ہٹ تو نہیں رہا۔"

اس تذبذب کے اظہار کے بعد حضرت عمرؓ نے خلافت کے معاملہ کو چھ افراد کی ایک کونسل یعنی مجلس شوریٰ کے سپرد کر دیا۔ یہ چھ افراد یہ تھے:-

حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمانؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ، زبیر بن العوامؓ اور حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ۔ آپ نے ان حضرات کو اپنے پاس بلا بھیجا اور پھر انہیں حکم دیا کہ یہ اکٹھے ہوں اور اپنے ہی میں ایک شخص کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ ساتھ ہی آپ نے اس بات کا حکم دیا کہ چھ افراد کی اس مجلس میں عبداللہ بن عمرؓ اور سعید بن زید ابن عمرو (آپ کے چچیرے بھائی) بھی شریک ہوں۔ لیکن یہ بات ظاہر کر دی کہ مؤخر الذکر دونوں حضرات کو خلافت سے کوئی سروکار نہ ہو گا۔

اب حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ سے مخاطب ہوئے :-

"علیؓ سب جانتے ہیں کہ تم رسول اللہؐ کے داماد اور عزیز ہو اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے عالم اور فقیہہ بنایا ہے۔ اب اگر خلافت تم کو سونپ دی جائے تو اللہ سے ڈرتے رہنا۔"

حضرت عثمانؓ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا :-

"امت کو تمہاری پختہ سالی، رسالت مآبؐ کی دامادی اور تمہارے مجد و شرف کا احساس

ہے۔ تم اگر خلیفہ منتخب ہو جاؤ تو اللہ سے ڈرتے رہنا اور کہیں بنی ابی معیط کو لوگوں کی گردنوں پر سوار مت کر دینا۔"

اس کے بعد حکم ہوا ابوطلحہؓ الانصاری بلائے جائیں۔ ابوطلحہؓ آئے تو انہیں یہ فرمان ملا کہ پچاس عدد انصار کے آدمیوں کو ساتھ لیں اور ان چھ افراد کو جن کے نام اوپر لکھے جا چکے ہیں کسی ایک مقام پر اکٹھا کریں اور تین دن کی مقررہ میعاد تک یعنی جب تک یہ لوگ آپس میں کسی کو خلیفہ نہ چن لیں، دارالشوریٰ کے دروازہ پر دستک دیں اور وہاں تعینات رہیں۔ بعض راویوں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ:۔

" ابوطلحہؓ الانصاری کو یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ اگر تین دن میں یہ حضرات کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکیں تو ان کی گردنیں ماری جائیں!"

میرے نزدیک یہ صحیح نہیں حضرت عمرؓ جو مسلمانوں کے خون کا اتنا احترام کرتے تھے بھلا کیسے اس بات پر آمادہ ہو سکتے تھے کہ مہاجرین سابقین میں سے چھ ممتاز افراد کو، اور وہ بھی ایسے چھ ممتاز افراد کو جن کو بہ حالت حیات آپؐ نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی اور جن سے آپ آخر وقت تک خوش اور رضامند رہے، قتل کرا دیں۔

کسی اور مقام پر میں نے شوریٰ (کونسل) سے متعلق تفصیلات بیان کی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ ان تین دنوں تک جس میں چھ نامزد افراد خلیفہ کے انتخاب کے لئے ضروری مشورہ کریں گے۔ صہیب لوگوں کو نماز پڑھائیں گے۔ اس کے بعد آپ نے عبداللہ بن عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ اس قرضہ کا حساب لگائیں جو حضرت عمرؓ نے بیت المال سے لیا تھا۔ حساب لگانے پر یہ قرض چھیاسی ہزار درہم نکلا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

"جب میں مر جاؤں تو میری آل اولاد کو چاہیئے کہ اس قرضہ کو چکا دے۔ اگر پھر بھی قرض باقی رہ جائے تو میرے قبیلہ بنی عدی سے رجوع کیا جائے۔ بنی عدی والے بھی پوری رقم نہ چکا سکیں تو اہل قریش سے رجوع کیا جائے اور جو مدد یہ کریں اسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ وہ اس تمام رقم کی ضمانت لے لیں جو انہوں نے لے لی۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس قرضہ میں وہ تمام کی تمام رقوم شامل تھیں جو حضرت عمر رضہ نے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی گزر اوقات کے لئے یا تجارتی کاموں کے لئے بیت المال سے لی تھیں میرا خیال یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضہ نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا کہ وہ اس معاملہ میں حضرت ابوبکر رضہ کی، جنہوں نے بیت المال سے لی ہوئی تمام رقوم واپس کر دی تھیں۔ تقلید کرنی چاہتے تھے۔ حضرت عمر رضہ، یوں بھی فرمایا کرتے تھے :۔

"میری خواہش ہے کہ جب میں خلافت کا بار اپنے کاندھوں سے اتاروں تو خلافت کا مجھ پر اور میرا خلافت پر کچھ نہ ہو۔ آپ کا یہ مقولہ زخمی ہونے کے بعد آپ کی زبان سے اور بھی بار بار سنا گیا۔"

"ابن عمر رضہ نے یہ ساری رقم نئے امیرالمومنین کو اپنے مستدین اور متقی اور عدیم المثال والد کے مرنے کے ایک ہفتہ کے اندر اندر ادا کر دی۔"

امور امت سے فراغت کے بعد اب حضرت عمر رضہ پر صرف اس حساب کتاب کا خیال مسلط تھا جو آپ کو خدا تعالیٰ کو دینا تھا۔ آپ فرماتے تھے :۔

"اگر میرے پاس دنیا جہان کی تمام دولتیں اور ثروتیں ہوتیں تو میں ان کے معاوضہ میں اس دہشت اور سراسیمگی سے جو قبر میں برزخی زندگی کے آغاز میں طاری ہوگی اسے بخش دیتا ہے۔"

اس کے بعد از روئے روایت حضرت عمر رضہ نے اپنے بیٹے کو وصیت کی — یعنی اس وقت جب آپ نے موت کو بالکل ہی نزدیک پایا اور فرمایا وہ انہیں یوں اٹھائیں کہ گھٹنے ان کے پیٹ اور کمر کے نیچے رہیں اور پھر دائیں ہاتھ سے ان کی پیشانی اور سر کو سہارا دیں اور بائیں ہاتھ سے ٹھوڑی کو، اور پھر جب وہ دم توڑ دیں تو ان کی آنکھوں کو کھلا نہ رہنے دیں۔ حضرت عمر رضہ نے اپنے صاحبزادے کو یہ بھی ہدایت کی کہ ان کے کفن کا کوئی خاص اہتمام نہ کریں کیونکہ کفن میں اہتمام سے کوئی فرق نہیں پڑا کرتا۔ اگر کسی کے لئے آخرت میں اجر موجود ہے تو تجہیز و تکفین کا یہ اہتمام اس کے لئے زائد سی شے ہے اور اگر آخرت میں اس کے لئے کچھ درپیش ہے تو اس اہتمام سے سزا اور عتاب کی کارروائی رک نہ جائے گی

حضرت عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ انسان کے ساتھ صرف اس کے اعمال جاتے ہیں۔ آپ نے مشک و عنبر کے استعمال سے بھی روک دیا اور اس بات سے بھی کہ جنازہ میں کوئی عورت شریک ہو۔ یہ بھی ہدایت فرمائی کہ جب آپ جنازہ بردوش ہو جائیں تو تیز رفتاری کا ثبوت دیتے ہوئے آپ کو آپ کی قبر تک پہنچایا جائے۔ اس لیے کہ اگر قبر میں حضرت عمرؓ کے انتظار میں "خیر" ہے تو بہتر ہے جلد از جلد انھیں اس "خیر" تک پہنچا دیا جائے اور اگر "شر" ان کا منتظر ہے تو اچھا ہے لوگ اپنی گردنوں سے اس "مستحق شر" کو جلد از جلد اتار پھینکیں غرض ہر صورت میں مردے کو قبر تک جلد از جلد لے جانا چاہیئے۔

عبد اللہ بن عمرؓ کو ایک مزید ہدایت یہ ملی کہ چونکہ حضرت عائشہؓ کا مکان پہلے ہی تنگ اور چھوٹا تھا (اور اس میں پہلے ہی سے دو قبریں موجود تھیں) اس لئے ان کی قبر (حضرت عمرؓ کی قبر) کے لیے زیادہ زمین کو نہ کھودا جائے۔ اس لئے کہ یہاں بھی وہی معاملہ تھا یعنی اگر آپ اللہ کے یہاں مقرب اور ماجور ہونے والے ہوں گے تو یہ قبر وسیع ہو جائیگی وگرنہ ایسی اور اتنی تنگ کہ پسلیاں دب کے رہ جائیں گی۔

عالی قدر باپ نے بیٹے کو یہ بھی ہدایت کر دی کہ مرنے کے بعد انھیں ان صفات سے متصف نہ بنالیں جو ان میں نہیں ہیں اس لیے کہ ہر چیز کا علم اللہ کو بہتر ہے۔

راوی کا بیان ہے :۔ "اب لوگ وجہ اس زہرہ گداز حادثہ سے واقف ہو چلے تھے، جوق در جوق آنے لگ گئے اور حضرت عمرؓ کی ثناگستری اور مدح سرائی کرنے لگے"۔ لوگوں کا یہ ہجوم دیکھ کے حضرت عمرؓ بول اٹھے :۔

"بھائیو! کیا بات ہے؟ میری امارت اور خلافت پر رشک کرتے ہو؟ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں نے رسالت مآبؐ اور حضرت صدیق اکبرؓ دونوں کا ساتھ دیا ہے اور دونوں میرے رویہ سے خوش رہے اور آخر وقت تک خوش رہے ان ادوار میں میرا کام مکمل طور پر اطاعت کرنا تھا جو میں نے کی۔ (تو یہ بات البتہ قابل رشک ہو سکتی ہے نہ یہ خلافت و امارت) اور میں سوائے اس ذمہ داری کے منصب کے کبھی کسی چیز سے خائف نہیں ہوا کبھی کسی چیز سے نہیں ڈرا۔"

اس سال اپنے صوبوں اور شہروں میں لوٹنے سے پہلے پہلے حج کے موقع پر جو وفود آئے تھے وہ حضرت عمرؓ سے ملے تھے۔ عراق سے جو وفد آیا تھا اس نے حضرت عمرؓ سے گذارش کی کہ اسے وصیت فرمائیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا :-

"میں تم لوگوں کو وصیت کرتا ہوں کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور خوف کرو اور اس کے بعد یہ جو مہاجرین رہ گئے ہیں جنھوں نے رسول اعظمؐ کے ساتھ ہجرت کی تھی اور جن کی تعداد روز بروز اسی طرح کم ہوتی جائے گی جیسے تم لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی جارہی ہے ان کا بھی خوف آمیز احترام کرو۔

یعنی اپنے اعمال و کردار میں کوئی ایسی بات نہ آنے دو جسے وہ ناپسند کریں۔ اس کے بعد یہی روش آنحضرتؐ کے گرامی قدر انصارؓ سے اختیار کرو۔ یہ انصار وہ ہیں جنھوں نے اسلام کو ایک مسکن اور ایک پناہ گاہ دی تھی۔ عربوں کا جو اسلام کا اصل جوہر ہیں اور ذمیوں کا بھی پورا پورا لحاظ رکھنا۔" اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عراقیوں کو رخصت کر دیا۔

روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے محسوس کیا کہ آخری ساعت آن پہنچی تو آپ نے اپنے بیٹے سے جو سر مبارک اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھے، فرمایا کہ ان کو کنپٹی کے بل زمین پر لٹا دیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے تند لہجہ اختیار کرتے ہوئے اصرار کیا کہ انہیں زمین پر لٹا دیا جائے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے ایسا ہی کیا۔ اب فاروق اعظمؓ نے کہنا شروع کیا :- اے کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ اے کاش میں وجود پذیر ہی نہ ہوتا۔ کاش میں ایسی شے ہوتا جسے لوگ بھلا دیتے ہیں جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔" اس کے بعد آپ نے یہ کلمات کہنے شروع کر دیئے :- اللہ نے اگر مجھے نہ بخشا تو میری اور میری ماں کے لئے وبال ہی وبال ہے۔ یہ کہتے کہتے آپ کی طیب روح پرواز کر گئی۔

باب ۲۰

بے مثال زعیم کی موت
پر
امت کے تاثرات

حضرت عمرؓ کی وفات سے، ایک ایسا دور تابناک ختم ہو گیا، ایک ایسا عہد زریں گزر گیا، جس سے زیادہ تابناک اور زریں عہد، آنحضرت کی وفات سے قیامت تک، جب تک دنیا باقی ہے، پھر نہ آسکے گا مسلمانوں کی تاریخ میں کسی ایک ایسے خلیفہ یا بادشاہ کی مثال نہیں ملتی، اور نہ میرے خیال میں آئندہ اس کا امکان ہے، جو دور دور بھی عمرؓ سے مشابہت رکھتا ہو۔ زہد اور نیکی اور تقوٰی کی رو سے حضرت عمرؓ کو ان تمام خلفاء اور سلاطین اسلام پر فوقیت مطلق حاصل ہے جنہوں نے اسلام کی تاریخ بنائی ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ سے بڑھ کر اللہ کے احکامات اور فرامین کے نفاذ اور اجراء میں کسی ایک شخص نے بھی اتنی جرأت کا ثبوت نہ دیا تھا۔ یہ انتظامی کمال نہ دکھایا تھا۔

اور یہ تو واقعہ ہے کہ اپنی گذر اوقات کے لئے حضرت عمرؓ دوران خلافت بھی تجارت فرماتے تھے لیکن ہاں اس کاروبار کا مقصد کچھ یہ نہ تھا کہ آپ دولت و ثروت سے اپنی تجوریاں بھر لیں۔ آپ تو بس اتنا چاہتے تھے کہ اپنے اہل بیت یعنی بیویوں اور بیٹیوں کا تکفل فرما سکیں۔ اس کاروبار سے انھیں کوئی خاص فائدہ بھی حاصل نہ ہوتا تھا۔ اس

کے باوجود آخر میں حضرت عمرؓ نے وہ تمام رقم جو آپ نے مدد معاش کے لئے لی تھی۔ سب کی سب بیت المال یعنی حکومت کے خزانہ کو لوٹا دی تھی۔

چنانچہ حضرت عمرؓ جب اس دنیا سے اٹھے ہیں تو حال یہ تھا کہ اللہ کی زمین پر رہنے والا ایک متنفس بھی آپ کا قرض خواہ یا آپ کا زخم خوردہ نہ تھا۔ آپ نے وصیت، اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کے حق میں کی۔ اسی وصیت کی ایک دفعہ کی رو سے، حفصہؓ کے بعد یہ ترکہ آپ کے (وفات حفصہؓ کے موقع پر) سب سے بڑے لڑکے کو ملنا تھا۔

اس کے علاوہ اسلامی تاریخ کے کسی خلیفہ یا سلطان کے عہد میں ایسی محیر العقول فتوحات بھی نہیں ہوئیں۔ جیسی جناب عمرؓ کے دور میں ہوئی تھیں۔ آپ نے پچھلے ابواب میں دیکھ ہی لیا کہ حضرت عمرؓ نے ایرانی حکومت کی قلمرو کو مطلق طور پر اسلام کے سرنگوں کر دیا۔ اس کے بعد شام، جزیرہ، مصر اور برقہ کو بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد سوائے اس کے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں افریقیہ فتح ہوا اور اسی کے سلسلہ میں مسلمان بحر ظلمات تک پہنچے، یا پھر بنو امیہ نے موجودہ اسپین (اس دور کا اندلس) فتح کیا۔ کسی دوسرے اسلامی فرمانروا میں یہ قوت اور تدبر نہ آسکے کہ اسلامی قلمرو میں اضافہ کریں۔

حضرت عمرؓ کے بعد کوئی اسلامی حاکم ایسا نہ آیا جس نے بیت المال کو مطلقاً امت کے افراد پر وقف کر دیا ہو۔ جس سے ایک طرف لڑنے والی اسلامی فوج کے مصارف ادا ہوں۔ دوسری طرف ناداروں کی مدد ہو اور وہ قوم کے ان غریب مردوں، عورتوں اور بچوں پر تقسیم ہو جائے۔ جن کے لئے یہ بھی ممکن ہو گیا تھا کہ بغیر کسی دقت کے اور بغیر (حکومت کے عمال کے جور و ستم کا نشانہ بنے) انہیں ان کے سہارے مل جایا کرتے تھے اس میں دور و نزدیک کے لوگوں کی تخصیص نہ تھی۔ حضرت عمرؓ بنفس نفیس مدینہ کے قریب میں رہنے والے بادیہ نشینوں کے لئے اشیاء خوردنی وغیرہ بھی اٹھا کے لے جاتے تھے۔ قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ کا عجب حال ہوتا تھا۔ آپ کھانے کا سامان اپنی پشت پر لادے ہوئے تھے اور مدینہ کے نواح میں آکے بس جانے والے لوگوں کے

لیئے یہ سامان لے کے دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ کبھی کبھار تو آپ کو یہ کھانا خود ہی پکانا بھی پڑتا تھا۔ اسلامی تاریخ ایک بھی ایسی مثال پیش کرنے سے مطلقاً قاصر ہے کہ حاکم وقت نے غیر مسلموں سے اس درجہ محبت اور مہربانی کا برتاؤ کیا ہو۔ بالکل اسی طرح اسلامی تاریخ میں ایک آپ ہی کی ایسی مثال ہے جس نے دین اسلام کے لائے ہوئے نظام کو اپنے پاس کی تفصیلات کے ساتھ نافذ کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ مسلمانوں کو عارفانہ اور متقیانہ مذاق بخشا اور ان کی فلاح و صلاح کے خیال سے اور ان کو آخرت میں ہر قسم کے مواخذہ سے بچانے کے لئے کبھی معلم کی قبا اوڑھی، کبھی موءدب اور مربی کی حضرت عمرؓ نے یہ سب کچھ کیا۔ اور بہت کچھ اور کتنا کچھ اور نتیجہ کیا تھا آپ نے وہ کچھ حاصل کر لیا جو اسلامی اور غیر اسلامی تاریخ اسلامی تاریخ عالم میں کسی کے عہد میں بھی حاصل نہ ہوا تھا۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

آج بھی ہم کسی ایسے ملک سے واقف نہیں جہاں حکومت لوگوں کو غیر مشروط طور پر یعنی ان پر کسی قسم کی شرائط عائد کئے بغیر اور ان سے کسی قسم کے مطالبات کئے بغیر غذا تقسیم کرے لیکن حضرت عمرؓ کے دور میں جن لوگوں کو حکومت سے امداد ملتی تھی ان پر کوئی پابندی عائد نہ ہوتی تھی۔ یعنی وہ دوسرے کام بھی کر سکتے تھے۔

اور مزے کی بات یہ تھی کہ بجز قرآن مجید یا طریق نبوی کے حضرت عمرؓ کے پیش نظر کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ آپ کے پاس کوئی پولیس کی طاقت بھی نہ تھی جو امن و امان کو برقرار رکھنے میں آپ کی اعانت کرے۔ پھر بھی آپ نے اسلامی سیاست کو اس طریقہ پر چلایا تھا کہ مسلمان سب کے سب، مرکز میں بھی اور صوبوں میں بھی، آپ کے لئے پولیس کے فرائض ادا کرنے لگے تھے۔

یہ بات اب بالکل سمجھ میں آ جائے گی کہ مسلمانوں کو موت عمرؓ کا ملال اتنا شدید اور عظیم کیوں ہوا تھا اور ابو طلحہ انصاریؓ جیسے شخص کو کیوں یہ کہنا پڑا تھا کہ عرب میں

ایسا گھر کوئی نہ تھا جس کا نظام موتِ عمرؓ سے درہم برہم نہ ہو گیا تھا۔

ایسے ہی یہ بات باعثِ حیرت نہیں کہ کسی اور شخص نے اسی موت پر کہا تھا کہ جس گھر میں عمرؓ کی مرگ سے رنج و ملال نہیں داخل ہوا وہ برائی کا گھر رہا ہوگا۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے چچیرے بھائی سعید بن زید بن عمرو سے جب پوچھا گیا کہ آخر وہ موت عمرؓ پر کیوں اتنا رو رہے ہیں تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ وہ عمرؓ پر نہیں خود اسلام پہ رو رہے ہیں جس میں اس موت سے شگاف پڑ گیا تھا۔

حذیفہ ابن الیمانؓ سے بھی یہ قول منسوب ہے کہ اسلام ایک ایسا قلعہ تھا جس میں لوگ اب تک صرف داخل تو ہوتے تھے لیکن اس سے باہر نہ آتے تھے لیکن اب کہ عمرؓ وفات پا گئے تھے اس قلعہ میں رخنہ اور شگاف پڑ گیا تھا۔ چنانچہ اس سے لوگ باہر تو آجاتے تھے۔ لیکن باہر آ کر کے پھر واپس نہیں جاتے تھے۔

اور اس باب میں تو تمام راوی متفق ہیں کہ جس وقت حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کی موت پر نالہ و شیون سنا تو آپ حضرت کے مکان پر تشریف لائے۔ یہاں کیا دیکھتے ہیں کہ عالی منش عمرؓ کا جسم ایک کپڑے میں لپٹا ہوا ہے۔ حضرت علیؓ نے کپڑا ہٹا کے منہ کھولا اور کہا: "صلی اللہ علیک یعنی تم پر اللہ کا درود ہو۔ واللہ کہ اس دنیا میں سوائے اس کفن پوش کے آج کوئی شخص ایسا نہیں جس کے اعمالنامہ پہ مجھے رشک آجائے۔

مہاجرین اور انصار میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جسے عمرؓ کی موت پر گہرا رنج و ملال لاحق نہ ہوا ہو۔ حضرت ابن مسعودؓ نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ موت عمرؓ سے تمام بنیادیں ہل گئیں۔ یعنی زندگی کے تمام شعبے اور ستون متاثر ہو گئے۔ مناسب ہوگا کہ اس موقع پر حضرت عثمانؓ کا نہایت بلیغ مقولہ بھی نقل کر دیا جائے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا تھا کہ میں اللہ سے تقرب کی خاطر حسن سلوک کرتا ہوں اور عمرؓ خالص اسی تقرب کی خاطر اپنے اقرباء، اعزہ اور عیال وغیرہ کو ہر قسم کی آسائش سے محروم کرتے

تھے۔ روایت ہے کہ اس کے بعد حضرت عثمان نے تین بار اس جملہ کا اعادہ کیا کہ ہم میں کون ہے جو عمرؓ کی برابری کرے؟

مرثیہ کے ان چند شعروں سے زیادہ حضرت عمرؓ کے بارے میں کسی بیان یا مقولے نے راست بیانی نہیں کی۔ تصنیف کا سہرا راوی جنوں کے سر باندھتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ مشہور شاعر شماخ کے بھائی مزرد بن ضرار کے کہے ہوتے ہیں۔

ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی قیادت اور امامت کے طفیل اسلامی معاشرہ میں زبردست نظم اور ضبط ہو گیا۔ اور بظاہر غیر ممکن سا نظر آتا ہے کہ آپ کے بعد قیادت کا یہ بار کوئی اس توانائی سے اٹھا سکے گا۔





باب ۲۱

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت

شاعر نے ٹھیک ہی کہا تھا حضرت عمرؓ کے قتل کا واقعہ عجیب و غریب تھا۔ مغیرہ بن شعبہ رض کا ایک غلام تھا جو نہاوند کے قیدیوں کے ساتھ آیا۔ یہ شخص مدینہ میں مختلف قسم کے کاروبار کیے ہوئے تھا۔ یعنی پینٹنگ ونقاشی لوہاری اور بڑھئی گیری کے کاموں کے علاوہ چکیاں بھی بناتا تھا۔ یہ شخص حضرت عمرؓ کے پاس آتا ہے اور اس بات کی شکایت کرتا ہے کہ اس سے بہت زیادہ حق المالکی (وہ حق جو ایک مالک اپنے غلام سے وصول کرتا ہے) وصول کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ اس کے برخلاف یہ پاتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہؓ نے جو رقم اس پر عائد کر رکھی ہے وہ بالکل جائز ہے۔

بہر حال حضرت عمرؓ ایک طرف اسے تو یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ یہ رقم اپنے مالک کو ادا کرے لیکن دوسری جانب مغیرہ بن شعبہؓ کو لکھتے ہیں کہ اس عجمی غلام کے حق میں مزید رعایت کریں۔ بعد میں یہی غلام مسجد کے کسی گوشہ میں چھپ جاتا ہے اور جب حضرت عمرؓ نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو ان کا قصد کر کے ان پہ قاتلانہ حملہ کر دیتا ہے۔

یہ شخص مسجد کا احترام اس لئے نہیں کرتا کہ سرے سے مسلمان ہی نہ تھا۔ اسی طرح اس نے اس بات کی بھی قطعاً پروا نہ کی کہ مسجد میں بہت سے مسلمان جمع تھے اس نے تو حضرت عمرؓ کو جان پر کھیل

سے کے مارنا چاہا تھا۔

یہ واقعہ اپنے اندر کوئی غرابت اور ندرت نہیں رکھتا اگرچہ حضرت عمرؓ غیر مسلموں سے حد درجہ انصاف برتتے تھے اور اصولاً ایک غیر مسلم کو ان سے یہ روش اختیار نہ کرنی چاہیے تھی لیکن حضرت عمرؓ کے واقعہ قتل کی پشت پر بعض دوسری غور طلب اور فکر انگیز چیزیں بھی ہیں بعض روایات ہمیں بتاتی ہیں کہ یہ ایرانی غلام جب کبھی فارسی غلاموں کے بچوں کو دیکھتا تو ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتا اور کہتا کہ اللہ عرب میرا جگر کھا گئے۔ تو گویا معاملہ محض حق المالکی یا کسی قسم کی ادائیگی کا نہ تھا۔ اس سے بہت زیادہ تھا۔ معاملہ ان ایرانیوں کا تھا جن کا دیس ان سے چھین گیا تھا۔ جن کی قوم قتل ہو گئی تھی اور جو اپنے انتقام کی آتش نہ بجھا سکے تھے۔ چنانچہ یہ شخص وطنی جوش انتقام سے پُر تھا۔ اور اس کے دل میں اپنے تمام ہموطن قیدیوں کے لیے جو اب تمام عرب میں تھے غیظ و غضب کی بھٹی سلگ رہی تھی۔ پھر اس کے خیال میں گویا عرب اس کا (یعنی اس کی قوم کا) جگر کھا گیا تھا۔ اکیلا یہی شخص نہیں تھا جو مدینہ میں رہتا تھا وہاں ایرانی اور بھی بس رہے تھے۔ جن کے اعزہ جنگوں میں ہلاک کیے گئے تھے مثلاً خود ہی ہرمزان مدینہ میں موجود تھا۔ یہ شخص ایران کے بڑے درجہ کے امراء میں سے تھا یا شاید وہاں کے ملوک میں سے تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے مسلمانوں سے مقابلہ میں پوری پوری کوشش کی۔ جہاں تک اس سے بن پڑا۔

لیکن آخر کار اسے گرفتار ہو کے حضرت عمرؓ کے پاس آنا پڑا۔ حضرت عمرؓ اس شخص کو خاص طور پر قتل کر دینا چاہتے تھے مگر اس فریب کار نے دھوکا دے کر حضرت عمرؓ سے جان کی امان حاصل کر لی۔ اس شخص کو حضرت عمرؓ نے ایک گھڑی دن کے لیے پناہ دی تھی مگر واقعات کچھ ایسے ہوئے کہ امان مستقل ہو گئی۔

ایک دن کیا ہوتا ہے ہرمزان پیاسا بن کر پانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے لئے پانی لایا جاتا ہے لیکن وہ پیالہ واپس کر دیتا ہے اور پانی نہیں پیتا۔ اب وہ حضرت عمرؓ سے کہتا ہے کہ ممکن ہے تم مجھے پانی پینے کے دوران ہی قتل کر دو۔ امیر المومنین فرماتے ہیں نہیں کوئی اندیشہ مت کرو، تم سے کوئی تعرض نہ ہوگا۔ اب تو یہ شخص کہتا ہے:۔

"تم نے مجھے امان بخش دی" حضرت عمرؓ کہتے ہیں ۔نہیں - میں نے تجھے امان نہیں دی - لیکن حاضرین مجلس نے کہا :-

" امیرالمومنین، ہرمزان کے لئے امان تو ہوگئی، اس لئے کہ آپ نے اس سے یہ تو کہہ دیا کہ تجھ سے کوئی تعرض نہ ہوگا۔ اس طرح مسلمان اور خود حضرت عمرؓ اس ایرانی کا فریب کھا گئے - اور اس میں اچنبھے کی کوئی بات بھی نہیں - آزاد مرد کبھی اپنی سیاست میں کامیاب ہوتے ہیں تو کبھی دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں۔ اسلام میں سب سے پہلی چیز ایک غیر مسلم کی امان ہے ۔ حد تو یہ ہے کہ اگر کسی غیر مسلم کو ایک ادنیٰ مسلمان سپاہی تک امان بخش دے تو اسلامی لشکر کے سردار پر بھی وہ امان بخشی واجب ہو جاتی ہے اور اسے اس بات کو نبھانا پڑتا ہے ۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر کوئی مسلمان غلام بھی کسی ایک لڑنے والے غیر مسلم یا پورے گروہ غیر مسلم کو امان بخش دے تو اس کی پابندی اسلامی لشکر، اس کے قائد، خلیفہ اور پوری امت پہ عائد ہو جاتی ہے۔

یہ اس لئے ہوتا تھا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد موجود تھا کہ مومن، ذمیوں اور غیر مسلموں کے جان و مال کے محافظ ہو جاتے ہیں -اب چونکہ ہرمزان نے اپنے کو سپرد کر دیا تھا لہٰذا وہ اسلام کی طرف سے محفوظ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد مدینہ میں وہ مقیم رہا گیا اور کسی کو اسے گزند پہنچانے کا یارا نہ رہا— مدینہ میں ایک اور شخص بھی رہا کرتا تھا — وہ ایرانی نہ تھا- حیرہ کا ایک عیسائی عرب تھا۔ اس میں اور سعد بن ابی وقاصؓ میں رشتہ داری بھی تھی -

ابن سعدؒ کا قول ہے کہ یہ قرابت محض از روئے رضاعت تھی یعنی جفینہ کی بیوی نے سعدؓ کے کسی لڑکے کو دودھ پلایا تھا اور جس وقت سعدؓ کو حضرت عمرؓ نے کوفہ کی گورنری سے معزول کیا وہ اس شخص کو اپنے ساتھ لے کے آئے تھے۔

ایک چوتھا شخص بھی تھا جو مدینہ میں رہتا تھا۔ مگر عجیب و غریب طور طریقے تھے اس شخص کے ۔ اس شخص کو مسلمانوں کو فریب دینے کا گُر آتا تھا ۔ اس لئے حضرت عمرؓ تک کو دھوکہ دے دیا تھا۔ اس شخص کا نام کعب الاحبار تھا ۔ یہ ایک یمنی یہودی تھا — روایت ہے کہ جس وقت حضرت علیؓ یمن تشریف لے گئے تو کعب نے

آپ سے آنحضرتؐ کا حلیہ پوچھا اور حلیہ مبارک سن کر اس نے کہا کہ بعینہٖ اسی طرح توراۃ میں بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ شخص آنحضرتؐ کے زمانہ میں مدینہ میں نہیں آیا یمن ہی میں رہا لیکن بعض حضرات راوی ہیں کہ کعب نے اسلام قبول کر لیا تھا اور یمن میں اسلام کی دعوت بھی دیتا تھا۔ یہ مدینہ میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں آیا تھا۔ یہاں اس کی حیثیت عباس بن عبدالمطلبؓ کے غلام کی تھی۔ جس چیز میں اسے مہارت تھی وہ مسلمانوں سے کذب بیانی تھی، یہ اکثر لوگوں سے کہہ دیا کرتا تھا کہ اس نے ان کا ذکر توراۃ میں پڑھا ہے۔ مسلمان اس بات پر حیرت کرتے تھے اور اپنے متعلق یہ سب سن کر خوش بھی ہوتے تھے۔ اس عجیب و غریب آدمی نے حضرت عمرؓ پر بھی جھوٹ باندھ دیا تھا۔

راویات حاکی ہیں کہ کعب نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ ان کا ذکر توراۃ میں موجود ہے۔ جب حضرت عمرؓ نے حیرت کا اظہار کیا خصوصاً اس بات پر کہ توراۃ میں ان کے نام کا ذکر ہو تو کعب نے کہا: "توراۃ میں تمہارا نام تو نہیں البتہ تمہارے صفات اور تمہاری خوبیوں کا ذکر موجود ہے۔ شام کے سفر میں کعب حضرت عمرؓ کے ساتھ گیا تھا حضرت عمرؓ کا یہ سفر بیت المقدس کی فتح کی تکمیل اور اسے آخری مراحل سے گزارنے کے سلسلہ میں تھا۔ اسی نے حضرت عمرؓ کی صخرہ نامی جگہ تک راہنمائی کی تھی۔ اس جگہ کثرت سے گرجے بنے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ کے حکم سے یہاں مسجد بنوا دی گئی۔ بعد میں جب تعین قبلہ کا سوال اٹھا۔ تو کعب نے حضرت صخرہ کی جانب رخ کرنے کی سفارش کی لیکن حضرت عمرؓ نے مسجد حرام کی طرف قبلہ بنایا۔

کعب بعد میں حضرت عمرؓ کی معیت میں مدینہ پلٹ آیا۔ ایک دن اس یہودی نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی کہ وہ شہید مریں گے۔ اس پر امیرالمومنین نے فرمایا کہ میں جزیرہ عرب کے بالکل وسط میں ہوں، جہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو مجھے شہادت کیسے نصیب ہوگی۔ کعب نے اصرار کیا ایسا ہی ہوگا۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا:۔

شہادت ہر اس مقام پر مل سکتی ہے جہاں اللہ کی مرضی ہو۔ ایک روز حضرت عمرؓ اپنی بیوی امّ کلثوم بنت علیؓ کے یہاں تشریف لے گئے۔ وہ رو رہی تھیں حضرت

عمرؓ نے رونے کا سبب پوچھا انہوں نے کہا کہ یہ جو یہودی ہے نا کعب الاحبار، وہ کہتا ہے تم آگ میں جاؤ گے ! بعد میں جب حضرت عمرؓ نے کعب کو دیکھا تو آپ نے اس سے اس باب میں سوال کیا تو کعب نے کہا نہیں آپ تو جنت میں جائیں گے - امیر المومنین بولے - کیا خوب ! ایک دفعہ جنت میں اور ایک دفعہ جہنم میں ! کعب بولا : امیر المومنین ذرا ٹھہریئے، بخدا توراۃ میں آپ جہنم ہی میں دکھائے گئے ہیں، ان معنی میں کہ آپ جہنم کے دروازہ پر کھڑے مسلمانوں کو اس میں گرنے سے روک رہے ہیں -

آخر میں ایک بار کعب پھر حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ تین دن بعد آپ قتل ہو کر دیئے جائیں گے - حضرت عمرؓ نے اس بات کی کوئی پرواہ نہ کی - ایک دن اور گزر جانے پر کعب نے کہا : ایک دن تو کٹ ہی گیا اب صرف دو دن رہ جاتے ہیں حضرت عمرؓ نے اس کی طرف بھی توجہ نہ کی اور زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اس سے پوچھا بھی نہیں کہ اسے یہ سب علم کہاں سے ہوا - اسی طرح حضرت عمرؓ کے مرنے کے بعد بھی کسی مسلمان نے اس سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا - لیکن اس سے زیادہ اچنبھے کی بات کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ زخمی ہو چکنے کے بعد بھی گویا کعب الاحبار سے آپ کو یہ سننا پڑا کہ :-

" اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ -" یعنی حق (مراد موت) تیرے پروردگار کی جانب سے پہنچے گا تو ان لوگوں میں مت ہو جو شک میں مبتلا ہیں - اور یہ کہ، کیا میں آپ سے نہ کہتا تھا کہ آپ کی موت شہادت سے واقع ہوگی اور آپ کہا کرتے تھے :- " مجھے شہادت کہاں مل سکے گی میں تو جزیرہ عرب کے عین وسط میں بیٹھا ہوا ہوں " یہ روایات کی رو سے حضرت عمرؓ یہ سن کر خاموش رہے -

اگر کعب کے بارے میں بیان کردہ روایات صحیح بھی مان لی جائیں تو پھر مجھے اس بات میں ذرا شک نہیں رہتا کہ کعب کو قاتل فاروق اعظمؓ یعنی ابولؤلؤہ کے ارادوں سے واقفیت تھی - یا ان لوگوں کے منصوبوں سے جنہوں نے اس بھیانک جرم میں شرکت سے آگاہی حاصل تھی -

عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے ابولؤلؤۃ، ہرمزان اور

جفینہ کو صلاح مشورہ کرتے دیکھا تھا۔ اور ان کا بیان یہ ہے کہ موصوف کو دیکھ کر یہ لوگ ہٹ گئے تھے۔ یہ لوگ جب اٹھ کر جانے لگے تو ان کے پاس سے ایک دوپھلوں والا خنجر برآمد ہوا جس کا قبضہ بیچ میں تھا۔ جب عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے پوچھا کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو تو انہیں یہ جواب دیا گیا کہ ہم اس خنجر سے گوشت کاٹا کرتے ہیں۔

عبید اللہ بن عمرؓ نے جنھوں نے عبد الرحمٰن کی بات سن لی تھی فوراً پوچھا تم نے انہیں دیکھا ہے؟ عبد الرحمٰن نے کہا: ہاں، اب جب سب لوگوں نے خنجر کو دیکھا تو حضرت عبد الرحمٰن کے بیان کے مطابق تھا۔ اس موقع پر عبید اللہ بن عمرؓ جوش انتقام سے لبریز ہو گئے اور اپنی ننگی تلوار لیے آگے بڑھے۔ اور ہرمزان کے سر پر آکے سوار ہو گئے۔ عبید اللہ بن عمرؓ نے کہا: ذرا آکے میرے ایک گھوڑے کو دیکھ دو۔ اب جب ہرمزان کھڑا ہوا تو وہ پیچھے ہٹے اور اس کے سر پر تلوار تان لی۔

ہرمزان نے جب موت سامنے آتے دیکھا تو اس نے کہہ دیا لا الٰہ الا اللہ معلوم نہیں کون کون سے راوی اس وقت موجود تھے جنہوں نے اسے یہ کہتے سنا! بہر حال عبید اللہ جفینہ کے پاس پہنچے اور اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد عبید اللہ ابو لؤلؤ کے مکان پہ آئے اور اس کی ایک کمسن لڑکی کو بھی ہلاک کر دیا۔

اصحاب نبی نے عبید اللہ کے بارے میں سن لیا تھا۔ چنانچہ انھیں فوراً بلوایا۔ شاید اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو عبید اللہ مدینہ میں مقیم تمام عجم نژاد لوگوں کو قتل کر دیتے۔ عمرو بن العاصؓ نے خاص طور پر عبید اللہ کا پیچھا کیا اور ان کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ سعد بن ابی وقاصؓ نے عبید اللہ کو سخت سست کہا۔ ایسا ہی عثمان بن عفانؓ نے کیا۔ حضرت عثمانؓ فرمایا کرتے تھے: تم نے ایک طرف تو ایک ایسے شخص کو مارا جو نماز ادا کرتا تھا اور دوسری طرف ایک ذمی کو بھی مار دیا۔ جسے رسول اللہ کی امان ملی ہوئی تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسالت مآبؐ کے اصحاب نے عبید اللہ کو گرفتار کر لیا۔ اور

جب حضرت عثمانؓ نے خلافت کا بار سنبھالا تو آپ نے عبید اللہؒ کے بارے میں مسلمانوں سے مشورہ کیا۔ آپ نے کہا :- "تم لوگ اس شخص (مراد عبید اللہؒ کے بارے میں جس نے اسلام میں رخنہ ڈال دیا ہے۔ مجھے مشورہ دو۔" بعض لوگوں نے ان کے قتل کا مشورہ دیا اور بعض نے کہا۔ شاید تم لوگ اس بات کو طے کر چکے ہو کہ عبید اللہ کو بھی وہیں پہنچا دو جہاں حضرت عمرؓ ان کے والد پہنچے ہوئے ہیں۔ ابھی یہ بحث ہو ہی رہی تھی کہ حضرت عمرو بن العاصؓ پہنچ گئے اور انہوں نے کہا :- "یہ جو کچھ ہوا اس وقت ہوا جب تم خلیفہ نہ تھے ۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ عبید اللہؒ کو چھوڑ دو۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے دو مردوں اور ایک لڑکی کا خون بہانے کے عبید اللہ کو چھوڑ دیا۔

حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہو جانے کے بعد عبید اللہ کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس کی تفصیل کہیں اور آچکی ہے۔ لہٰذا ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔ حضرت عثمان نے عبید اللہ کو اس وقت معاف کیا تھا جب بعض اشخاص نے عبید اللہ کی کارستانی سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

حضرت علیؓ کی رائے یہ تھی کہ انھیں (عبید اللہ) کو قتل کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ کے خلیفہ ہوتے ہی عبید اللہ نے فرار اختیار کیا۔ اور حضرت معاویہؓ سے جا ملے اور صفین کے معرکہ میں قتل ہو گئے۔

یہ واقعہ ہے کہ عبید اللہ نے قانون کو ہاتھ میں لے کے اسلام کے حدود سے تجاوز کیا تھا۔ قانون کا تقاضا تھا کہ عبید اللہ کو اس وقت تک انتظار کرنا چاہیئے تھا جب تک نیا خلیفہ برسر اقتدار نہ آجاتا اس وقت البتہ وہ اس کے سامنے قضیہ کو پیش کرتے اور اس بات کی شہادت لاتے کہ:-

ہرمزان، جفینہ اور ابولؤلؤة کی بیٹی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے۔"

اب اگر خلیفہ کے نزدیک یہ شہادت قابل قبول قرار پاتی تو بے شک خلیفہ کو قتل یا دوسری کسی سزا کو جائز قرار دے دینا تھا۔

عبید اللہ پر جاہلی دور کی عصبیت غالب آگئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بغیر امام کے حکم کے قتل کا ارتکاب کیا تھا۔ اب اس قتل کا انجام یہ ہوا کہ ایک طرف عبید اللہ مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ اور دوسری طرف مسلمان آپس میں بٹ گئے۔

باب ۲۲

حضرت عمرؓ کا سانحۂ مرگ

روایت ہے کہ ایک بار آنحضرتؐ نے جنہیں حضرت عمرؓ سے زبردست انس تھا۔ ان سے ایک ذاتی سا سوال کیا (اس قسم کا سوال جو خالص بزرگانہ اور مشفقانہ نوعیت کا تھا) اور وہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے جو پیرہن زیب تن کر رکھا تھا وہ نیا تھا یا پرانا اور ـــــ پہنا ہوا جب حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یہ پیرہن پہنا ہوا ہے تو سردارؐ کا دل بھر آیا اور اس گرامی قدر نے کہا۔

"عمرؓ! تم نیا لباس بھی پہنو، فراغت اور خوشی سے دن بھی گزارو اور تم کو شہید کی موت مرنا نصیب ہوگا۔ اور اس دنیا، اور آخرت دونوں میں تم کو مسرت فراواں حاصل ہوگی"

اس دعائے رحمۃ للعالمینؐ کے پیش نظر حضرت عمرؓ اللہ تعالیٰ سے درخواست کیا کرتے تھے کہ وہ اس کی راہ میں شہید ہوں اور اس کے نبیؐ اعظم کے دیار میں انہیں موت آئے۔ جب اس پر کسی نے کہا تھا کہ تمہیں شہادت کیسے مل جائے گی اور پھر شہر پیغمبرؐ یعنی (مدینہ) میں لازمی طور پر تمہاری موت بھی کیسے واقع ہوگی تو اس کا جواب حضرت عمرؓ نے یہ دیا تھا کہ اللہ جب چاہے گا اور جہاں چاہے گا اپنے بندہ کو شہادت کا جام عنایت کر دے گا۔ آخر اللہ نے حضرت عمرؓ کی دعا قبول کر لی اور انہیں دونوں ہی باتیں حاصل ہوئیں۔ مدینہ بھی ہاتھ سے نہ گیا اور شہادت بھی ملی۔ انہیں ایک ایرانی آتش پرست

نے قتل کر دیا ۔ اور قتل بھی فجر کی نماز کے وقت کیا ۔ یعنی ایک ایسے وقت جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے ۔

سورۃ الاسراء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔

(اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا) (اے محمدؐ) سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی) نمازیں اور صبح کو قرآن پڑھا کرو کیونکہ صبح کے وقت قرآن کا پڑھنا موجب حضور (ملائکہ) ہے ۔

آتش پرست مجوسی نے حضرت عمرؓ کو جنہوں نے فجر کی نماز کی تکبیر کہہ لی تھی ، قتل کر دیا ۔ اس واقعہ شہادت سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ نے (حضرت عمرؓ کے باب میں) رسالت مآبؐ کی سن لی تھی ۔ اگر واقعی رسالت مآبؐ نے اس قسم کی دعا کی تھی ۔ ادھر حضرت عمرؓ کی دعا بھی قبول ہوئی جو شہادت مدینہ کی شرط کے ساتھ چاہتے تھے ۔ قاتلانہ حملہ کے بعد حضرت عمرؓ یہ کہتے ہوئے گر پڑے کہ ۔

(وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ۔)

یعنی

" اللہ تعالیٰ کا ہر حکم پہلے ہی سے متعین ہوتا ہے ۔ " حضرت عمرؓ کو وہ بات بھی میسر ہو گئی جس کے لئے آپ کو حد درجہ تشویش رہا کرتی تھی ۔ یعنی یہ کہ آپ کی ابدی آرام گاہ وہی ہو جہاں آپ کے عظیم رہنما اور رفقاء ، آنحضرتؐ اور صدیق اکبرؓ محو خواب تھے ۔ اس کے لئے حضرت عمرؓ نے زخمی ہونے سے پہلے ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اجازت مانگ لی تھی ۔ اب پہلے تو آپ وصیت وغیرہ سے فارغ ہوئے پھر آپ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا : ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہنا کہ ' عمرؓ کی ' امیر المومنین مت کہنا کیونکہ اب میں مومنوں کا امیر نہیں رہا ' خواہش ہے کہ وہ اپنے رفقا کے ساتھ یعنی آنحضرتؐ اور صدیق اکبرؓ کے ساتھ دفن ہوں ۔ چنانچہ اس کی اجازت مرحمت کر دی جائے ۔ "

حضرت عمرؓ نے اس موقع پر اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ اگرچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس جگہ کی

اجازت پہلے ہی دے رکھی تھی لیکن اس کا پورا پورا امکان ہے کہ ایسا محض اس لئے کیا گیا ہو کہ یہ اجازت حاکم وقت مانگ رہا تھا، بہرحال حضرت عمرؓ کو صد درجہ خوشی ہوئی جب ان کے بیٹے از سر نو یہ اجازت لے کے آگئے۔ اب مرنے والے کا نشاط دیدنی تھا۔

حضرت عمرؓ کو یہ بات بے حد ناگوار تھی کہ کوئی ان پر بیٹھ کے روئے آپ نے اپنی بیٹی، ام المومنین حضرت حفصہؓ کو جب سخت مضطرب اور آمادۂ گریہ پایا تو اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا۔ مجھے بٹھادو، میں یہ سب کچھ، یعنی (گریہ زاری) نہیں سن سکتا۔ اس کے بعد فرمایا۔ "بیٹی اگرچہ مجھے تمہاری آنکھوں پر تصرف نہیں حاصل یعنی میں تم کو رونے سے نہیں منع کر سکتا تاہم میرے سبب یہ جو تمہاری حالت ہے اس وقت، اس پر قابو پاؤ اور گریہ زاری مت کرو۔ حضرت عمرؓ نے صہیب کو بھی روتے سنا تو ان سے کہا کہ میں نے آنحضرتؐ سے یہ بات سن رکھی ہے جن کو لوگ روتے ہیں ان پر اس رونے سے عذاب نازل ہوتا ہے۔

اتفاق سے حضرت عائشہ اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتی تھیں۔ ان کے خیال میں مسئلہ کی اصل نوعیت کو سمجھنے میں حضرت عمرؓ سے غلطی ہوئی تھی۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ آنحضرتؐ نے کچھ لوگوں کو اپنے کسی مردہ کو روتے ہوئے پایا تو آپ نے فرمایا "یہ لوگ ادھر رو رہے ہیں ادھر ان کے آدمی پر عذاب نازل ہو رہا ہے۔ عذاب کی وجہ (مرنے کے اعزا کا بُکا نہ تھی) بلکہ خود اس کا اپنا جرم تھا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ جو جوان پر رو رہا تھا اسے ان کے سامنے سے ہٹا دیا جائے۔

راوی لکھتے ہیں کہ جس وقت حضرت عمرؓ کو اس کا احساس ہو گیا کہ وہ اس عالم سے سدھار رہے ہیں تو آپ نے وصیت کرتے ہوئے اپنے بیٹے عبداللہؓ سے فرمایا: "فرزند عزیز! تم میں ایمان کی تمام خصلتیں ہونی چاہئیں"۔ تم پوچھتے ہو وہ کیا ہیں، تو لو سنو وہ یہ ہیں: سخت گرمیوں کے باوجود رمضان کے روزے رکھنا، (جہاد میں) اسلام کے دشمنوں سے مسلح مقابلہ، ابتلا اور آزمائش کے موقع پر صبر و تحمل کا اظہار، جاڑوں میں وضو میں انہماک، روز ابر جب گھٹا میں چھائی رہیں۔ نماز میں عجلت کہ مبادا ابر کے سبب وقت نکل جائے، اور ترک مے نوشی،

حضرت عمرؓ جنہیں بدھ کے دن زخم آئے تھے، جمعرات کے دن انتقال فرما گئے۔ لیکن بعض راویوں

کا خیال ہے کہ آپ زخم لگنے کے بعد صرف ایک دن اور جئے۔

اہل شوریٰ (حضرت عمرؓ کی نامزد کی ہوئی کونسل، جس میں عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ عبدالرحمٰن بن عوفؓ عمرو بن العاص وغیرہ شامل تھے) نے باہمی مشورہ میں جو نئے لیڈر کے انتخاب کے سلسلہ میں ہوا تھا، تین دن صرف کئے۔ حضرت عمرؓ کی وفات اور شہادت کے وقت ان کے سن کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ وہ ساٹھ کے ہو چکے تھے۔

کچھ بھی ہو، حضرت عمرؓ نے مرتے وقت، سب کو اپنے سے خوش چھوڑا، اللہ، رسولؐ اور امت مسلمہ کی نسلیں سب ہی آپ سے راضی تھے۔ سوائے ان چند لوگوں کے جو تشیع میں غلو کرتے ہیں، حضرت عمرؓ کی ثناگستری اور قدردانی میں تمام فرقے اور گروہ اور مورخ اور راوی متفق ہیں۔ دراصل اللہ نے امت پر زبردست کرم فرمایا کہ اسے حضرت عمرؓ کی سی مثالی اور معیاری شخصیت عطا کی جس نے عدل گستری، انصاف، استقامت اور اپنے بعد آنے والے تمام خلفاء اور سلاطین پر ہر اعتبار سے برتری مطلق کے نقطہ نگاہ سے ایک آئیڈیل پیش کر دیا تھا۔



باب ۲۳

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موت

اور

ایک شرعی مسئلہ کا حل

جس نے تمام عمر مسلمانوں کے لئے بھلائی کی، اس کی موت تک نے مسلمانوں کو نفع پہنچایا۔ ان معنیٰ میں کہ اس سے ایک اہم دینی اور شرعی مسئلہ حل ہو گیا۔ اس مسئلہ سے متعلق روایات۔ بیان کرتے وقت، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ راویوں پر حیرت سی طاری تھی۔ دراصل بات یہ تھی کہ اس امر کے باوجود کہ شہیدوں کو نہ غسل دیا جاتا ہے نہ کفن پہنایا جاتا ہے، حضرت عمرؓ کو جن کو شہید کیا گیا تھا غسل بھی دیا گیا اور کفن بھی پہنایا گیا۔

آنحضرتؐ نے اُحد کے شہداء کو غسل نہیں دلوایا تھا اور اس کے برعکس یہ تک فرما دیا تھا کہ اگر حضرت صفیہؓ (رسالت مآبؐ کی پھوپھی) کی خواہرانہ گریہ زاری نہ حائل ہو جاتی تو آپ اس بات تک کی اجازت دیدیتے کہ سیدنا حضرت حمزہؓ کی لاش بے کفن کو صحرائی گوشت خور پرندوں کے حوالہ کر دیا جائے۔

غرض یہ طے ہے کہ اُحد کے شہداء بغیر کفن کے دفن ہوئے تھے سیدالشہداء حضرت حمزہؓ کو انہیں کی ایک چادر میں لپیٹ دیا گیا تھا اور حال یہ تھا کہ اگر چادر سے ان کا سر ڈھانپا جاتا ہے تو دھڑ کھل جاتا ہے اور پاؤں اڑھائے جاتے ہیں تو سر کھل جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے تمام جسم کو اسی صورت میں ڈھانپا جا سکا جب پیڑ کے پتوں کا سہارا لیا گیا۔

یہی عثمان بن مظعونؓ کے ساتھ ہوا۔

راویوں نے صفین کے معرکہ میں حضرت عمار بن یاسر کا قول نقل کیا ہے: مجھے غسل مت دینا اس لئے کہ میں لڑ رہا ہوں (اور اگر لڑتا ہوا مارا گیا تو جوں کا توں دفن کرنا ضروری قرار پائے گا) چنانچہ مسلمانوں نے جنہوں نے عمار بن یاسرؓ کی یہ بات سنی تھی انہیں یوں ہی دفن کر دیا۔

حضرت عمرؓ کی میت کا غسل اور ان کی تجہیز و تکفین سب ان کے احکامات کے بموجب عمل میں لائے گئے۔ آپ نے کفن کے سلسلہ میں معتدل رہنے کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح ان کی تجہیز میں مشک کے استعمال سے بھی پرہیز کیا گیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ شہدا بغیر کفن اور غسل کے صرف اس صورت میں دفن ہوتے ہیں جب وہ میدان جنگ میں شہید ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص یوں شہادت کا درجہ پا جائے کہ مثلاً کسی کینہ در عصیاں شعار نے اسے ناحق طور پر قتل کر دیا ہو تو اس کی تجہیز عام مسلمانوں کے طریق پر ہوگی۔ اب اسے غسل بھی دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ بھی ادا کی جائے گی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی حیات دممات ہر دو میں مسلمانوں کے لئے نفع ہی نفع رہا۔ دونوں طور سے، یعنی جی کے بھی، مر کے بھی، حضرت عمرؓ نے امت کو فائدہ پہنچایا۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی



تاریخ اسلام جلد اوّل، جلد دوم، جلد سوم۔

مصنفہ: مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم

• کیا آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ آپ اپنی زندگی کے لیے کوئی لائحہ عمل بنا سکتے ہیں یا اپنی قوم کے مستقبل سنوارنے کی کوئی کامیاب تدبیر کر سکتے ہیں، جب تک کہ آپ اپنے درخشاں ماضی اور اپنی تابناک تاریخ سے پوری طرح واقف نہ ہوں۔

تاریخ اسلام تیرہ سو سال قبل فاران کی چوٹیوں سے ایک نور چمکا۔ اس کی ایک ہی کرن نے ظلمت کدہ گیتی کو مطلع انوار بنا دیا۔ اس عالمگیر انقلابی آواز نے انسانیت اور حق و انصاف کی ایسی بنیادیں تعمیر کیں جس میں سیاسی، اقتصادی، معاشی اور اخلاقی آزادی تھی۔ اس شمع امن و سلامتی کے مٹھی بھر پرستار عرب کے تپتے ہوئے صحراؤں سے صرف حق و صداقت اور توحید و رسالت کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر کبھی افریقہ کے میدانوں میں کبھی چین کے چٹیل پہاڑوں میں کبھی اسپین میں اور کبھی بت کدہ ہند میں پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے افق عالم پر چھا گئے۔

یہ کتاب ان ہی مسلمان حکمرانوں، جاں بازوں اور بہادروں کے زندہ جاوید کارناموں کی مفصل تاریخ ہے جس کے مطالعے سے آپ کی رگ حمیت پھڑک اٹھے گی۔ اور آپ حق و صداقت کی راہوں پر دوبارہ گامزن ہو کر اپنا حال اور مستقبل بھی اتنا ہی شاندار بنا لیں گے۔ جتنا آپ کا ماضی درخشاں رہا ہے۔

مغربی مورخین نے تاریخ اسلام کے واقعات کو تعصب کے زہر میں بجھے ہوئے قلم سے لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور ایک عرصہ تک تاریخ کا طالب علم حقیقت سے ناواقف رہا۔

مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی نے برسہا برس کی محنت سے یہ مفصل اور مستند تاریخ مرتب کی جس کی ہر سطر اسلامی سطوت و عظمت کی آئینہ دار ہے۔ اس بلند پایہ کتاب کا انداز تحریر بے انتہا دلکش ہے آج جب کہ ہم اہم ترین تاریخی دور سے گزر رہے ہیں ہمارے لیے تاریخ اسلام کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ تاریخ اور سیاست کی روشنی میں

مصنفہ: ڈاکٹر طٰہٰ حسین — مترجمہ: مولوی عبدالحمید نعمانی

• تاریخ کا سب سے زیادہ المناک مختلف فیہ اور نزاعی موضوع

اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں اس موضوع سے اہم کوئی اور موضوع نہیں مل سکتا، یہ موضوع ہے اشک و آہ کا، گریۂ پیہم اور گریۂ بے اختیار کا، نوحہ و ماتم کا، ایک ہولناک انقلاب کا ہے۔" ایسا انقلاب، جس نے تاریخ اسلام کا رُخ بدل دیا اس موضوع پر اب تک صدہا مرتبہ ہزارہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ یہ کتابیں یا تو سراسر عقیدت کا نتیجہ ہیں یا اندھا دھند آزاد خیالی، بے راہ روی اور کج رائی کا۔

عالی مرتبہ مصر کے یگانہ اور بے ہمتا مورخ، ادیب اور محقق ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے کافی غیر جانبداری کے ساتھ، بلکہ تھوڑی دیر کے لئے یہ فراموش کر کے خود ان کا مسلک کیا ہے خالص تاریخی واقعات و حقائق کی روشنی میں یہ کتاب لکھی ہے اس کتاب میں جذبات سے اپیل نہیں کی گئی ہے، آنکھ بند کر کے کوئی بات تسلیم نہیں کی گئی ہے، نہ محض از راہ عقیدت کسی بات کو تسلیم کرانے کی کوشش کی گئی ہے، مستند ترین ماخذوں کو سامنے رکھ کر مستند ترین واقعات تاریخی ترتیب دے کر سامنے رکھ دیے گئے ہیں اور فیصلہ خود مصنف نے نہیں کیا، قارئین پر چھوڑ دیا ہے وہ خود ان واشگاف حقائق اور واقعات کی روشنی میں جو فیصلہ چاہیں کریں، جو رائے چاہیں قائم کریں جس نتیجہ تک خود پہونچنا چاہیں پہونچیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی یہ کتاب سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد پردہ آنکھوں سے اٹھ جاتا ہے اور سنگین، برہنہ اور ٹھوس حقائق نظر کے سامنے آجاتے ہیں، جنہیں نہ جھٹلایا جا سکتا ہے، نہ جنکی تردید کی جا سکتی ہے نہ جن کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے یہ کتاب لکھ کر تاریخ پر بہت بڑا احسان کیا ہے تاریخ نگاروں کیلئے ایک نیا راستہ پیدا کر دیا ہے اور ایک ایسی مثال قائم کر دی ہے جس کی تقلید اور پیش روی پر دوسرے لوگ مجبور ہیں اس نادر روزگار کتاب کے حقوق طبع واشاعت پاکستان کے لئے خاص طور پر ہم نے حاصل کئے ہیں طباعت کتابت اور گٹ اپ کے لحاظ سے یہ اپنی مثال آپ ہے